Korean Short Stories

A Sketch of the Fading Sun

ڈوبتے سورج کی تصویر

کوریا کے شاہکار افسانے

وان سوہ پارک

انگریزی ترجمہ: ہیون جاے ای سیلی اردو ترجمہ: مسعود اشعر

مشعل

ڈوبتے سورج کی تصویر

مصنف

وان۔سوہ پارک

انگریزی ترجمہ: ہیون۔جائے سیلی

اردو ترجمہ: مسعود اشعر

ڈوبتے سورج کی تصویر

نام کتاب	:	ڈوبتے سورج کی تصور
مصنف	:	
کمپوزنگ	:	
مطبع	:	
تعداد	:	
صفحات	:	

MashalBooks.com

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1	عورت کا نیا جنم	4
2	مصنف	9
2	خزاں کے تین دن	10
3	غربت جو چوری کر لی گئی	64
4	ڈوبتے سورج کی تصویر	86
5	ماما کی بازی (حصہ اول)	111
6	ماما کی بازی (دوسرا حصہ)	165
7	ماما کی بازی (تیسرا حصہ)	218

پیش لفظ

عورت کا نیا جنم

کہا تو یہی جاتا ہے کہ عورت اور مرد کے رشتے کی داستان بہت پرانی ہو چکی ہے۔ لیکن آج بھی جو ادب تخلیق کیا جا رہا ہے اس کا بڑا حصہ عورت مرد کے رشتوں کے بارے میں ہی ہوتا ہے۔ لیکن ایسا بہت کم لکھا گیا ہے جس میں عورت مرد کے تعلقات میں موجود جبر کے عنصر کو اجاگر کیا گیا ہو۔ جیسے ان افسانوں کی مصنفہ وان۔ سوہ پارک نے اپنی تحریر ''جیتے جی نئے دن کا آغاز'' میں لکھا ہے کہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ بیشتر وہ تحریریں جنہیں ادبی تخلیق کہا جاتا ہے دو صنفوں کے جابرانہ رشتوں میں ہی خوبصورتی تلاش کرتی نظر آتی ہیں۔

پارک کا خیال ہے کہ عورت مرد کے رشتے میں صرف جبر کرنے والا ہی نہیں بلکہ جس پر جبر کیا جا رہا ہے وہ بھی اسے مروجہ اخلاق و آداب کے خوبصورت نقاب کے پیچھے چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ اور پھر یہ نقاب ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہتا ہے، حتیٰ کہ وہ عورت کے گوشت پوست کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آخر یہ نقاب عورت کا خون بہائے بغیر اتار کر پھینکا بھی نہیں جا سکتا۔ مرد کی جابرانہ فطرت کی جو تصویر کشی ادب میں کی جاتی ہے پارک اس کے تصور سے ہی لرز جاتی ہیں۔ وہ اس کے لیے ایک بہت ہی بے رحم فقرہ ''خون بہانا'' استعمال کرتی ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہوا کہ اس جابرانہ رشتے کی گتھی کو ''ایک دوسرے کے درمیان افہام و تفہیم اور سمجھوتے سے نہیں سلجھایا جا سکتا۔

MashalBooks.com

وہ لکھنے والے جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو بنی نوع انسان کی آزادی کے لیے وقف کر رکھا ہے' وہ اکثر و بیشتر عورتوں کے مسائل کو ثانوی اہمیت دیتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کی لاعلمی ہے' جس کی بنیاد اس غلط فہمی پر ہے کہ عورتوں کے مسائل بنی نوع انسان یا معاشرے کی مجموعی صورت حال سے مختلف نہیں ہیں۔ وہ لکھنے والے جنہوں نے عورتوں کے بارے میں سطحی طور پر لکھ کر کاروباری کامیابی حاصل کی ہے' عورتوں کی زندگی ایسے پیش کرتے ہیں جیسے وہ دوسرے انسانوں کی طرح ہی ہیں اور فرض کر لیتے ہیں کہ عورت اور مرد کا فرق قدرتی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ لکھنے والے عورتوں کے حقوق کی آواز بلند کرنے والوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ظلم و جبر کی باتیں کرنا بند کر دیں حالانکہ عورتوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ معاشرہ عورتوں کو انسان نہیں بلکہ صرف ''عورت'' سمجھتا ہے۔

پارک مسلسل ان اسباب پر نکتہ چینی کرتی ہیں جن کی بنا پر معاشرہ عورت کی گردن میں طوق ڈالتا ہے۔ دنیا بدل رہی ہے لیکن ہمارے رویوں میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ یہ پدرسری ذہنیت ہے جو معاشرے پر چھائی ہوئی ہے۔

گذشتہ تیس سال میں کوریا نے صنعتی اور تجارتی میدان میں جو ترقی کی ہے اس نے مجبور کر دیا ہے کہ عورتوں کو بھی صنعتی اور تجارتی کارکنوں کی صف میں شامل کیا جائے۔ چنانچہ ان شعبوں میں عورت کی شمولیت اس طرح ہوئی ہے جیسے یہ ایک قدرتی عمل ہو۔ 1980 کی دہائی میں یہ عمل تیز ہوا تو عورت کے ساتھ صنفی امتیاز کا قانونی نظام بظاہر کالعدم ہو گیا۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو صنفی امتیاز میں بہت کم فرق پڑا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ جو استبدادی سیاسی کلچر پیدا ہوا ہے اس نے ایک شائستہ انسان کی حیثیت سے زندگی کے معنی تلاش کرنے کی اہمیت اور بھی بڑھا دی ہے۔ یہ کلچر ایک نیا ماڈل پیش کرنے میں ناکام ہو گیا ہے۔ چنانچہ کوریا کے ادب میں جو زندگی پیش کی جاتی ہے ہمارے ذہنوں پر اس کی حکم رانی ہے۔ وہ ہمیں اپنی زندگی کی نئی تشکیل کے لیے موقع ہی فراہم نہیں کرتا۔ اس سرزمین پر جہاں استبداد اور مادیت کی حکم رانی ہو وہاں کوئی انسان صحیح معنی میں شائستہ زندگی کا لطف کیسے اٹھا سکتا ہے۔ اسی طرح اس ماحول میں ایک عورت کی حیثیت سے زندہ رہنا اور بھی مشکل ہے۔ مرد کی غیر انسانی زندگی برقرار رکھنے کے لیے عورت کی غیر انسانی زندگی پر

اور بھی بوجھ پڑ جاتا ہے۔ کیا ہمارا پدرسری نظام عورت سے ہر وقت یہ تقاضہ نہیں کرتا کہ ''مرد کی دیکھ بھال کرو۔'' اور اسے خوش رکھو۔

اس بدلی ہوئی دنیا میں تعلیمی اور مالی اعتبار سے عورت کی سطح خواہ کتنی ہی بلند ہو گئی ہو لیکن عورت کی جذباتی آزادی پر اب بھی پابندی ہے۔ عورت اور مرد کے تعلقات کی نابرابری فطری اور قدرتی بات سمجھ لی گئی ہے اور پورا معاشرہ اسی کی بنیاد پر چلتا ہے۔ اسی لیے جو بھی اس نابرابری کو چیلنج کرتا ہے وہ سزا سے نہیں بچ سکتا۔ چونکہ انسان کا ارتقاء معاشرہ کے پابند اقداری نظام کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کا عمل ہے' اس لیے عورت کی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اوپر پابندیاں لگائے۔ یہ صورت اپنے اندر ہی تضاد رکھتی ہے کہ عورت کی نشوونما اس وقت ہوتی ہے جب وہ انسان کی حیثیت سے نشوونما پانے سے انکار کر دیتی ہے۔

بہر حال عورتوں کی مزاحمت کی تحریک بھی اتنے ہی شدومد سے جاری ہے جس شدت سے پدرسری نظام اور اسی کی تاریخ۔ لیکن چونکہ ان کی مزاحمت منظم نہیں تھی بلکہ انفرادی پیمانے پر تھی اسی لیے وہ مروجہ کلچر کے لیے چیلنج نہ بن سکی۔ ادب میں وقتاً فوقتاً اس کا اظہار ہوتا رہا لیکن یہ ذاتی غصے اور انفرادی طیش سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ادیب مجموعی طور پر اتنے پختہ کار نہیں ہیں کہ وہ ہمارے دیوہیکل اور پیچیدہ ثقافتی ڈھانچے کے اندر داخل ہو سکیں اور اس پدرسری نظام کو دریافت کر سکیں جو اس کے بالائی ڈھانچے کو سیراب کرتا ہے۔

حال ہی میں عورتوں نے اپنے مسائل کو سمجھنا شروع کیا ہے اور یہ مسائل حل کرنے کے لیے وہ متحد ہو کر صحیح راستے پر چل نکلی ہیں۔ 1970 کی دہائی کے آخر میں یہ تحریک ابھر کر سامنے آئی۔ اس کا مقصد عورتوں کو بنیادی انسانی حقوق دلانا، معاشرے کو جمہوری بنانا اور اس پدرسری نظام کو مسترد کرنا تھا جو انسانی فطرت کو کچل دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس تحریک نے اپنے آپ کو اس روایتی تحریک سے بالکل ہی الگ کر لیا جو صرف عورتوں کے حالات بہتر بنانے کے لیے چلائی جاتی تھی۔ یہ تحریک کامل مساوات اور برابری چاہتی ہے۔

اسی موقع پر وان۔سوہ پارک کی تخلیقات سامنے آئیں جو متوسط طبقے کی ان اعلی تعلیم یافتہ گھریلو خواتین کی زندگی پیش کرتی ہیں جو عورتوں کی آزادی کے نقطۂ نظر سے اپنے مسائل حل کر رہی ہیں۔ جب ہم کوریائی خواتین کی تحریک کے حوالے سے ان تخلیقات کو دیکھتے ہیں تو یہ سوال

MashalBooks.com

دماغ میں آتا ہے کہ تاریخی طور پر ان کے معانی کیا ہیں؟ پارک کا کوئی بھی کردار آزادی نسواں کی تحریک میں حصہ لیتا نظر نہیں آتا۔ خود پارک کو بھی ایسا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو کبھی فیمنسٹ ادیب نہیں سمجھا۔ اس لیے انہوں نے دانستہ طور پر کبھی ایسا افسانہ نہیں لکھا جو تانیثی ادب کے زمرے میں آتا ہو۔

پارک کی تخلیقات معاشرے کے ان بنے بنائے خیالات سے گریز کرتی ہیں جن میں عورت مرد کے تعلقات فرماں برداری کی روایات پر مبنی ہوتے ہیں۔ اگر گھر ایک آشیانہ ہے تو ان عورتوں کے خیال میں خاندان کے اندر ہم آہنگی ہونا چاہیے، قطع نظر اس بات کے کہ عورت اور مرد کس قسم کے تعلقات اپنے لیے اطمینان بخش پاتے ہیں۔

البتہ پارک کی تخلیقات میں ہر شوہر اپنی بیوی کو ملکیت ہی سمجھتا ہے اور اس کی جذباتی آزادی کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ وہ بیوی کی معاشی اہلیت حتی کہ اس کے وقت کو بھی اپنی ملکیت ہی گردانتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر وہ مقررہ وقت پر گھر نہیں پہنچتا تو تاخیر سے آنے پر وہ معافی مانگنا ضروری نہیں سمجھتا۔

ان کے ایک افسانے کی ہیروئن کہتی ہے کہ شادی ذلیل کرنے والا رشتہ ہے کیونکہ عورت اپنا سب کچھ دے دیتی ہے اور اسے جو ملتا ہے وہ صرف ایک فیصد ہی ہوتا ہے۔

چونکہ اس رشتے میں ہم آہنگی نہیں ہوتی اس لیے شروع سے ہی مرد ڈرتا رہا ہے کہ کہیں عورت بغاوت نہ کر دے چنانچہ وہ طاقت کے ذریعہ عورت پر قابو رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے وہ ''مردانگی'' کہتا ہے یہ عقیدہ کہ عورت اور مرد کے درمیان برابری ہو ہی نہیں سکتی مرد کو طاقت استعمال کرنے کا جواز فراہم کرتا ہے۔ اور یہ عقیدہ نسل در نسل چلا آ رہا ہے۔

شوہر اور بیوی کے درمیان اختیارات کی جنگ میں کون جیتتا ہے؟ اس میں پارک پدرسری نظام کی حقیقی طاقت کو ہی پیش کرتی ہیں جو بیوی کی معاشی آزادی کے باوجود برقرار رہتی ہے۔ سرمایہ داری نظام میں جہاں سرمایہ ہی اصل طاقت ہوتا ہے یہ لائق اور قابل عورتیں اپنے اپنے گھروں میں پوری طرح مالی معاونت کرتی ہیں۔ لیکن اپنی اس معاشی طاقت کی وجہ سے بھی یہ عورتیں دبی کچلی رہتی ہیں۔ پارک ہمیں بتاتی ہیں کہ پدرسری نظام کتنی چالاکی سے اپنی حاکمیت قائم رکھتا ہے۔

معاشی ضرورت کی وجہ سے بیوی کے لیے کام کرنا ضروری ہے۔ بلکہ بیوی کی اس مالی مدد کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اپنے شوہر کی مدد کے لیے گھر سے باہر کام کرنا ایک ایسا عمل ہے جس کی

تعریف کی جاتی ہے۔ البتہ اگر عورت اس لیے گھر سے باہر کام کرتی ہے کہ وہ اپنی ذات کو فائدہ پہنچائے اور اپنی ذاتی حیثیت بہتر بنائے تو اس پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے کیونکہ اسے مرد کا مقابلہ کرنے کے مترادف مانا جاتا ہے۔ اصول یہ ہے کہ عورت کو اپنی حد سے باہر نہیں جانا چاہیے۔ اس کے کام کرنے کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کی مدد کر رہی ہے۔ پارک کی تخلیقات میں جو متوسط طبقے کی عورتیں پیش کی جاتی ہیں وہ اسی نظریئے کے تابع ہوتی ہیں۔

بہر حال یہ سوچنا غلط ہوگا کہ مرد عورت کی اس صلاحیت کو نہیں مانتا کہ وہ روپیہ کما سکتی ہے۔ وہ اس حقیقت کو مانتا ہے اور وہ دولت کی اہمیت بھی تسلیم کرتا ہے۔ اپنے بعض افسانوں میں پارک شوہر کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ وہ شخص سرمایہ داری نظام کی پیداوار بھی ہے اور اس نظام کا قیدی بھی۔ وہ تقریباً مایوسی کے ساتھ اس پدرسری نظام کی تصویر کشی کرتی ہیں جس کی جڑیں ہماری زندگی میں بہت گہری ہیں اور جو ہر شعبے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اب جہاں تک عورتوں کے مسائل کے حل کا تعلق ہے (جس میں عورتوں کی آزادی بھی شامل ہے) تو وہاں وہ شدید مایوسی کا شکار نظر آتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں جہاں طلاق کی نوبت آجاتی ہے وہاں وہ ایک نہایت اہم سوال ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔ کیا عورتوں کے مسائل حل کرنے کے لیے واقعی طلاق ہی پہلا قدم ہے؟۔

البتہ پارک کی کامیابی یہ ہے کہ انہوں نے مظلوم عورتوں کے بارے میں لکھا ہے اور وہ عورتوں پر ہونے والے جبر کی گہرائیوں تک پہنچ گئی ہیں۔ صرف یہی حقیقت ہے جو عورتوں کو آزادی کا راستہ دکھاتی ہے۔ عام افسانوی عورتوں کے برعکس پارک کے افسانوں کی عورتیں کمزور اور بے سہارا نہیں ہیں کہ وہ اپنی بدنصیبی سے چھٹکارا نہیں پا سکتیں۔ وہ اپنے وقت کی خود مالک ہیں اور مردانہ معاشرے میں بیگانہ رہ کر بھی اپنی مرضی کی زندگی گذارتی ہیں۔ چنانچہ پارک عورتوں کی آزادی کی راہ اس طرح دکھاتی ہیں کہ ان کے نسوانی کردار اپنے موجود ہونے کا اعلان کرتے ہیں کہ ''یہ میں ہوں۔'' اس طرح وہ آزادی نسواں کی تحریک کی حمایت کرتی نظر آتی ہیں۔

ہے رین۔ پارک
پروفیسر مطالعہء نسواں
ایوہا ویمن یونیورسٹی
سیول۔ کوریا

MashalBooks.com

مصنف

وان۔سوہ پارک 1931 میں صوبہ کیونگی دو کے گاؤں گائیونگ کن میں پیدا ہوئیں۔ان کی ابتدائی زندگی دیہات میں گذری۔کوریا کی جنگ تک وہ سیول نیشنل یونیورسٹی میں پڑھتی رہیں۔

1970 میں ان کے ناول ''ننگا درخت'' کو روزنامہ دونگ آہ کا ادبی انعام ملا۔انہوں نے متعدد ناول افسانے مضامین اور بچوں کی کہانیاں لکھی ہیں۔

1980 میں ان کے ناول ''خزاں کے تین دن'' پر کوریا کا اعلی پایہ کا ادبی انعام ملا۔ 1981 میں انہیں ری سنگ ادبی انعام سے نوازا گیا۔ یہ انعام حاصل کرنے والی وہ پانچویں ادیب تھیں۔کوریا کی حکومت کی طرف سے انہوں نے تمام یورپی ملکوں کے علاوہ امریکہ اور ہندوستان کا دورہ بھی کیا ہے۔

1990 میں ایک بار پھر کوریا کا عوامی ادبی انعام حاصل کیا۔ یہ انعام کوریا کی کلچر اینڈ آرٹس فاؤنڈیشن کی طرف سے دیا جاتا ہے۔جس کتاب پر یہ انعام ملا وہ ہے۔''ناقابل فراموش''۔

مس پارک آج کل سیول میں رہتی ہیں اور دنیا بھر میں لیکچر کے لیے جاتی رہتی ہیں۔

انگریزی ترجمہ:

ان افسانوں کا انگریزی ترجمہ ہیون جائے ای سیلی نے کیا ہے۔انہیں کلچر اینڈ آرٹس فاؤنڈیشن کی طرف سے بہتریں ترجمہ کا انعام مل چکا ہے۔ان کے ترجمے امریکہ' کینیڈا' انگلستان' آسٹریلیا اور کوریا میں بہت مقبول ہیں ان کا ترجمہ کارنیل یونیورسٹی پریس نے بھی چھاپا ہے۔ انہیں 1995 میں ڈیسن فاؤنڈیشن اور 1999 میں KCAF کی طرف سے گرانٹ دی گئی۔

مس سیلی آج کل اورلینڈ' فلوریڈا میں وائٹ ڈزنی ورلڈ میں کام کرتی ہیں۔

خزاں کے تین دن

1 تین دن پہلے

صرف تین دن رہ گئے ہیں۔

کھڑکی سے خزاں کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ ہر روز سورج زیادہ شدت اور زیادہ حدت کے ساتھ جنوبی کھڑکی سے جھانکتا ہے۔کھڑکی کے پاس رکھی ہوئی مخمل منڈھی کرسی' جو کبھی خوبصورت سبز رنگ کی ہوگی' گھستے گھستے ہلکے خاکستری رنگ کی ہو چکی ہے۔بعض جگہ پر' جہاں زیادہ برش مارا گیا ہے' وہاں اس کا کپڑا سرسوں کی طرح پیلا ہو گیا ہے۔کرسی کسی کام کی نہیں ہے۔سالہا سال سے یہ کرسی اسی جگہ اور اس طرح پڑی ہے اور چونکہ اس پر دھوپ پڑتی رہتی ہے اس لیے اس کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔شروع سے ہی یہ اسی طرح چھوڑ دی گئی ہے۔اس کا کوئی مصرف ہی نہیں ہے۔

1953 کے موسم بہار میں جب ابھی کوریا کی جنگ چل رہی تھی تو جنگ بندی کی افواہ سے سیول کی زندگی میں کچھ ہلچل سی پیدا ہو گئی تھی۔اگرچہ روز بروز سیول کی آبادی بڑھتی جا رہی تھی' پھر بھی دارالحکومت یہاں منتقل نہیں ہوا تھا۔ میں ستائیس سال کی ہو چکی تھی مگر ابھی تک کنواری تھی۔ اس کے باوجود اس شہر میں اپنا دفتر کھولنے کے لیے نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ اکیلی ہی یہاں آ گئی تھی۔میں نے اچھی جگہ تلاش کرنے کے لیے دن رات ایک کر دیے تھے۔

اپنے کام میں میری مہارت کچھ زیادہ ہی تھی۔البتہ میرے لیے سب سے بڑی رکاوٹ میرا کم عمر لڑکیوں والا چہرہ تھا۔ جنگ نے جب ہماری قوم کی آبرو ریزی کی اس سے بھی پہلے میں خواتین کے میڈیکل کالج سے فارغ ہو چکی تھی۔ میں جنگ کے زمانے میں ان زخمی فوجیوں کی

MashalBooks.com

دیکھ بھال کرتی تھی جو میڈیکل کالج سے ملحقہ ہسپتال میں لائے جاتے تھے۔ جنگ کے دوران میں ہی ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے میں نے اس لیڈی ڈاکٹر کے ماتحت کام کیا جو کالج میں میری سینئر تھی۔ فوج میں بلائے جانے سے پہلے اس لیڈی ڈاکٹر اور اس کے شوہر کی پریکٹس خوب چلتی تھی۔ شوہر فوج میں چلا گیا تو اس اکیلی ڈاکٹر پر کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا اس لیے اس نے مجھے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ اس وقت تک پروفیشنل ڈاکٹروں کا نظام اتنا سخت نہیں تھا جیسا آج ہے۔ چونکہ مجھے جنگ کے زمانے میں علاج معالجے کا خاصہ تجربہ ہو چکا تھا اس لیے مجھے پورا اعتماد تھا کہ میں اپنا علیحدہ کلینک کھول سکتی ہوں۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی کہ میں کس قسم کے مریضوں کا علاج کروں گی۔ بس مقصد یہ تھا کہ کام شروع کر دوں۔

اس وقت تک دارالحکومت سیول منتقل نہیں ہوا تھا اس لیے شہروں کے وسط میں بھی آسانی سے جگہ مل سکتی تھی۔ لیکن میں نے یہ سوچ کر ان علاقوں کی طرف جانا مناسب نہیں سمجھا کہ دارالحکومت کی واپسی کی خبر سے جائیدادوں کی قیمتیں بڑھ گئی ہوں گی۔ پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ شاندار ڈگریوں والے مشہور اسپلشٹ ڈاکٹر انہی علاقوں پر قبضہ کریں گے جو سونے کی کان ہیں۔ میں نے طے کیا کہ ان علاقوں سے دور ہی رہا جائے تو اچھا ہے۔

میں نے سیول کے نواح میں کسی عام سے رہائشی علاقے میں اپنا کلنک کھولنے کا فیصلہ کیا۔ آخر مجھے اپنی پسند کا علاقہ مل گیا۔ اور کیونگ سونگ اسٹور کی دوسری منزل پر ایک جگہ میں نے کرائے پر لے لی۔ تیس سال پہلے یہ علاقہ مشرقی سیول کا سرکاری دروازہ تھا جب آپ ریلوے لائن پار کرتے تو یانگ جومیدان پہنچ جاتے جہاں تیل اور ایندھن کی بدبو آپ کا استقبال کرتی۔

کیونگ سونگ اسٹور پر چینی رسم الخط میں جو بورڈ لگا تھا وہ پرانے زمانے کی یادگار تھا۔ ری پی بادشاہوں کے زمانے میں کیونگ سونگ ہی وہ نام تھا جو دارالحکومت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس اسٹور پر زرعی آلات فروخت ہوتے تھے۔ اسٹور کے نام کے لغوی معنی تو ''دارالحکومت'' تھے مگر اس کا عام تاثر دیہاتی سا تھا۔ اس اسٹور پر گنوار پن ٹپکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے اردگرد کا ماحول بھی ایسا ہی تھا۔ اس کے باوجود یانگ ہو سے بیل گاڑیوں اور گھوڑا گاڑیوں پر آنے والے لوگوں کو ایسا ہی لگتا تھا جیسے وہ سیول میں داخل ہو رہے ہوں۔

اس علاقے کے بوڑھے پراپرٹی ڈیلر نے مجھے بتایا کہ کیونگ سونگ اسٹور کی دوسری منزل

خالی ہے۔ وہ مجھے جگہ دکھانے لے گیا۔ وہاں مجھے کیونگ سونگ فوٹو اسٹوڈیو کا بورڈ بھی لگا ہوا نظر آیا۔ اس نے بتایا کہ جس فوٹو گرافر نے یہ جگہ کرائے پر لی تھی وہ جنگ کے زمانے میں لاپتہ ہو گیا تھا۔ اس وقت سے یہ اسٹوڈیو خالی پڑا ہے۔ اسٹوڈیو کی ہر کارآمد چیز چوری ہو گئی ہے اور اب وہاں پڑوس کے آوارہ لڑکے دھما چوکڑی مچاتے رہتے ہیں۔

اسٹور اور رہائش والی جگہ کا درمیانی دروازہ ٹوٹ چکا تھا۔ اور وہ دروازہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ ڈارک روم میں جو سیاہ پردہ پڑا ہوا تھا وہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ سیڑھیوں کا دروازہ بھی موجود نہیں تھا۔ اور تو اور کوئی کھڑکی بھی سلامت نہیں تھی۔ اسی کاٹھ کباڑ میں مجھے وہ مخمل منڈھی ہوئی کرسی نظر آئی۔ وہ کرسی کسی زنانہ ٹائپ شہزادے کی یاد دلاتی تھی جسے اغوا کر کے کسی طاقت ور ملک میں لا کر بند کر دیا گیا ہو۔ کرسی بہت ہی عجیب و غریب مگر رعب دار معلوم ہوتی تھی۔

بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ مخملی کرسی کسی بھی مقام یا ماحول کے لیے عیاشی سے کم نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہر دیکھنے والے کی نظروں میں چبھتی تھی۔ میرے خیال میں اسے کہیں بھی اس کے لائق جگہ نہیں مل سکتی تھی۔ وہ کرسی کسی کے بیٹھنے اور آرام کرنے کے لیے بنائی ہی نہیں گئی تھی۔ بلکہ وہ تو دوسرے فرنیچر سے ملتی بھی نہیں تھی۔ اس کا واحد مقصد یہ ہوگا کہ وہ فوٹو گرافر کے لیے بیک گراؤنڈ کا کام دیتی ہوگی۔ اگر آپ پرانے انداز کی تصویریں دیکھیں تو ان میں ایک آدمی کرسی پر بیٹھا ہوگا اور دوسرا اس کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ اور اگر دو پورٹریٹ ہو تو ایک آدمی کرسی کے ساتھ اس طرح اکڑا ہوا کھڑا ہوگا کہ اس کا ایک ہاتھ کرسی کی پشت پر رکھا ہوگا۔

نوزائیدہ بیٹے کے ایک سو دن پورے ہونے پر جو تقریب منائی جاتی ہے اس موقع پر ننگا بچہ بھی اس کرسی پر بیٹھ کر اپنی تصویر کھنچواتا ہوگا۔ اس موقع کے لیے خاص طور سے یہ کرسی صاف کی جاتی ہوگی۔ کرسی کی پشت بہت اونچی تھی اور اس کے پیچھے لکڑی پر قفقش بنا ہوا تھا۔ دونوں ہتھوں پر مڑا تڑا ادھا کندہ کیا ہوا تھا۔ کرسی بہت ہی نامناسب طور پر پرتعیش نظر آتی تھی۔ خاص طور پر اس اجڑے ہوئے کمرے میں اس نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

بوڑھے پراپرٹی ڈیلر نے مجھے خاموش دیکھا تو سمجھا کہ مجھے وہ جگہ پسند ہے۔ اس نے خوشی خوشی وعدہ کیا کہ وہ اس جائیداد کے مالک سے کرائے کی بات کر لے گا اور اس کی مرمت اور آرائش وغیرہ کے لیے بھی اس سے کہے گا کہ وہ سارا خرچہ بھی خود ہی برداشت کرے۔ وہ مجھے

MashalBooks.com

یقین دلا کر نیچے چلا گیا۔ بوڑھا دانگ سٹور کا مالک تھا اور اب بھی مالک ہے۔ میں اکیلی رہ گئی تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میری حالت اسی چھوٹی سی لڑکی کی طرح جو تنہائی میں اپنی ماں کے کپڑے پہننا چاہتی ہو۔ اسی کیفیت میں میں مخملی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس وقت بھی وہ کرسی کھڑکی کے پاس رکھی تھی اور اس کا رخ جنوب کی طرف تھا۔

بڑی سڑک کے پار پرانا زراعتی ہائی اسکول تھا جو امریکی فوجیوں کا اڈہ بن چکا تھا۔ اردگرد کا ماحول بھی کافی بدل گیا تھا۔ اب وہاں اونچی اونچی عمارتیں کھڑی تھیں۔ ایک تجر باتی لیبارٹری سامنے میدان میں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ رہائشی مکان تھے۔ اسکول کے دروازے پر امریکی ملٹری پولیس کا سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔

میں اس علاقے میں آئی تو مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اگرچہ سارا علاقہ گندی بستی کا نظارہ پیش کر رہا تھا لیکن وہاں ترقی کے آثار بھی دکھائی دے رہے تھے۔ پورے شہر پر ہی غربت چھائی ہوئی تھی کسی ایک چیز پر انگلی نہیں رکھی جا سکتی تھی پھر بھی وہاں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔ اور یہ بات غربت سے بھی زیادہ گھناؤنی تھی۔ وہاں کا ماحول چکلے اور کوٹھے والا تھا۔ پھر اچانک مجھے اپنی پریشانی کا سبب بھی معلوم ہو گیا۔ وہاں امریکی فوجی اڈہ تھا۔ میں نے سر جھٹک کر اپنے دماغ سے یہ خیال نکالا اور ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے وہاں بند کر دیا گیا ہو۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ میں صرف فرش پر ادھر سے ادھر چہل قدمی ہی کر سکتی تھی۔ میرے پیروں کے نیچے فرش چرخ چوں کر رہا تھا جیسے میں چیخ رہی ہوں۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے فرش پر بکھری ہوئی تصویریں اکٹھی کرنا شروع کر دیں۔ وہاں اسکول کی ایک لڑکی کی تصویر ملی جس کے سر پر چھوٹے چھوٹے بال تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں پر اپنا چہرہ رکھا ہوا تھا وہ بہت ہی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ ایک سال کے پیارے سے بچے کی سالگرہ کی تصویر بھی وہاں پڑی تھی۔ بوڑھے میاں بیوی کی ایک تصویر بھی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا یہ تصویر کھنچوا کر ان کے بچوں نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ ڈاک کے ٹکٹ کے سائز کی بھی بہت سی تصویریں تھیں۔ یہ تصویریں مختلف اوقات اور مختلف تاریخوں میں کھینچی گئی تھیں مگر ان سب میں ایک چیز مشترک

تھی۔ تمام چہروں پر ایک ہی پتھریلا تاثر تھا۔

ظاہر ہے میں ان میں کسی ایک کو بھی نہیں پہنچانتی تھی۔ لیکن حیرت انگیز طور پر مجھے ان کے ساتھ ایک قربت سی محسوس ہوئی۔ ہم سب کی قسمت ایک ہی جیسی تھی۔ ہم سب نے کوریا کی جنگ میں زندگی بسر کی تھی۔ اس جزیرہ نما کے رہنے والے ہر شخص کا ایک ہی ہولناک تجربہ تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ جن مصائب کا ہم شکار ہوئے ہیں ان میں ہر فرد نے کس طرح اپنے اپنے مقدر کا مقابلہ کیا۔

میں نے ایک بار پھر زور سے سر جھٹکا' جیسے اپنے دماغ کے جالے صاف کرنا چاہتی ہوں۔ اور پھر فرش پر بڑی تصویریں اکٹھی کرنا شروع کر دیں۔ میں نے ایک ننگے مرد اور ننگی عورت کی تصویر اٹھائی' وہ دونوں عجیب سے ٹیڑھے میڑھے انداز میں پڑے ہوئے تھے۔ میں نے جلدی سے اس تصویر کے پرزے پرزے کر دیے۔ تصویر پھاڑتے ہوئے میرے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ میں پیچھے ہٹی اور مخملی کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ تصویر تو میں نے پھاڑ دی تھی مگر میرے اندر جذبات کا ایک طوفان امنڈ آیا تھا۔ ایک بار پھر میرے دماغ میں وہ ہولناک واقعہ گھوم گیا جس نے میری زندگی بدل دی تھی۔ تیز گھناؤنی بدبو سے پھر میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ جب وہ میرے اوپر آگے پیچھے حرکت کرتا تو اس کے شیشے کی جھاڑ جیسے بال میرے چہرے پر رگڑتے۔ اس نے جب میرے اوپر چڑھائی کی تھی تو اس کے رسی جیسے لمبے اور مضبوط ہاتھوں اور پیروں نے مجھے کچل کر رکھ دیا تھا، میں شدید درد سے کانپ اٹھی تھی۔

آبروریزی کے بعد مجھے ایسے لگا تھا جیسے زندگی کی ہر چیز اپنے معانی کھو چکی ہے۔ میں محرومی اور بے معنویت کے احساس میں غرق ہو گئی تھی۔ ابھی میں اپنے خیالوں میں ہی کھوئی ہوئی تھی کہ بوڑھا پراپرٹی ڈیلر پھر نمودار ہو گیا۔ یہ بڈھا مسکرا کیوں رہا ہے؟ میں تو اپنا ماضی یاد کر رہی تھی۔

''تم بالکل نہ بولنا، خاموش رہنا۔ میں جیسا کہوں ویسا ہی کرنا۔ اوکے؟ ہم یہاں ڈاکٹر کا کلینک کھولیں گے۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے تمہیں نقصان ہو۔ اوکے؟'' اس نے اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر کہا۔ اس کے منہ سے تمباکو کی بدبو آ رہی تھی۔

وہ بوڑھا ہر جملے کے بعد ''اوکے؟'' کہتا تھا مگر اس کا یہ اوکے کہنا برا نہیں لگتا تھا۔ بلکہ اس کا لہجہ میرے کانوں کو اچھا ہی لگتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسٹور کا بوڑھا مالک دھانگ بھی وہاں آ گیا۔

MashalBooks.com

پراپرٹی ڈیلر نے کرایہ نامہ اسے دکھایا۔ میں نے اپنا پرس دیا کہ اس پر رکھ کر لکھا پڑھی کرلیں۔ دھانگ نے کرایہ نامہ پڑھا۔ پراپرٹی ڈیلر نے میری طرف داری کی اور اس سے کہا کہ سیکیورٹی کی رقم کم کردے۔ بلکہ اس نے کرایہ بھی کم سے کم رکھنے پر اصرار کیا۔ اور اس کے لیے اس نے اسٹوڈیو کی خستہ حالت کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ دھانگ بظاہر تو بہت ترش مزاج معلوم ہوتا تھا مگر اس نے پراپرٹی ڈیلر کی بات مان لی۔

اس طرح کسی پیچیدگی کی بغیر ہی میرے حق میں معاملہ طے پا گیا۔ دھانگ مان گیا کہ کھڑکیاں اور دروازے ٹھیک کرادے گا۔ بلکہ پارٹیشن بھی لگوادے گا۔ پراپرٹی ڈیلر نے چیونٹی کے سر برابر لفظوں میں کرایہ نامہ کے خالی حصے پر کیے۔ اس کے بعد دھانگ اور میں نے اسے سرسری طور پر پڑھا اور دونوں نے دستخط کردیے۔

کرایہ نامہ پر دستخط ہوگئے اور کمیشن بھی ادا کردیا گیا تو بوڑھے دھانگ نے مجھ سے پوچھا کہ میں کن بیماریوں کا علاج کیا کروں گی۔ ابھی میں جواب بھی نہیں دینے پائی تھی کہ پراپرٹی ڈیلر نے فوراً کہہ دیا۔

''جنرل پریکٹس؟'' آپ نے یہی بتایا تھا نا مادام؟." وہ میری مدد کررہا تھا۔

''نہیں۔ میں گائنا کالوجی پریکٹس کروں گی'' میں نے مخملی کرسی سے چھلانگ لگا کر کہا۔ یہ فیصلہ میں نے اچانک نہیں کیا تھا بلکہ ننگی تصویریں دیکھ کر اور اس علاقے میں طوائفوں کے چکلے ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے یہ طے کیا تھا۔ اس اذیت کا اندازہ وہ عورت ہی لگا سکتی ہے جس کے پیٹ میں ان چاہا بچہ ہو۔ کسی اور بیماری کا درد و کرب دوسروں میں ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن کسی غیر کا بچہ پیٹ میں ہو تو دوسرے لوگ طنز کرتے ہیں یا الزام لگاتے ہیں۔ اگر دوسرے ڈاکٹروں کا یہ خواب ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو بیماریوں سے نجات دلائیں تو میرا خواب یہ تھا کہ عورتوں کو اس کرب سے چھٹکارا دلاؤں جو تمام بیماریوں سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔

''اگر یہاں ان کا کام نہ چلا اور انہیں یہ شہر چھوڑنا پڑ گیا تو میرا خیال ہے کسی جھگڑے سے بچنے کے لیے انہیں تحریری طور پر وعدہ کرنا چاہیے کہ مرمت کے تمام اخراجات یہ خود ادا کریں گی، جیسے یہ تحریر کہ مالک ذمہ دار نہیں ہوگا'' بوڑھے وانگ نے کنکھیوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ جب وہ یہ بات کررہا تھا کہ تو اس کے چہرے پر حقارت کے تاثرات تھے۔

''دیکھیے صاحب' آپ انہیں کامیابی کی دعا دینے کے بجائے ایسی بات کیوں کررہے ہیں۔ مادام آپ ناراض نہوں یہ یونہی ایسی باتیں کررہے ہیں' یہ دل کے برے نہیں ہیں۔ آپ سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اوکے؟ پراپرٹی ڈیلر نے مجھے تسلی دی۔

''انکل' اس شہر کے لوگوں کو آپ خوب جانتے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ یہاں کی عورتوں کے لیے بچے جننا عام سی بات ہے۔ آخر کوئی بھی معقول عورت جو ننھے بچوں کی تین دیویوں کو ناراض نہ کرنا چاہتی ہو' وہ بھلا کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس کیوں جائے گی۔ یہ تو بہت گھناؤنی بات ہے'' بوڑھے دھانگ نے کہا۔

''انسان کو سوچ سمجھ کر بات کرنا چاہیے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ آپ ایسی بات کریں؟ میں کہہ چکا ہوں کہ یہ مادام یہاں ماؤں اور بچوں کا علاج کریں گی۔ کیا آپ زرعی آلات کا کاروبار چھوڑ کر کپڑے بیچنا شروع کردیں گے؟ کیا کوئی اپنا پیشہ چھوڑ سکتا ہے؟ انہوں نے جو پڑھا ہے وہ بیماریوں کا علاج ہے۔ ظاہر ہے یہ صرف عورتوں کا علاج ہی تو نہیں کریں گی۔ اس پر میں شرط لگا سکتا ہوں۔'' پراپرٹی ڈیلر نے زور شور سے کہا۔

اس کے بعد پراپرٹی ڈیلر مالک مکان کو تقریباً گھسیٹتا ہوا نیچے لے گیا۔ گائنا کالوجی کے بارے میں ان کی لاعلمی پر مجھے ہنسی آگئی۔

کلنک کھولنے کی تیاریاں زور شور سے شروع ہوگئیں۔ بوڑھے دھانگ نے بڑھئی بلا کر دروازہ اور کھڑکیاں لگوادیں اور پارٹیشن بھی ٹھیک کرادیا۔ میں نے پینٹ کرنے والوں کو بلایا اور اندر باہر سے کلنک پر پینٹ کرالیا۔ سائن بورڈ بنانے والے سے کلنک کے باہر بورڈ لگوادیا۔ ''ایسٹ سانٹیڈ میڈیکل کلنک''۔ اس کے نیچے میں نے لکھوادیا۔ زچہ اور بچہ کے علاج کی ماہر۔'' ان دنوں سیول میں میز کرسی اور صوفے سستے مل جاتے تھے۔

ہان دریا کے پار آتے جاتے میں نے ضروری طبی آلات بھی خرید لیے۔ یہ چمکتے ہوئے ٹھنڈے ٹھنڈے آلات دیکھے تو میرے دل کو جیسے سکون سا آگیا۔ ایک عجیب سا احساس ہوا جیسے میں اپنی تقدیر سے لڑ رہی ہوں۔

میں نے ایگزامینیشن ٹیبل بھی خریدی جس میں عورتوں کے معائنے کے لیے خاص سہولت موجود ہوتی ہے۔ اکثر لوگوں کے لیے یہ ایگزامینیشن ٹیبل ڈاکٹروں کی سہولت کے لیے ایک عام

MashalBooks.com

سی چیز ہوتی ہے لیکن عورتوں کے لیے یہ ایک ناقابل برداشت مصیبت ہے۔ اس وقت مجھے اپنی اذیت یاد آئی تو میں نے زور سے دانت بھینچ لیے۔

کلنک کھولنے کے لیے ہر کام پورا ہو چکا تھا۔ فوٹو اسٹوڈیو پوری طرح ڈاکٹر کے کلنک میں تبدیل ہو چکا تھا۔ البتہ ابھی ایک چیز باقی تھی جو واقعی آنکھوں کو بری لگ رہی تھی۔ اور وہ تھی مخملی کرسی۔ وھانگ نے صفائی کرائی تو یہ کرسی ایک طرف کر دی۔ پھر بڑھئی آیا تو اس نے بھی اسے ایک طرف رکھ دیا۔ کرسی بہر حال دفتر میں ہی رہی۔ اور جب پینٹر نے دیواروں پر رنگ کیا تو اس نے اس کرسی کو کپڑے سے ڈھانپ دیا۔ میں جانتی تھی کہ میرے لیے یہ کرسی بیکار ہے پھر بھی اسے پھینکنے یا کسی کو دینے کو میرا جی نہ چاہا۔ بہر حال میں نے اس کرسی کو نظر انداز کر دیا اور اسے جنوبی کھڑکی کے ساتھ اسی جگہ رہنے دیا جہاں پہلے دن میں نے اسے دیکھا تھا۔

بوڑھے وھانگ کی پیش گوئی کے مطابق کلنک کی تمام تیاریاں مکمل ہونے کے بعد بھی کوئی مریض نہیں آیا۔ مگر مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ البتہ ڈاکٹر کے کلنک میں وہ کرسی بے تکی سی نظر آتی تھی۔ اب میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ ابھی میں پریکٹس کے لیے پوری طرح تیار نہیں ہوں۔

ایک دن میں باورچی خانے کے برتن خرید کر واپس ہوئی تو دیکھا کہ کوئی میرا انتظار کر رہا ہے۔ کھڑکی کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی پر کوئی بیٹھا تھا۔ مگر وہ کوئی مریض نہیں تھا بلکہ میرے والد تھے وہ کوریا کا روایتی سوتی لبادہ ''ڈرومکی'' اور نکیلے چمک دار جوتے پہنے ہوئے تھے۔ وہ بڑے آرام سے کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان کے بیٹھنے سے اچانک وہ کرسی مجھے بہت ہی باوقار نظر آنے لگی۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو شاباش دی کہ وہ کرسی میں نے پھینکی نہیں تھی۔ لیکن مجھے اپنے باپ کو دیکھ کر کچھ خوشی نہیں ہوئی۔

''آپ کو یہ جگہ کیسے ملی؟'' میں نے پوچھا۔

''تم پہلے جس ہسپتال میں کام کرتی تھیں میں وہاں گیا۔ وہاں سے تمہارا پتہ ملا۔''

''آپ فکر نہ کیجیے' میں جہاں بھی رہوں گی ٹھیک ٹھاک ہی رہوں گی۔ آپ کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ خواہ' مخواہ آپ کیوں اس طرح پھر رہے ہیں۔''

سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اپنے باپ کی صحت کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ میں گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ میرا بھائی کہتا رہتا تھا کہ باپ کے مرنے سے پہلے شادی کر لو۔ لوگ یہ

ظاہر کر کے مجھے جرم کا احساس دلاتے تھے کہ ہمارے باپ ہمیشہ زندہ نہیں رہیں گے۔ وہ سمجھاتے تھے کہ باپ کا دل نہ دکھاؤ اور جلدی سے شادی کر لو۔ یہ سن سن کر میرے کان پک گئے تھے۔ اور ان سب کی باتیں سن کر خیال آنے لگا تھا کہ میرے باپ زیادہ دن زندہ نہیں رہیں گے۔ اور چونکہ میں سب سے چھوٹی تھی اور بچپن میں ہی میری ماں کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے ڈرتی تھی کہ میں جلدی یتیم ہو جاؤں گی۔ لیکن میرے باپ نے خود کبھی نہیں کہا تھا کہ ان کے مرنے سے پہلے میں شادی کر لوں۔ وہ اپنے بچوں کے معاملات میں بالکل دخل نہیں دیتے تھے۔

''تمہارا کلنک بہت اچھی جگہ پر ہے۔'' انہوں نے میرے کلنک اور اس علاقے کی تعریف کی؟

''یہ تو بہت ہی گندہ علاقہ ہے۔'' میں نے اپنے اندرونی جذبات چھپاتے ہوئے کہا۔

''تم جانتی نہیں' گندے علاقوں میں لوگ زیادہ بیمار ہوتے ہیں۔ اور پھر تم نے جو تعلیم حاصل کی ہے اس سے بہت زیادہ کمائی کرنے کی امید نہ رکھو قدیم زمانے سے ہی طبیب کا کام علاج کرنا رہا ہے۔ کمائی کرنا نہیں۔ یہ دماغ میں رکھو اور پھر اپنا کام کرو۔'' میرے باپ نے کہا۔

میں نے مشکل سے اپنی ہنسی دبائی۔ میرا ماضی اور مستقبل کوئی نہیں جانتا۔ اور یہ بھی کوئی نہیں جانتا کہ میں نے اپنے دل میں کتنے درد چھپا رکھے ہیں۔

وہ جانے لگے تو میں نے کہا ذرا ٹھہر جایئے۔ معلوم نہیں میرے اس کہنے سے انہوں نے کیا سمجھا کہ کہنے لگے' میرے لیے تکلف نہ کرو۔ میرا کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔ میں نے بھی انہیں نہیں روکا۔ لیکن میں یہ چاہتی تھی کہ جس کرسی پر وہ بیٹھے ہیں وہیں بیٹھے رہیں۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ بچے اپنے ماں باپ کی تصویریں کیوں کھنچوانا چاہتے ہیں۔ اس وقت میں نے ان کی تصویر تو نہیں کھینچی مگر جس طرح وہ اس کرسی پر بیٹھے تھے اس کی تصویر میرے دل پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گئی۔

وہ تھوڑی دیر اسی طرح بیٹھے رہے۔ پھر جھجکتے ہوئے وہ تحفہ مجھے دیا جو وہ میرے لیے لائے تھے۔ چلتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ اب وہ میرے بڑے بھائی کے پاس جائیں گے جو نائیوان میں رہتے ہیں۔ وہ آخری دن تھا جب میں نے اپنے باپ کو دیکھا تھا۔ میرے لیے وہ جو تحفہ لائے تھے وہ بقراط کا وہ حلف تھا جو تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر اٹھاتے ہیں۔ میں نے اس وقت تو خاموشی سے وہ حلف نامہ لے لیا مگر بعد میں مجھے ہنسی آ گئی۔ ان کے سامنے میں ایسے نہیں ہنس

MashalBooks.com

سکتی تھی۔ وہ مخملی کرسی پر بیٹھے مجھے علاج معالجے کے بارے میں وہ نصیحت کر رہے تھے جس سے میں بہت دور جا چکی تھی۔ دل تو چاہتا تھا کہ دوسری بیکار چیزوں کی طرح اس تحفے کو بھی پھینک دوں لیکن کچھ سوچ کر میں نے اسے الماری میں ڈال دیا۔

گذشتہ تیس سال کے اندر میرے کلنک میں پانچ چھ مرتبہ تبدیلیاں کی جا چکی ہیں لیکن میں نے وہ جگہ نہیں چھوڑی۔ سال میں دو بار اس کی پوری طرح صفائی بھی کی جاتی ہے۔ اتنی تبدیلیوں کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ وہ کرسی وہاں سے ہٹا دی جاتی' اور پھر اس کلنک میں اس کی ضرورت بھی نہیں تھی' لیکن وہ کرسی اسی جگہ رہی۔ جب بھی رنگ وروغن کیا جاتا تو اس کرسی کی شامت آ جاتی۔ اسے ادھر سے ادھر دھکیلا جاتا۔ اس طرح وہ اور بھی میلی ہو جاتی۔ جب بھی وہ ادھر ادھر ہوتی تو میں اسے دوبارہ اپنی جگہ پر رکھ دیتی۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر یہ کرسی پھینکی تو میں اس دیوار پر بقراط کا حلف ٹانگنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے وہ کرسی نہیں پھینکی تھی۔

ستم ظریفی یہ ہوئی کہ میری پہلی مریض بوڑھے دھانگ کی بیٹی تھی۔ دھانگ اکیلا ہی رہتا تھا۔

کلنک کی شمالی کھڑکی سے اس کا رہائشی حصہ نظر آتا تھا۔ میں نے اسے اپنے اجاڑ گھر کے صحن میں کپڑے یا چاول دھوتے دیکھا تھا۔ اس کی ٹائلوں والی چھت' چوبی فرش اور باورچی خانہ کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ بوڑھا دھانگ کسی زمانے میں خوش حال زندگی گذارتا رہا ہے۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ جنگ کے زمانے میں اس کی بیوی اپنے خاندان والوں سے کھانے پینے کی چیزیں لینے جا رہی تھی تو کھیتوں میں وہ بم پھٹنے سے مر گئی تھی۔ اس کے دو بیٹوں کو کچھ لوگ اغوا کر کے شمالی کوریا لے گئے تھے۔ اس کی بوڑھی ماں بیمار ہو کر مر گئی تھی۔ اور اس کی اکلوتی بیٹی گھر سے بھاگ گئی تھی اور واپس نہیں آئی تھی۔ مجھے بالکل معلوم نہیں کہ وہ واپس کب آئی تھی۔ بوڑھا دھانگ آدھی رات کو میرے پاس آیا۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ اسے میری ضرورت تھی۔ یوں تو میں شب خوابی کے لباس میں ہی اس کے ساتھ جا سکتی تھی کہ فاصلہ ہی کتنا تھا۔ لیکن میں نے کپڑے تبدیل کرنا مناسب سمجھا۔ اس عرصے میں دھانگ کی حالت بری ہو رہی تھی۔ کبھی وہ بیٹھتا' کبھی کھڑا ہو جاتا، کبھی دروازہ کھولتا اور پھر بند کر دیتا تھا۔ ''مادام' جلدی کرو' جلدی جلدی وہ بہت بیمار ہے۔ پتہ نہیں اسے کیا بیماری ہے۔ اس کا پیٹ پھول گیا ہے۔ وہ درد سے چیخ رہی

ہے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے اسے کچھ ہو نہ جائے۔ آپ کو یقین ہے کہ آپ اسے سنبھال لیں گی؟ کسی کنواری لڑکی کا زچہ بچہ کی ڈاکٹر کے پاس جانا کتنے شرم کی بات ہے۔ کتیا کہیں کی' باپ کو چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے جنوب کی طرف بھاگ گئی۔ مگر میں کیا کروں۔ اگر ایک اور میرا بچہ مر گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گا۔ کیا آپ ہر طرح کی بیماری کا علاج کر سکتی ہیں؟ کسی کو معلوم تو نہیں ہوگا کہ ایک کنواری لڑکی آپ سے علاج کرا رہی ہے؟۔ مادام' آپ اسے بچا لیجیے ایک اور موت دیکھی تو میں زندہ نہیں رہوں گا''۔ اس کی آواز لرز رہی تھی اور وہ بولے چلا جا رہا تھا۔

بوڑھا دھانگ بہت ہی جذباتی ہو رہا تھا۔ لیکن زچہ بچہ کے ڈاکٹروں کا ذکر ایسے کر رہا تھا جیسے وہ نہایت ہی گھناؤنی چیز ہوں۔ جی چاہ رہا تھا کہ میں اس کا مذاق اڑاؤں لیکن میں خاموش رہی اور آرام سے تیار ہوتی رہی حالانکہ اس کی بیٹی میری پہلی مریض تھی۔ میں نے ڈاکٹروں والا گاؤن پہنا اور اپنے ہاتھ خوب دھوئے۔ پھر بچے کی پیدائش والے ضروری آلات بیگ میں رکھے۔ دھانگ نے لرزتے ہاتھوں میں میرا بیگ پکڑا اور جلدی جلدی سیڑھیوں سے اتر گیا۔ اس کے گھر سے دل خراش چیخوں کی آواز آ رہی تھی جیسے کسی جانور کا گلا گھونٹا جا رہا ہو۔

میں نے اندر کمرے میں ایک لڑکی کو لیٹے دیکھا جو اپنے ہونٹ چبا رہی تھی۔ اس نے اپنے کپڑے ہاتھوں میں بھینچ رکھے تھے۔ اس لڑکی نے رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھا پسینے میں اس کا سارا چہرہ بھیگا ہوا تھا' ماتھے پر بال چپکے ہوئے تھے اور باہر کو نکلی ہوئی اس کی آنکھیں درد کی شدت سے ایسی ہو گئی تھیں کہ وہ کسی انسان کی آنکھیں معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ اس کا پانی کب پھٹا ہے لیکن اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔

میں نے بوڑھے دانگ کو سرہانے کی طرف دھکیلا اور خود پائنتی کی طرف چلی گئی اور اس کے کپڑے اٹھائے۔ میرا حلق اتنا خشک ہو رہا تھا کہ منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا۔ لڑکی کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ پھر اس نے سرہانے کھڑے ہوئے اپنے باپ کی ٹانگوں کی طرف دونوں ہاتھ بڑھائے اور انہیں پکڑ لیا۔ اس کا باپ بت کی طرح خاموش کھڑا تھا۔

بوڑھے دھانگ نے وحشی جانور کی سی چیخ ماری اور بستر پر جھک گیا۔ لڑکی نے اس کی کمر پکڑ رکھی تھی اور زور لگا رہی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ بچے کا سر باہر آ گیا ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس حالت میں بھی بچے نے آسانی سے آنکھیں کھولیں۔ وہ پورے مہینوں کا بچہ تھا۔ چند

MashalBooks.com

لمحوں کے لیے تو میں خود حیران رہ گئی تھی لیکن اسی حیرت میں میں اس لڑکی پر چیخی۔ ''اور زور لگاؤ۔''

اس وقت مجھے اپنی آواز عجیب سی لگی۔ یوں لگا جیسے یہ کسی اور کی آواز ہو اور میں پہلی مرتبہ یہ آواز سن رہی ہوں۔ اب پھر وہ لڑکی زور سے دہاڑی اور میں نے ایک ماہر دائی کی طرح وہ بچہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ یہ میرا پہلا کیس تھا مگر مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی اور طاقت مجھ سے یہ کام کرا رہی ہے۔ بوڑھے وھانگ کی بیٹی کے بیٹا پیدا ہوا تھا۔

واپس گھر جا کر میں ایسی سوئی کہ صبح کو ہی آنکھ کھلی۔ ناشتہ بناتے ہوئے میں گنگنا رہی تھی۔ پھر بوڑھا وھانگ آ گیا۔ رات کی رات وہ اور بھی بوڑھا اور میلا کچیلا ہو گیا تھا۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ پہنچانا ہی نہیں جاتا تھا۔ اس کی نظریں نیچی تھیں اور کاندھے جھکے ہوئے تھے۔

''ماں اور بچہ کیسے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں آپ کے سامنے آنکھ نہیں اٹھا سکتا'' اس نے کہا۔

''اب آپ سمجھے کہ عورتوں کو گائنا کالوجسٹ کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟''

''گائنا کالوجسٹ؟ میں نے ایسا کونسا گناہ کیا تھا جس کی مجھے یہ سزا ملی ہے۔''

''سزا؟ آپ کو تو نواسہ مل گیا ہے۔ کتنا پیارا بچہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے ابھی وہ پوری طرح ماں کے پیٹ سے باہر بھی نہیں آیا تھا کہ اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا تھا۔ وہ تو بہت بڑا سورما بنے گا۔ میں نے بڑے جوش و خروش سے کہا۔ اب وھانگ نے نظریں اٹھائیں۔ وہ آنکھیں کسی غار کی طرح گہری اور خالی خالی تھیں۔

''یہ بے عزتی میں کیسے برداشت کروں گا؟ وہ کہتی ہے اسے نہیں معلوم کہ بچے کا باپ کون ہے۔ میں نے معلوم کرنے کی بہت کوشش کی۔ میں نے کہا اگر وہ چیچک کے چہرے والا یا ٹیڑھی اور چپٹی ناک والا ہے تب بھی میں دھوم دھام سے اس کے ساتھ تیری شادی کرا دوں گا۔ مگر وہ کچھ اگلتی ہی نہیں۔ وہ صرف روتی رہتی ہے اور کہتی ہے اب یہ سب باتیں بیکار ہیں۔ پتہ ہے اس نے کیا کہا؟ وہ کہتی ہے اس کی آبروریزی کی گئی تھی۔ اور جس نے کی تھی اسے وہ نہیں جانتی۔''

وہ صدمے اور طیش سے کانپ رہا تھا۔ اچانک مجھے ایسا لگا جیسے یہ سب بیان کرتے ہوئے اس کے انداز میں لذت کا شائبہ بھی ہے۔ مجھے متلی آنے لگی۔ میں سوچنے لگی ہر مرد عورت کی آبروریزی کر سکتا ہے۔ میرے لیے یہی جاننا کافی تھا کہ ہر مرد آبروریزی کرنے کی طاقت رکھتا

ہے یہ اہم نہیں تھا کہ اس کا نام کیا ہے۔

''یہ عذاب میرے اوپر ہی کیوں نازل ہوا ہے۔ میرے تباہ شدہ گھر پر۔ میں بتا نہیں سکتا کہ اس بدبخت لڑکی نے میرے اور میرے خاندان کے ساتھ کیا کیا ہے۔

میں اس کے خاندان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی' لیکن اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے سب سے زیادہ فکر اپنے خاندان کی بدنامی کی تھی' جس پر دھبہ لگ چکا ہے۔ اسے بالکل احساس نہیں تھا کہ اس ان چاہے حمل کے دوران اس کی بیٹی پر کیا گذرے ہوگی۔

''مادام' ہماری مدد کیجیے۔'' وہ بوڑھا میرے سامنے' ہاتھ جوڑ رہا تھا۔ صدمے سے اس کا چہرہ اور بھی مکروہ ہو گیا تھا۔

''معاف کرنا، میں بچہ ماں کے پیٹ میں دوبارہ نہیں رکھ سکتی۔'' میں نے کہا اور مجھے افسوس ہوا کہ اس سے زیادہ سخت الفاظ میں ادا نہیں کر سکتی تھی۔

''مادام یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ ہکلایا اور اس کے چہرے پر کچھ روشنی سی آ گئی۔ اس کے کسانوں والے چہرے پر یہ تاثر مجھے اور بھی مکروہ لگا۔ اور چونکہ میں اس کی وجہ جاننا نہیں چاہتی تھی اس لیے میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی رہی۔ اس نے اپنا منہ موڑ لیا جیسے میری نظروں نے اسے اندھا کر دیا ہو۔ وہ اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔

''میرا مطلب یہ نہیں تھا مادام' بس آپ یہ ظاہر کیجیے جیسے آپ کو کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ بچے کو اوندھا لٹا دو تو وہ مر جائے گا مگر اس کا منہ دیکھنے کے بعد مجھ سے یہ نہیں ہو سکا۔''

''انکل' آپ صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتے کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟''

''ہاں ہاں میں بتا رہا ہوں۔ میری کمبخت بیٹی اپنے ساتھ بے غیرتی اور بے عزتی لائی ہے۔ لیکن کل رات جب وہ آئی تو خوش قسمتی سے اسے کسی نے دیکھا نہیں۔ اس لیے میں آپ سے یہ مہربانی چاہتا ہوں کہ آپ کسی کو بھی نہ بتائیں کہ میری بیٹی واپس آ گئی ہے۔ اس بچے کو میں اپنے بچے کی طرح پال لوں گا۔

''اپنا بچہ انکل؟'' اس کی بات پر میں حیران رہ گئی۔

''ہاں ہاں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں لوگوں سے کہوں کہ یہ بچہ مجھے ایک جگہ پڑا ہوا ملا ہے؟

MashalBooks.com

اس طرح میں میری بیٹی پیچھے کمرے میں چھپی رہے گی۔ اور جب اس کی صحت اچھی ہو جائے گی تو وہ باہر آ جائے گی۔ لوگ سمجھیں گے کہ وہ ابھی واپس آئی ہے۔ اور میں سب کو بتاؤں گا کہ وہ کہاں گئی تھی اور کیوں گئی تھی۔''

''آپ کی بیٹی یہ مان لے گی؟''

''اس کی مجال ہے کہ وہ نہ مانے۔ میں تو ماں اور بچے دونوں کی جان بچا رہا ہوں۔''

''بہرحال وہ آپ کی بیٹی کا بچہ ہے۔''

''تو کیا ہوا۔ اس کا بیٹا ہے تو میرا بھی نواسہ ہے۔''

بوڑھے وھانگ نے مجھے ایسے جواب دیا جیسے اسکول کے بچے اصرار کرتے ہیں کہ ان کا جواب صحیح ہے۔ لیکن اس کے بعد فوراً ہی وہ پھر مسکین سا بن گیا۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اب وہ کیا کرے۔ وہ ایسے ہاتھ مل رہا تھا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ کیا میں اس کی تجویز سے اتفاق کر لوں؟۔ میں سوچنے لگی۔

''آپ کا خیال صحیح ہے' اپنی بیٹی کو بدنامی سے بچانے کا یہی طریقہ ہے۔ اب آپ اسے منا لیجیے۔'' آخر میں نے اس سے اتفاق کر لیا۔

''اچھا تو آپ سچ مچ یہ سمجھ رہی ہیں کہ میں اپنی بیٹی کو بدنامی سے بچانے کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں؟ اصل بات تو یہ ہے کہ ایک ایسے خاندان میں ایک بچہ آیا ہے جس کے تمام لڑکے مارے جا چکے ہیں اور اس خاندان کو بے ثمر درخت کہا جانے لگا ہے۔ یہ بچہ تو پھل پھول لے کر آیا ہے۔ اگر میں لوگوں سے کہوں کہ مجھے اپنی دہلیز پر یہ بچہ ملا ہے تو تمام لوگ خوش ہو جائیں گے اور مجھ سے کہیں گے کہ اب جشن مناؤ۔ مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی بھی اس بچے کو اپنا بھائی ہی کہے گی۔ بڑے پیار سے اسے پالے گی۔ اور اگر اس عرصے میں کوئی مناسب لڑکا مل گیا تو اس کی شادی بھی ہو جائے گی۔ پھر کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ کہ یہ بچہ کس کا ہے۔''

بوڑھا وھانگ ایک رات پہلے کے واقعے کو حیرت انگیز طور پر اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا' اب اس کے چہرے پر رونق بھی آ گئی تھی۔ وہ اپنی قسمت کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ وہ ایسے چمک رہا تھا جیسے مچھلی کے چاننے دھوپ میں چمکتے ہیں۔

''اگر مادام' آپ بھول جائیں..... اگرچہ یہ بات اس نے نظریں نیچی کر کے کہی تھی پھر بھی

میں جانتی تھی کہ اب اس کی آنکھیں مایوسی اور ناامیدی کا خول نہیں ہیں جیسے وہ پہلے نظر آتی تھیں۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اگر میں اس کی بات نہیں مانوں گی تو وہ میرا گلا گھونٹ دے گا۔ مردوں کا کیا ہے اپنے مطلب کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

بوڑھا وہانگ بظاہر سنگ دل نظر آتا تھا مگر وہ ظالم نہیں تھا یہ میں نے اس وقت سوچا جب میں اس سے اپنا منہ بند رکھنے کا وعدہ کر رہی تھی۔ اس کی بیٹی' بیٹی کے بچے اور خود وھانگ کے لیے بھی یہی بہتر راستہ تھا۔ بلکہ مجھے رشک آ رہا تھا کہ بدقسمتی اچانک خوش قسمتی میں کیسے بدل گئی ہے۔

جیسے ہی میں نے خاموش رہنے کا وعدہ کیا بوڑھے وھانگ نے سر جھکا جھکا کر بار بار میرا شکریہ ادا کرنا شروع کر دیا۔ پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کا ایک بنڈل نکالا۔

''کل رات آپ نے جس طرح دو جانیں بچائی ہیں میں اس کا شکریہ تو ادا نہیں کر سکتا بس ایک ہدیہ سمجھ کے یہ چند نوٹ لے لیجے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔''

بوڑھا وھانگ سیڑھیوں سے اس تیزی سے اترا جیسے وہ کہیں بھاگا جا رہا ہو۔ اس کے جانے کے بعد میں نے نوٹ گنے۔ وہ رقم میری مقررہ فیس سے تین گنا زیادہ تھی۔ اس نے میرا منہ بند کرنے کے لیے رقم بڑھا دی تھی۔ میں ایک بار پھر رشک اور حسد میں مبتلا ہو گئی۔ میں نے ان نوٹوں پر تھوکا، بالکل اس طرح جیسے بین الاقوامی منڈی کے تاجر ہر روز اپنی پہلی کمائی پر تھوکتے ہیں۔ بوڑھے وھانگ کی رقم میری پہلی کمائی تھی۔ اور یہ خاصی بڑی رقم تھی۔ لیکن اب میرا ارادہ بچے پیدا کرانے کا ہرگز نہیں تھا۔ میں تو بالغ مردوں اور عورتوں کی اس فحش عیاشی سے کمائی کرنا چاہتی تھی جو اس علاقے میں عام تھی۔ اسی لیے میں نے بچے پیدا کرنے والی عورت کے لیے خاص میز بھی اپنے کلنک میں نہیں ڈالی تھی۔ میرا ارادہ مرد اور عورت کے ناجائز تعلقات سے کمائی کرنے کا تھا۔

اس علاقے میں قدم رکھنے سے پہلے میرے دل میں جو وسوسے تھے وہ صحیح ثابت ہو رہے تھے۔ میرا کاروبار اس وقت تیز ہوا جب طوائفوں نے میرے پاس آنا شروع کیا۔ یہ طوائفیں وہ تھیں جن کے پاس امریکی فوجی آیا کرتے تھے۔ میرا کام ان عورتوں کے بچے گرانا تھا۔ میں ہر روز کئی کئی بچے گراتی آخر میں بچے گرانے کی ماہر بن گئی۔ میں نے جو بچے گرائے اگر وہ سب زندہ رہتے تو ایک بڑا اسکول ان سے بھر سکتا تھا۔ یا پھر ایک چھوٹا سا شہر آباد ہو جاتا۔ جذباتی

MashalBooks.com

طور پر میرے لیے ابھی تک جو پریشانی کی چیز تھی وہ تھی مخملی کرسی' جسے میں کھڑکی کے پاس سے نہیں ہٹا سکی تھی۔ وقت کے ساتھ جیسے جیسے وہ کرسی باوقار انداز میں پرانی ہوتی جارہی تھی ویسے ہی وہ کلنک میں اور بھی بے کار اور بے تکی سی لگنے لگی تھی۔ دوسری چیزوں کے ساتھ وہ بالکل اچھی نہ لگتی تھی۔ جو بھی نرس میرے کلنک میں آتی وہ یہی کہتی کہ اس کرسی کو پھینک دو۔ عام طور پر میں اپنا کلنک نرسوں پر ہی چھوڑ دیا کرتی تھی اس کے باوجود کرسی پھینکنے کے بارے میں ان کی بات میں نے نہیں مانی۔

اگر میں کرسی پھینک دیتی تو مجھے بقراط والا حلف دیوار پر لٹکانا پڑتا۔ اس حلف کے تحت ڈاکٹروں کو بہت سے اخلاقی ضابطوں کا پابند بنایا جاتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کرسی پھینکنے کو میرا اپنا دل بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اس کرسی کے ساتھ میرے باپ کی یاد بھی شامل ہوگئی تھی۔ وہ چمکتے ہوئے نوکیلے جوتے اور سفید سوتی ''دروکی'' پہنے اس کرسی پر بیٹھے تھے۔ دراصل اس کرسی کے مالک اب میرے باپ ہی بن گئے تھے۔ میں اس کرسی پر بیٹھے ہوئے اپنے باپ کا افسردہ چہرہ نہیں بھول سکتی تھی۔ اپنے مرحوم باپ کے ساتھ میری محبت اور بھی شدید ہوگئی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ مجھے سچے اور ایماندار ڈاکٹر کی طرح دیکھتے' اس طرح نہیں جیسے میں اب ڈاکٹر کے بجائے کاریگر یا ایک ٹیکنیشن بن گئی ہوں جس کے طوائفوں کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں۔

اسی علاقے میں اور اسی ہارڈ ویئر اسٹور کی اوپر والی منزل پر کلنک چلاتے مجھے بتیس سال کے قریب ہو چکے تھے۔ ان برسوں میں اس علاقے میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ اب یہ علاقہ شہر کے نواح میں نہیں رہا تھا بلکہ وہ شہر کے وسط میں آ گیا تھا۔ اور امریکی فوجیوں کو خوش کرنے والی آخری طوائف بھی وہاں سے جا چکی تھی۔ البتہ چکلے کی وہ ہوا جس نے مجھے مسحور کر رکھا تھا، وہ امریکی فوجوں کی پسندیدہ طوائفوں کے جانے کے بعد بھی کافی عرصے مجھے اپنی لپیٹ میں لیے رہی۔

سیول میں حکومت کے دفاتر واپس آنے کے بعد بھی دو تین سال تک زراعتی ہائی اسکول میں امریکہ کا فوجی اڈہ قائم رہا۔ یہ اسکول جب اپنی اصل حالت میں بحال ہوا تو امریکہ کا بہت بڑا فوجی اڈہ ہمارے شہر کے قریب ہی چلا آیا۔ چنانچہ ہمارے نواح میں مردوں کی عیاشی' زور شور سے

جاری رہی حتی کہ جب فوجی اڈہ چھوٹا ہو گیا تب بھی عصمت فروشی کی جڑیں آسانی کے ساتھ وہاں سے نکالی نہ جا سکیں۔ ہمارے محلے کی ہر گلی سستا قحبہ خانہ بنی ہوئی تھی۔ چونکہ رہائشی علاقوں میں یہ کاروبار کرنے والوں پر چھاپے مارے جاتے تھے اس لیے یہ لوگ ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ میرے اب بھی ایسے مریض تھے جو دور دور سے میرے پاس آتے تھے۔ پھر چونکہ رواج یہ تھا کہ صرف دو بچے ہی پالے جائیں' چاہے وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں' اس لیے اکثر شادی شدہ عورتیں بھی میری خدمات حاصل کرتی تھیں۔

پھر زراعتی اسکول نے اپنی جگہ ایک تعمیراتی ادارے کے ہاتھ فروخت کر دی اور وہ شہر کے نواح میں چلا گیا۔ اس جگہ پر رہائشی فلیٹ بنا دیے گئے۔ لیکن میرے لیے افسوس کی بات یہ تھی کہ اس خوش حال علاقے سے ایک بھی مریض میرے کلینک نہیں آئی۔ میرے پاس خستہ حال گنجان علاقوں سے ہی عورتیں آتی تھیں۔ یہی میری لگی بندھی مریض تھیں جو کیونگ سونگ اسٹور کے عقب میں رہتی تھیں۔ میں پرانے شریف علاقوں میں سستی اور قابل اعتبار ڈاکٹر کے طور پر مشہور تھی اور قحبہ خانے والوں میں میری بہت اچھی ساکھ تھی۔ اور یہ قحبہ خانے شہر بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہاں کی رہنے والیاں اپنے پیشے سے جان نہیں چھڑا سکی تھیں۔

میری مریضوں میں میری شہرت اس لیے بھی اچھی تھی کہ میں نے اپنے کام میں کبھی کوئی سنگین غلطی نہیں کی تھی۔ کسی بھی غریب عورت کا اس ڈاکٹر کے پاس جانا قدرتی بات ہے جو سستی بھی ہو اور جس کے بارے میں یہ یقین ہو کہ وہ بات پھیلائے گی بھی نہیں۔ اصل میں میری غلطی نہ کرنے کی شہرت اور اصل حقیقت میں تھوڑا ہی فرق تھا۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو جاتی تو میں خاموشی سے اور جلدی سے اس کے نتائج کا مقابلہ کر لیتی تھی۔ خوش قسمتی سے میرے اس اقدام کی وجہ سے زیادہ پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ بس یہی فرق تھا۔

میں اپنے جس ہاتھ میں نشتر اور قینچی پکڑتی تھی اس میں تین گانٹھیں پڑ گئی تھیں۔ یہ گانٹھیں ان بچوں کی یادگار تھیں جن کی زندگیاں ختم کر دی گئی تھیں' وہ بچے اگر زندہ رہتے تو ایک معقول سائز کے شہر کی آبادی میں اضافہ کر سکتے تھے۔

میں اپنا کام آنکھیں بند کر کے بھی کر سکتی تھی لیکن کبھی کبھی غلطی بھی ہو جاتی تھی۔ بعض اوقات تو میں بہت ہی خطرناک غلطی کر جاتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے اپنے اوپر کچھ زیادہ ہی اعتماد تھا۔

MashalBooks.com

اور پھر جس جگہ کاٹنا ہوتا تھا وہ جگہ نظروں سے اوجھل ہی ہوتی تھی۔ دراصل بڑے سے بڑا مشہور اور ماہر ڈاکٹر بھی ماں کے پیٹ میں اس پراسرار جگہ کو نہیں دیکھ سکتا جہاں نئی زندگی پروان چڑھ رہی ہو۔ وہ جگہ اگر کوئی چیز دیکھ سکتی ہے تو وہ ہے طبی آلات کی آنکھ۔ البتہ ان آلات کی آنکھ کو مستعد رکھنے کے لیے ڈاکٹر کا خود بھی چوکنا رہنا اور پوری توجہ اپنے کام پر مرکوز رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اگر ڈاکٹر کی پوری توجہ اپنے کام پر نہیں ہوگی تو وہ کامیاب نہیں ہوسکتی۔

جیسے کوئی نازک پودہ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے یا بے خیالی میں ماچس سے سوراخ کرتے ہوئے انسان کو محسوس ہوجاتا ہے کہ اس سے کوئی غلطی ہورہی ہے اسی طرح اگر اس کام میں ذرا سی توجہ ہٹ جائے تو احساس ہوجاتا ہے کہ کہیں ضرور غلطی ہوگئی ہے۔ جب بھی مجھ سے کوئی ایسی غلطی ہوتی تو میری روح اپنے آپ سے نفرت سے بھر جاتی۔ میں اپنا کام حقارت کے ساتھ کرتی تھی۔ غلطی کے بغیر کام کرنے کے لیے مجھے حقارت کے ساتھ یہ کام کرنا پڑتا تھا۔ میں ان عورتوں سے نفرت کرتی تھی جو اپنے بدبودار اعضا کھولے میرے سامنے پڑی ہوتی تھیں۔ میں نفرت کرتی اس ان چاہی زندگی سے جو عورت کے پیٹ میں کوئی شکل اختیار کررہی ہوتی تھی۔ نفرت کا یہ احساس ہی تھا جو مجھ سے غلطی کا فوراً ازالہ کرادیتا تھا۔ میری روح جب میرے ہاتھ میں داخل ہوجاتی تو میں ہر صورت حال کا مقابلہ نہایت آسانی سے اور مستعدی سے کرلیتی تھی۔

دیکھنے والوں کے لیے میں بالکل نہیں بدلی تھی۔ میرے چہرے کا رنگ ویسا ہی تھا۔ بلکہ میں جتنی غلطیاں کرتی اتنی ہی زیادہ پرسکون ہوجاتی۔ بچہ گرانے کا کام میں پورے سکون کے ساتھ کرتی اور بعد میں زچہ کو سکون کا ٹیکہ لگاتی اور اینٹی بایوٹک دوائیں دیتی۔ پھر عورت سے کہتی کہ آرام کرو اور صحت یاب ہونے کا انتظار کرو۔ انہیں تسلی دینے کے لیے میرے پاس چند بندھے ٹکے لفظ تھے۔ جیسے یہ بہت ہی مشکل آپریشن تھا۔ تمہارے اندر ایسی پیچیدگی تھی اتنا درد ہوا۔ نازک پودے کی طرح انسانی اعضا بھی جلدی مرجھا سکتے ہیں لیکن انسانی اعضا میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ٹھیک ہوجاتے ہیں۔ آج تک میری پیشہ ورانہ زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی عورت کا کیس خراب ہوا ہو۔

البتہ میری ایک کمزوری تھی۔ ہر آپریشن کے بعد میں تھکن سے چور ہوجاتی تھی۔ لگتا تھا جیسے میں بیمار ہوگئی ہوں اور اب میں بچہ گرانے کا کام نہیں کرسکوں گی۔ پھر آہستہ آہستہ میں اپنے آپ پر

قابو پاتی اور اپنے دل کو تسلی دیتی۔ میں نے طے کیا تھا کہ پچپن سال کی عمر تک میں یہ کام کروں گی۔ اس عمر کی میرے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ شاید میں نے یہ عمر اس لیے مقرر کی تھی کہ سرکاری دفتروں میں یا بینکوں میں کام کرنے والے لوگ اس عمر میں ریٹائر ہوجاتے ہیں۔

آخر وہ وقت آگیا جب تین دن کے اندر میں پچپن سال کی ہونے والی تھی۔ اتفاق سے میرے پچپن سال ہونے کا دن وہی تھا جس دن شہری ترقی کے منصوبے کے مطابق کیونگ سونگ اسٹور بھی گرایا جانے والا تھا۔ میں نے اس عرصے میں اتنی رقم جمع کرلی تھی کہ میں باقی زندگی آرام اور سکون کے ساتھ گذار سکتی تھی۔ میں سیر و تفریح کے لیے بیرون ملک بھی جاسکتی تھی۔ سرکاری ملازم کی طرح مجھے کوئی شرط بھی پوری کرنا نہیں تھی اور نہ میں کسی ایسے معاہدے کی پابند تھی کہ مجھے پچپن سال کے بعد بھی کام کرنا پڑتا۔ پچپن سال کے بعد تو بالکل ہی میرا کام کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ میں نے ایک پرسکون علاقے میں پہلے ہی خوبصورت سا گھر خرید لیا تھا۔ جس کا صحن کافی کشادہ تھا۔ اس گھر کو اچھی طرح سجا بھی لیا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے جو جائیداد خریدی تھی اس سے معقول کرایہ بھی مل رہا تھا۔ اور میں نے ریٹائرمنٹ کے بیمے کی آخری قسط بھی ادا کردی تھی۔ اب صرف یہ کام رہ گیا تھا کہ میں ہر سال انشورنس کمپنی سے رقم وصول کرتی رہوں۔ میرے پاس مختلف کمپنیوں کے حصے اور بانڈ بھی تھے۔ اب سونے سے پہلے میرا کام دولت کمانا نہیں اسے خرچ کرنا رہ گیا تھا۔ اس کے باوجود میں سخت پریشان تھی کہ اس پیشے سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھونے سے پہلے میرے پاس صرف تین دن رہ گئے ہیں۔ کلنک کھولنے کے بعد میری پہلی گاہک حاملہ عورت تھی۔ اس کے بعد کسی نہ کسی وجہ سے میرے ہاتھوں سے ایک بھی زندہ بچہ پیدا نہیں ہوا۔ چونکہ میں جان بوجھ کر بچے پیدا کرانے کا کام نہیں کرتی تھی اس لیے میں بچے گرانے والی ڈاکٹر مشہور ہوگئی تھی۔ شروع کے برسوں میں میرے پاس ایسے کیس آئے جن میں بچے پیدا کرنے کا کام تھا۔ مگر میں نے وہ دوسرے ڈاکٹروں کے پاس بھیج دیئے۔ پھر ایسے کیس آنا بند ہوگئے۔ اس لیے ایسا کوئی امکان ہی نہیں تھا کہ کبھی کوئی زندہ بچہ میرے ہاتھوں سے پیدا ہوتا۔

پچھلے دو تین مہینے سے میں نے الٹی گنتی گننا شروع کردی تھی۔ ساٹھ دن، پچاس دن، دس دن، نو دن، آٹھ دن۔ حتیٰ کہ تین دن رہ گئے۔ اب میں بے چینی سے اس دن کا انتظار کررہی تھی جب میں اپنے ہاتھوں سے کوئی زندہ بچہ پیدا کرتی۔ جتنا میں یہ سوچتی کہ میرے ہاتھوں سے زندہ بچہ

MashalBooks.com

پیدا ہونا ممکن نہیں اتنا ہی یہ تجربہ کرنے کے لیے میری خواہش بڑھتی جاتی۔ پرانی بات یاد کرتے ہوئے میں سوچتی کہ جب میں نے پہلا بچہ پیدا کرایا اس وقت آج کے مقابلے میں کتنی ناتجربہ کار تھی۔ پھر بھی میں اپنے آپ کو ایسی عورت سمجھتی جو اس وقت خواہ کتنا ہی غور وفکر کرتی تب بھی یہ کبھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ میں مستقبل کی عورت بنوں گی۔ ایک ایسی عورت جو کامیاب زندگی گزارے گی' جس کی ایک منزل ہوگی اور جو اپنے آپ کو آئیڈیل عورت سمجھے گی ایسا لگتا تھا جیسے بڑھاپے کی طرف بڑھتے ہوئے وقت نے میری یادداشت بھی بدل دی ہے۔

تین دن رہ گئے ہیں صرف تین دن۔

صرف تین دن رہ گئے ہیں میری وہ خواہش پوری ہونے میں جو مان دیوک کی بیوی کو دیکھ کر میرے اندر پیدا ہوئی تھی۔ اس کے حمل کا آخری مہینہ تھا۔

مان دیوک بوڑھے وہانگ کا نواسا ہے' وہ پہلا بچہ جسے صحیح سلامت اس دنیا میں لانے کی ذمہ دار میں ہوں۔ اس دن بوڑھے وھانگ نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کی بیٹی کو میں بدنامی سے بچالوں اس نے سارے محلے میں اڑادیا کہ کوئی عورت یہ بچہ اس کے دروازے پر رکھ گئی ہے۔ پہلے تو لوگوں کو بہت تجسس ہوا کہ وہ کون عورت ہے جو اپنا بچہ پھینک کر چلی گئی ہے۔ پھر یہ مشہور ہوگیا کہ قدرت کی طرف سے بوڑھے وھانگ کو یہ عطیہ ملا ہے۔ اس لیے اس بچے کا کوئی نام ہی نہیں رکھا گیا۔ وقت گذرنے کے ساتھ تمام لوگوں نے بہت سوچ بچار کے بعد وھانگ کو مشورہ دیا کہ وہ اس بچے کو اپنا لے پالک بیٹا بنالے۔ اس طرح اسے وھانگ کا خاندانی نام بھی مل جائے گا۔ بوڑھے وھانگ کا اپنا ارادہ بھی یہی تھا لیکن لوگوں کو دکھانے کے لیے اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ بادل نخواستہ لوگوں کی بات مان رہا ہے۔ پھر اس نے بچے کا نام ''مان دیوک'' رکھا' جس کا مطلب ہے ''بڑھاپے میں پیدا ہونے والا بچہ۔'' بوڑھے وھانگ نے لوگوں سے التجا کی کہ اب وہ اس بچے کو ''غیب سے آنے والا بچہ'' نہ کہیں۔

ایک مہینے بعد وہ بچہ اس خاندان کا حصہ بنا۔ اس عرصے میں بوڑھے کی بیٹی بھی گھر آگئی۔ اس لڑکی نے بچے کو سب کے سامنے اپنا دودھ تو نہیں پلایا مگر اسے اپنا بھائی بنا کر اس پیار سے اور محبت سے پالا کہ سارا محلہ اس کی تعریف کرنے لگا۔ وہ لڑکا پانچ سال کا ہوا تو بوڑھے کی بیٹی ادھیڑ عمر کی بن بیاہی عورت بن چکی تھی۔ آخر ایک وقت ایسا آیا جب ایک ایسا رنڈوا مل گیا جس کے کوئی بچہ

نہیں تھا۔ بوڑھے وھانگ نے جلدی جلدی اس کی شادی کردی۔ اب وہ شادی شدہ زندگی گزارتی ہے اس کے دو بچے ہیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ بوڑھے وھانگ نے جو خواب دیکھا تھا وہ پورا ہوگیا۔ اس منظرنامے میں میرا کیا کردار تھا؟ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ اپنا کلنک میں کہیں اور لے جاؤں' مگر میرا کام روز بروز بڑھ رہا تھا' میری کمائی خوب ہو رہی تھی۔ اس لیے میں وہیں رہی۔

بوڑھا وھانگ بہت ہی ضدی' شکی مزاج اور اتنا کنجوس تھا کہ وہ ''مکھی چوس'' بوڑھا مشہور ہوگیا تھا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ وہ شکی بھی ہوتا جارہا تھا۔ لیکن مان دیوک ایک خوبصورت نوجوان بن کر ابھر رہا تھا۔ وہ خوب شاہ خرچ تھا اور تیز رفتار زندگی گذار رہا تھا۔ بوڑھے وھانگ نے اسے اپنے اکلوتے بیٹے کی طرح پالا تھا۔ اس کی بیوی بہت پہلے زچگی میں مرگئی تھی۔ وھانگ کی یہ بات ہر ایک نے مان لی تھی کہ وہ لڑکا اس کا لے پالک ہے۔

صرف ایک میں ہی تھی جو اصل راز جانتی تھی۔ میں یہ بھی جانتی تھی مان دیوک کے لیے بوڑھے وھانگ کے دل میں جتنی محبت ہے اتنی ہی شدید نفرت بھی ہے۔ اور محبت اور نفرت کی یہ کشمکش برابر جاری رہتی ہے۔ اگر وہ چاہتا تو اس لڑکے کی بری عادتیں ختم کرا سکتا تھا مگر وہ ''فرماں بردار'' باپ بن گیا تھا۔ وہ لڑکا کھانے میں نقص نکالتا اور دوکھانوں کے درمیان بھی الٹی سیدھی چیزیں کھاتا رہتا۔ البتہ کبھی کبھی وہ لڑکا اسکول سے ایسی رپورٹ لاتا جس میں اسے پورے نمبر ملے ہوتے تو بوڑھے وھانگ کو غصہ آجاتا اور وہ لڑکے سے کہتا سچ سچ بتاؤ' تم نے کہاں سے نقل کی تھی۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ لڑکا جھوٹ بولتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لڑکا گھر سے بھاگ گیا۔ بوڑھے وھانگ کی بیٹی نے یہ سنا تو وہ گھر آئی اور رونا شروع کردیا۔ بڑی مشکل سے وہ اپنے گھر واپس گئی۔

میرا خیال تھا کہ بوڑھا وھانگ یہ سوچ سوچ کر کڑھتا رہتا تھا کہ وہ بچہ ہے تو اس کی بیٹی کا مگر ہے ناجائز۔ وہ آدمی پہلے بہت صحت مند اور فراخدل تھا اب کمزور اور شکی مزاج بن گیا تھا۔ یہ جو کہتے ہیں کہ بدقسمتی نیک شگون بھی بن جاتی ہے اس کے لیے صحیح ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے بھی اس پر رحم آنے لگا۔ بوڑھے وھانگ کی بیٹی نے اس لڑکے پر یہ ظاہر تو نہیں کیا تھا کہ وہ اس کا بیٹا ہے لیکن وہ اسے بھائی بنا کر چپکے چپکے اس کی مدد کرتی رہتی تھی۔ اس لڑکے کو چونکہ

MashalBooks.com

بہت پیسے ملتے رہتے تھے اس لیے وہ دل کھول کر خرچ کرتا تھا۔ فوج کی ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد اسے نئی نوکری مل گئی تھی۔ اس لیے اس کی شاہ خرچی کی عادت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنی تنخواہ بتانے کے بجائے اپنی کمپنی کی سالانہ آمدنی بتا کر زیادہ خوش ہوتا تھا۔ اس طرح وہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ کلرک کے بجائے کمپنی کا بڑا افسر ہے۔ وہ کمپنی کی آمدنی بتا کر اپنے اخراجات کا جواز پیش کرتا تھا۔

بوڑھا وھانگ اس کی ان حرکتوں پر ناراض ہوتا تھا اور اس سے ایسے دور دور رہتا تھا جیسے وہ چور ہو۔ اس لڑکے کی مخالفت میں وہ بہت ہی کنجوس ہو گیا تھا حتی کہ کھانے پینے اور کپڑوں وغیرہ پر بھی اس نے خرچ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنے پیسے سنبھال سنبھال کر رکھنے لگا تھا۔ جب بھی وہ اس لڑکے کی طرف دیکھتا اس کی آنکھوں میں بالکل پیار نہیں ہوتا تھا۔ اسے اس لڑکے کی رگوں میں اپنی بیٹی کا خون نظر نہیں آتا تھا بلکہ اس مرد کا خون نظر آتا تھا جس نے اس کی بیٹی کی آبروریزی کی تھی۔

بوڑھا وھانگ اس لڑکے سے ہی ناراض نہیں تھا بلکہ اس کی کمپنی سے بھی خوش نہیں تھا۔ وہ لڑکا جب ڈینگیں مارتا کہ اس کی کمپنی نے برآمدات سے دس ہزار ڈالر کمائے ہیں تو وھانگ طنز کرتا کہ اس کمپنی کا قرض اس کمائی سے دوگنا ہوگا۔ وہ بوڑھا خود اخبار بھی نہیں خریدتا تھا بلکہ میرا اخبار اٹھا کر لے جاتا تھا اور پھر میرے اوپر اپنی معلومات کا رعب جھاڑتا تھا۔ اسے کمپنیوں کے قرضوں کے بارے میں معلومات زیادہ تھیں، ان کی برآمدات سے ہونے والی آمدنی کا وہ بالکل ذکر نہیں کرتا تھا۔ مثبت خبروں کے بجائے منفی خبریں اسے زیادہ یاد رہتی تھیں۔ اسے صرف مان ویوک میں ہی خرابیاں نظر نہیں آتی تھیں۔ بلکہ کمزور اور سنکی ہو جانے کے بعد وہ ہر چیز کا تاریک پہلو ہی دیکھنے لگا تھا۔

مان ویوک جب پوری طرح خود کفیل ہو گیا تو گھر سے نکل گیا۔ اس کے جانے سے بوڑھے وھانگ پر کیا اثر ہوا؟ یہ تو کوئی نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ پہلے ہی وہ بہت افسردہ رہتا تھا۔ اب اس سے زیادہ اور کیا افسردہ ہو سکتا تھا۔ دو مہینے پہلے مان ویوک گھر واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی جس کے پیٹ میں بچہ تھا اور وہ پورے دنوں سے تھی۔ بوڑھا وھانگ ان کا خیر مقدم بھی نہیں کر سکتا تھا اور انہیں گھر سے نکال بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے صرف اتنا پوچھا کہ ان دونوں نے واقعی

شادی کی ہے یا نہیں؟

''آپ کے بغیر میں شادی کیسے کر سکتا تھا۔ حالانکہ آپ مجھے نافرمان لڑکا سمجھتے ہیں۔ اگر آپ نے مجھے بالکل ہی ناکارہ سمجھ لیا تو سچ مچ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ مجھے بہت ہی افسوس ہوگا۔

بوڑھا وھانگ ابھی تک وہ صدمہ ہی نہیں بھولا تھا جب اس کی بیٹی اچانک گھر آئی تھی اور اس کے ناجائز بچہ پیدا ہوا تھا۔ اب اس نے سوچا کہ جتنی جلدی ہو سکے مان ویوک اور اس لڑکی کی شادی کرا دی جائے۔ اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ وہ لڑکی کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نے اس لڑکی کے ماضی یا اس کی عمر کے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا۔ اس نے بسوں کے اڈے کے قریب ایک سستا سا شادی ہال کرائے پر لیا اور لڑکی کے لیے دلہن کا معمولی سا لباس لا کر دے دیا۔

مان ویوک دھوم دھام سے وسط شہر کے کسی اچھے ہوٹل میں شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی شادی میں دولہا دلہن دونوں کی طرف سے بہت سے لوگ شریک ہوں۔ لیکن سوائے چند ہمسایوں کے اس تقریب میں اور کوئی شریک نہیں ہوا۔ اور شادی ہال خالی ہی پڑا رہا۔ دلہن نے خاصہ کھلا کھلا لباس پہنا تھا پھر بھی وہ اس کے پھولے ہوئے پیٹ پر تنگ تھا اور سیفٹی پن لگا کر اسے بند کیا گیا تھا۔ وہ عجیب سی لگ رہی تھی، اس کا زیر جامہ نظر آ رہا تھا اور پھولا ہوا پیٹ کپڑے پھاڑے دے رہا تھا۔ وہ شادی مذاق بن گئی تھی لیکن مان ویوک بہت خوش تھا اور سب سے کہتا پھر رہا تھا کہ یہ تقریب تو ابتدا ہے شادی کی اصل تقریب تو بعد میں ہوگی۔

''اس بیوقوف انسان کو دیکھو۔ اگر آپ اپنا منہ کھولیں تو اس کا کوئی جواز بھی ہونا چاہیے۔ اگر آپ کے پاس کچھ نہ ہو تو بہتر ہے اپنا منہ بند ہی رکھیں۔ اگر آپ کے پاس بے شمار دولت ہو تو بالکل ہی منہ بند رکھنا چاہیے۔ مگر لڑکے تیرے پاس دونوں چیزیں ہیں، بڑا منہ بھی ہے اور بے شمار دولت بھی ہے۔ تمہیں احساس ہی نہیں ہے کہ تم نے بدنامی مول لی ہے۔ چچ چچ۔۔ میرا تو خاندان ہی تباہ ہو رہا ہے۔''

جس طرح وہ باتیں کر رہا تھا اسی سے میں نے اندازہ لگایا کہ بوڑھے وہانگ نے اس لڑکے کو بے عزت کرنے کے لیے یہ تقریب سجائی ہے۔ بہر حال وہ عجیب و غریب تقریب تھی۔ مہمان بھی بیٹھے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ جیسے ہی میں نے دلہن کا ایسے پھولا ہوا پیٹ دیکھا جیسے اس پر

MashalBooks.com

بندھی ہوئی ڈوری ابھی ٹوٹ پڑے گی' تو ایک دم میرے اندر یہ خواہش جاگی کہ اس کا بچہ میں اپنے ہاتھوں سے پیدا کروں۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ گھر واپس آنے کے بعد بھی میں اس خواہش سے اپنا پیچھا نہ چھڑا سکی۔ میرے دل میں ایک پیاس سی تھی کہ ایک بار پھر ماں کے پیٹ سے باہر آتے ہوئے بچے کا شفاف چہرہ اور باہر کی دنیا کو دیکھتی ہوئی کھلی آنکھیں دیکھوں۔

میں قریب قریب تیس سال سے ایک خاص انداز کی پریکٹس کر رہی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ اگر میں بوڑھے وھانگ سے یہ معمولی سی رعایت مانگوں تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ یہ کام میں مفت کرنے کو بھی تیار تھی۔ آخر میں اتنے عرصے اس کی کرایہ دار رہی تھی۔ اور اگر وہ اصرار کرتا تو میں اسے اپنی فیس میں آدھی سے زیادہ رعایت دے دیتی۔ لیکن بوڑھے وھانگ نے صاف انکار کر دیا۔

''میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ یہ فضول بات نہ کرو'' اس نے نہایت بدتمیزی سے جواب دیا۔'' تم سمجھتی ہو میں اپنا پوتا ایک قصائی کے ہاتھ میں دے دوں گا۔ اور وہ بھی انسانوں کی قصائی۔ یہ کہنے کے بعد اس نے ایسا برا سا منہ بنایا کہ مجھے لگا جیسے وہ میرے زخموں پر نمک چھڑک رہا ہے۔

اس علاقے میں کام کرتے ہوئے مجھے ایک ایسے دلال سے بھی واسطہ پڑا تھا جو ان طوائفوں کو میرے پاس لاتا تھا جنہیں جنسی بیماریاں ہوتی تھیں۔ وہ مجھے مادام کہنے کے بجائے میرے کاندھے پر ہاتھ مارتا اور ''او'' اور ''تو'' کہہ کر مجھے مخاطب کرتا' ایسے جیسے میں اس کی ساتھی ہوں۔ اس سے مجھے کوئی شکایت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ ہم دونوں ہی ان عورتوں سے اپنی روزی کماتے تھے جو اپنا جسم بیچتی تھیں۔ اس وقت میں اپنے آپ کو ڈاکٹر نہیں سمجھتی تھی اور خاموشی سے اپنی بے عزتی برداشت کر جاتی تھی۔ لیکن بوڑھے وھانگ نے جب مجھے ''انسانی قصائی'' کہا تو میرے دل پر چھری سی چل گئی۔

شادی کے تین دن بعد مان ویوک کی بیوی کے بیٹا پیدا ہوا۔ یہ بیٹا یونیورسٹی ہسپتال کے زچہ و بچہ وارڈ میں ہوا تھا۔ اپنی بے عزتی کے باوجود میں وہ بچہ دیکھنے گئی۔ اس وقت تک وہ گھر آ چکے تھے۔ وہ بچہ بالکل اس بچے سے ملتا تھا جو بچہ میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ کس نے وہ بچہ پیدا کیا مگر مجھے اس ڈاکٹر سے شدید جلن ہونے لگی تھی۔ اس کے

ساتھ ہی میرے دل میں کسی کا بچہ پیدا کرنے کی خواہش اور بھی تیز ہو گئی۔ بوڑھے وھانگ کی بدتمیزی کے باوجود میرے اندر یہ خواہش بڑھتی جا رہی تھی۔ مان ویوک کا بچہ پہلا اور آخری نہیں ہے۔ اور بھی بچے پیدا ہو رہے ہیں۔ میں اپنے ہاتھوں میں کسی کا بھی گوشت کے لوتھڑے جیسا بچہ سنبھال سکتی ہوں۔

اس کے بعد گنتی شروع ہو گئی۔ میری ریٹائرمنٹ میں ساٹھ دن رہ گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ان ساٹھ دنوں میں مجھے کوئی ایسی عورت ضرور مل جائے گی جسے نواں مہینہ ہو۔ مگر افسوس وہ دن یونہی گذرتے رہے۔ ساٹھ' پچاس' دس اور نو۔ اور پھر تین دن ہی باقی رہ گئے۔

جب تین دن باقی رہ گئے تھے تو اس دن میں نے تین عورتوں کے ڈی اینڈ سی کیے اور ایک مرد کی جنسی بیماری کا علاج کیا بس' اتنا ہی ہوا پھر میں نیچے اتری۔ کیونگ سونگ اسٹور اب زرعی آلات نہیں فروخت ہوتے تھے' بلکہ اب وہاں کھانے پینے کی چیزیں فروخت ہونے لگی تھیں۔ لیکن اس کا پرانا سائن بورڈ اب بھی اس طرح لگا ہوا تھا۔ البتہ اس پر لکھے ہوئے چینی حروف کی جگہ اب کوریائی حروف آ گئے تھے۔ کیونکہ حکومت نے چینی حروف لکھنے پر پابندی لگا دی تھی۔ ان حروف میں مجھے مان ویوک کا مشورہ بھی نظر آیا۔ اسے دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔

''مجھے وہی کی لسی چاہیے۔''

بوڑھا وھانگ اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ اٹھا اور ریفریجریٹر سے بوتل نکال کر مجھے دی۔ مجھے دہی کچھ زیادہ پسند نہیں مگر پھر بھی میں اسے غٹا غٹ چڑھا گئی۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ کسی طرح میں اس کے گھر کے اندر داخل ہو سکوں۔ بوڑھے وھانگ کی گردن پر پھڑکتی ہوئی رگ نظر آ رہی تھی۔ اس کی مونچھیں برف کی طرح سفید ہو چکی تھیں۔ جھگڑے کے باوجود مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ اسے محبت اور نفرت کا ملا جلا جذبہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ آخر ہم نے تیس سال ایک دوسرے کے قریب رہ کر گذارے تھے۔ بوڑھا وھانگ جس کی نظریں اخبار پر گڑی ہوئی تھیں' ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا۔'' دنیا ختم ہو رہی ہے۔ خاتمہ قریب ہے۔'' اس کے نزدیک ہر دن دنیا کا آخری دن تھا۔ وہ مان ویوک کو بدمعاش سمجھتا تھا۔ مگر اپنی بیٹی کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ اسے اپنے ارد گرد ترقی کے بجائے تباہی ہی نظر آتی تھی۔

بہرحال بوڑھا وھانگ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ دوسرے پڑوسیوں کے مقابلے میں

MashalBooks.com

اس سے بات کرنا زیادہ مشکل تھا۔شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ چیزوں کی اصلیت کو زیادہ سمجھتا تھا۔ اور انسانوں کو بھی زیادہ جانتا تھا۔ اب جہاں تک میرا تعلق ہے' میں عورتوں کے اندرونی حصوں کے بارے میں تو جانتی تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ انسانوں کے بارے میں بھی جانتی ہوں۔ اس لیے مجھے اس سے ہمدردی سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ کہتے ہیں نا کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔اس پر بھی کئی مصیبتیں آئی تھیں۔

''بچہ ٹھیک ہے؟''۔ میں نے ایسے پوچھا جیسے میں اس کے گھر کے اندر جا رہی ہوں۔اور یہ کہہ کر میں اندر کی طرف چل بھی دی۔

ماں ویوک کی بیوی بات بات پر ہنستی تھی۔ وہ بچے کے بارے میں باتیں کر رہی تھی تو ہنس رہی تھی' وہ اپنے شوہر کی برائیاں کر رہی تھی تو ہنس رہی تھی۔اور جب وہ اپنے سسر کی شکایت کر رہی تھی تو اس وقت بھی وہ ہنس رہی تھی۔شاید یہی وجہ تھی کہ بچہ بھی کھل کھلا کر ہنستا تھا۔اس نے پوری آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا تو اس کا منہ بھی پورا کھل گیا۔ میں تو وہ بچہ دیکھنے اس لیے گئی تھی کہ اسے دیکھ کر کسی کا بچہ پیدا کرنے کی میری خواہش ختم ہو جائے گی۔مگر وہاں اس کا الٹا اثر ہوا۔ میری خواہش اور بھی بڑھ گئی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اپنا خواب پورا کیے بغیر ہی اپنے پیشے سے فارغ ہو گئی تو مرتے دم تک اس پریشانی سے نجات حاصل نہیں کر سکوں گی۔لیکن اب تو تین دن ہی رہ گئے تھے۔صرف تین دن۔

2۔ دو دن پہلے

وہ بہت ہی ڈراؤنا خواب تھا۔ میں نے دیکھا کہ میری انگلیوں کے گٹے سرطان بن گئے ہیں اور تیزی کے ساتھ میرے جسم میں پھیل رہے ہیں۔ پھر مجھے لگا کہ گرمیوں کے دن ہیں اور دو مینڈکوں کے ٹرّانے کی آوازیں آ رہی ہیں اور میں بے چینی کے ساتھ اس خواب سے جاگنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

جب میں ایک مغربی مرد کی بیگانہ خوشبو، اس کے بالوں بھرے سینے اور اس کے رسی کی طرح لمبے اور مضبوط ہاتھوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی تب بھی مجھے اسی طرح مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ آدمی ہر جانب سے میرے اوپر حملے کر رہا تھا اور میں اپنے اوپر سے اس کا بوجھ اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میری اذیت سے

بے نیا زوہ مینڈک نہایت سکون کے ساتھ ٹرا رہے تھے۔ اور مجھے لگ رہا تھا جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں کہ کوئی مرد میری آبروریزی کر رہا ہے۔اس وقت سونے اور جاگنے کے درمیان کی کیفیت تھی میری۔

لیکن اس وقت کے مقابلے میں کہ جب واقعی میری آبروریزی کی گئی تھی آج میں آہستہ آہستہ خواب سے بیدار ہوئی تو سنا کہ سچ مچ مینڈک ٹرا رہے ہیں۔اب خواب اور حقیقت الگ الگ ہو گئے تھے۔اپنے آپ کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ یہ خواب تھا میں نے اپنی انگلیوں کی گانٹھوں پر ہاتھ پھیرا' پھر اپنے شب خوابی کے لباس کے اندر اپنے سینے' پیٹ اور رانوں پر ہاتھ پھیرا۔ایک گول مٹول سی عورت جو پچپن سال کی ہو چکی ہو اور جس نے کوئی بچہ بھی پیدا نہ کیا ہو' اس کی ڈھیلی ڈھیلی جلد ریشم کے لچھے کی طرح ہی نرم اور لجلجی ہو سکتی ہے۔ مجھے کہیں بھی گومڑے محسوس نہیں ہوئے۔ یقیناً یہ خواب ہی ہوگا میں نے اپنے پیشے سے ہاتھ دھو لیے تو یہ منحوس گٹے بھی ختم ہو جائیں گے۔ یہ سوچنے کے باوجود میری پریشانی دور نہیں ہوئی۔ یہ گٹے جو خواب میں سرطان بن کر میرے پورے جسم پر پھیل گئے تھے صرف میرے ہاتھوں پر ہی نہیں تھے بلکہ وہ میرے دل پر بھی موجود تھے۔ یہ ہولناک خیال آتے ہی میرا دل اور بھی بوجھل ہو گیا۔اور میں نے اپنی عادت کے مطابق اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ مینڈکوں کی دور سے آنے والی آوازیں اور بھی تیز ہو گئیں۔ سارا کمرہ ان آوازوں سے بھر گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان آوازوں کے ساتھ مائیکروفون لگا دیا گیا ہو۔اس کے ساتھ ہی نئے تعمیر کیے ہوئے چرچ سے عیسائیوں کے عبادت کرنے کی آواز بھی آنے لگی۔ یہ لوگ ہر روز اسی طرح رو رو کر دعائیں مانگتے تھے۔ جب بھی میں ان کی آوازیں سنتی میرا جی چاہتا کہ میں بھی ان کے ساتھ زور زور سے رونا شروع کر دوں۔مگر افسوس میری آنکھ سے ایک بھی آنسو نہیں نکلتا تھا۔اس دن ابھی سورج پوری طرح نہیں نکلا تھا آسمان پر ابھی اندھیرا ہی چھایا ہوا تھا۔

صرف دو دن رہ گئے تھے۔صرف دو دن ... میری نیند اڑ گئی تھی۔ میرے دماغ میں جو پہلی بات آئی وہ یہ تھی کہ یہاں سے جانے میں صرف دو دن رہ گئے ہیں۔اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ زندہ بچہ پیدا کرانے کا عرصہ کم ہو کر صرف دو دن کا رہ گیا تھا۔میرا رہائشی کمرہ اور وہ کمرہ جس میں میں عورتوں کو دیکھتی اور ان کا آپریشن کرتی اس کھڑکی کے سامنے تھے جہاں وہ مخملی

MashalBooks.com

کرسی پڑی تھی۔ مجھے اپنے رہائشی کمرے یا آپریشن کے کمرے سے اس غریب علاقے کے گھروں کی الٹی سیدھی ترچھی چھتیں نظر آتی تھیں۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی آنکھوں اور کانوں والا انسان اس بات سے انکار نہیں کرسکتا تھا کہ سیول ''زبردست ترقی کررہا ہے۔'' اب یہ اچھی بات تھی یا بری بات یہ علاقہ جہاں میرے مریض آتے جاتے رہے' ایسا ہی رہا جیسے وہ میرے یہاں آنے سے پہلے دن تھا۔

اس علاقے کے مکان نہ تو کوریا کی اپنی طرز کے تھے اور نہ مغربی طرز کے' وہ تو اس زمانے میں الٹے سیدھے بنا لیے گئے تھے جب یہاں ابھی جاپان کا قبضہ تھا اور عمارتی سامان ملتا ہی نہیں تھا۔ یہ مکان ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے' بدشکل اور خستہ حال تھے۔ انہیں خریدنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ اس سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ سڑک کے سامنے جہاں دو منزلہ اور تین منزلہ عمارتیں تھیں' جس میں کیونگ سونگ اسٹور بھی تھا' ایک بہت چوڑا نالہ تھا۔ پچھلے دنوں اسے کچھ بہتر بنایا گیا تھا۔ لیکن اس علاقے کی حالت روز بروز خراب ہی ہوتی جارہی تھی۔ بلکہ وہ علاقہ گندا جوہڑ ہی بنتا جارہا تھا۔ گرمیوں میں اس نالے میں سیلاب آجاتا۔ وہاں بہت چھوٹے چھوٹے مکان تھے۔ کوئی مکان گرانے یا اس کی مرمت کرانے کے لیے اجازت لینا بہت ہی مشکل کام تھا۔ اس لیے وہاں رہنے والوں کی جب مالی حالت بہتر ہوتی تو وہ یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جاتے تھے۔ اگر کوئی چاہتا تو کئی مکان خرید کر ان کی جگہ ایک مکان بنا سکتا تھا' لیکن کون ایسا بیوقوف تھا کہ اس گندے علاقے میں خوبصورت مکان بناتا۔ دنیا بھر سے ترقی کی خوش خبریاں آرہی تھیں لیکن ان کی بازگشت اس علاقے میں نہیں سنی جاتی تھی۔ پھر بھی افواہیں نہ سننے سے بہتر ہے کہ کوئی افواہ ہی سن لی جائے۔

بہرحال یہاں کے لوگ اپنے اپنے حال میں مگن تھے۔ مان ویوک کی فضول خرچیاں اور اپنی آمدنی سے زیادہ اپنی کمپنی کی درآمدات اور برآمدات کی شیخیاں مارنا اس کا ایک نمونہ تھا۔ علاقے کے لوگ اس حال میں بھی پرسکون زندگی گذارتے تھے جیسے کوئی ناچنے والا ڈھول کی تھاپ سن کر ہی مٹکنا شروع کردے۔ ظاہر ہے گھریلو عورتوں کا زیر جامہ اور ان کے اندرونی اعضا طوائفوں سے زیادہ صاف ستھرے ہونا چاہئیں اسی حساب سے کہا جاسکتا ہے کہ عام لوگ بھی اچھی زندگی گذار رہے تھے۔

میں جانتی ہوں کہ کسی پاکیزہ عورت کے اندرونی اعضا کا کسی طوائف کے اعضا سے موازنہ کرنا بہت ہی بری بات ہے لیکن میں تو ظاہری چیزی دیکھ کر ہی یہ بات کررہی ہوں۔ سمجھا تو یہی جاتا ہے کہ پاکیزہ عورتوں کے مقابلے میں طوائفوں کے اندرونی اعضا گندے اور غلیظ ہوتے ہیں مگر میرا مشاہدہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ بعض طوائفوں کے اندرونی اعضا کسی احمق کے چہرے کی طرح صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ عورت جتنا یہ سمجھتی ہے کہ اس کے اعضا صاف ہیں اتنا ہی وہ اپنی گندگی سے بےخبر ہوتی ہے۔ جیسے آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا لونگ روم سارے گھر میں سب سے زیادہ صاف ستھرا ہے۔

ادھر وہاں سے طوائفیں غائب ہوئیں اور ادھر ایک چھوٹے سے علاقے میں سات چرچ بن گئے۔ ٹاؤن ہال ہر وقت ان لوگوں سے بھرا رہتا تھا جو اپنے کام کے سلسلے میں وہاں آتے تھے اور کام کرانے کے لیے انتظار کرنا پڑتا تھا۔ میں جب وہاں آئی تھی تو اس علاقے میں کوئی چرچ نہیں تھا۔ لیکن پھر جہاں بھی مناسب جگہ ملی وہاں چرچ کی عمارت بن گئی۔ پھر ہر سال ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ کسی علاقے میں چرچ سے ہی اندازہ لگایا جاتا ہے کہ وہاں کاروباری سرگرمیاں تیز ہیں۔ حالانکہ ساتوں چرچ عیسائی مذہب کے ہی تھے لیکن وہ سب الگ الگ مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ماننے والے ایک چرچ سے دوسرے چرچ کی طرف جاتے رہتے ہیں لیکن کسی چرچ میں عقیدت مندوں کی تعداد کم نہیں ہوتی تھی۔

ایک چرچ جو بالکل نیا بنا تھا اور جس کے مسلک کے بارے میں مجھے معلوم نہیں تھا ایسے عبادت گذاروں سے بھرا رہتا تھا جو زور زور سے بلبلا کر مناجاتیں پڑھتے اور دعائیں مانگتے تھے۔ وہ عبادت کے بعد زور زور سے تالیاں بجاتے اور مناجاتیں گاتے۔ ان کی عبادت کا یہی اندازہ ہوگا۔ اس چرچ کے غیر عیسائی ہمسائے شاید اسے پسند نہ کرتے ہوں لیکن رفتہ رفتہ اس کے عبادت گذاروں کی تعداد میں جو اضافہ ہورہا تھا اس سے تو اس چرچ کی طاقت کا ہی اندازہ ہوتا تھا۔

آدھی سے زیادہ عبادت گذار عورتیں تھیں۔ ان میں سے کچھ میری گاہک بھی تھیں۔ یہ رو رو کر کیا عبادت کرتی ہیں؟ ہر صبح یہ مناجاتیں کیوں پڑھی جاتی ہیں؟۔ جب وہ اپنے پیٹ میں ناجائز بچے لے کر میرے پاس آتیں تو میں ان کے چہروں پر اذیت اور کرب کے نشان دیکھتی۔ میں جانتی تھی کہ ان میں سے اکثر چاہتی تھیں کہ وہ مرجائیں۔ البتہ جب انہیں معلوم ہوتا کہ

MashalBooks.com

اندرونی صفائی کرانے میں کوئی خطرہ نہیں ہے تو وہ فوراً خوش ہو جاتیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک معجزہ ہی تھا کہ میں ان کا پیٹ ایسا صاف کر دیتی تھی کہ ان کی حرکتوں کا نشان تک باقی نہیں رہتا تھا۔ ان کی تکلیف کا اندازہ وہی لگا سکتا تھا جس کے دل میں نفرت کی آگ بھری ہو۔ مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا اس لیے میں انہیں اس کرب سے نجات دلانے اور ان کو ان بیڑیوں سے آزاد کرانے کی کوشش کرتی تھی۔

بہرحال ہر صبح عورتیں بری طرح روتی تھیں اور میری نیند اڑ جاتی تھی۔ کیا کوئی ایسا گناہ ہے جو انہیں اس طرح رونے پر مجبور کرتا ہے؟ میں جو کام کرتی تھی وہ اور نہیں کر سکتا تھا۔ میں چمٹی سے پکڑ کر نازائیدہ بچہ عورت کو دکھا دیتی تھی۔ پھر بھی روز بروز چرچ بڑھتے جا رہے تھے۔ ایک دن میں نے اپنی مستقل گاہک سے' جو گھریلو عورت تھی' پوچھا کہ وہ ایک چرچ سے دوسرے چرچ میں کیوں جاتی ہے؟ میرا مقصد اسے پریشان کرنا نہیں تھا۔ بلکہ میں جاننا چاہتی تھی کہ ایک مسلک دوسرے مسلک سے مختلف کیسے ہے؟ اس نے بتایا کہ وہ اپنے پہلے چرچ میں جوڑوں کے درد کی وجہ سے جاتی تھی کیونکہ وہ چرچ اس مرض کی شفا لیے مشہور ہے۔ اور آج کل وہ جس چرچ میں جاتی ہے وہ خوش قسمتی اور خوش حالی پیدا کرنے کی شہرت رکھتا ہے۔ نئے چرچ میں اس نے اس لیے جانا شروع کیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے کاروبار میں ترقی چاہتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو وہ چرچ ان عورتوں کو کیا دیتا ہے جو بلبلا بلبلا کر روتی ہیں؟

اے خداوندا' یہ عورتیں اگر سینکڑوں بار کہیں کہ وہ تیرے اوپر ایمان رکھتی ہیں تو ان کی بات نہ ماننا۔ وہ صرف زبان سے ہی ایسا کہتی ہیں' میں جانتی ہوں ان کا جسم کچھ اور ہی چاہتا ہے اور وہ مردوں کے ساتھ کیا کر رہی ہیں۔ صبح ہی صبح ان عورتوں کے رونے سے میرے دل میں یہ خیال آیا اور میرے دل میں پتھر کی طرح بیٹھ گیا۔

اس کے ساتھ آہستہ آہستہ اندھیرے کی چادر اٹھتی گئی تو سامنے افق پر کلیساؤں کے مینار دکھائی دینا شروع ہوئے۔ ابھی ہر گھر ملگجی روشنی میں ڈوبا ہوا تھا اور سارا منظر سمندر پر چھائی ہوئی دھند کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس دھند میں کلیساؤں کے مینار ڈوبتے ہوئے جہاز کے مستول معلوم ہو رہے تھے۔ عبادت گذاروں کی آہ وزاری یوں لگ رہی تھی جیسے اپنی جان بچانے کی کوشش میں تمام مسافر باہر کی طرف بھاگ رہے ہوں اور اس کے لیے ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں۔

اب کوئی اوپر چڑھ پائے گا یا نہیں۔ نتیجہ ایک ہی ہوگا' جہاز بہرحال ڈوبے گا۔

تھوڑی سی اور روشنی ہوئی تو سامنے کی چھتیں اور بھی نظر آنے لگیں۔ اور اب مجھے مستول کے اوپر چڑھا ہوا ایک آدمی دکھائی دینے لگا۔ مگر افسوس وہ آدمی نہیں تھا بلکہ وہ صلیب تھی۔ اس کے ساتھ ہی ڈوبتے ہوئے جہاز کا واہمہ غائب ہو گیا اور اصل حقیقت سامنے آ گئی۔

صرف دو دن رہ گئے تھے۔ ان آخری دو دن میں پو پھٹنے کا عمل تیز ہونا ہی تھا۔

اس آخری دو دن میں جو مریض عورت میرے پاس آئی وہ دھایونگ نامی طوائف تھی جو جنسی بیماری کا علاج کرانے آئی تھی۔ حالانکہ قحبہ خانے کا مالک اب اس علاقے میں نہیں رہتا تھا اور اپنی طوائفوں کو علاج کے لیے میرے پاس نہیں بھیجتا تھا۔

اس قحبہ خانے کی مالک میڈم جون اپنی ایک لڑکی کے ساتھ خود آئی تھیں۔ میڈم جونگ بھی بہت بوڑھی ہو گئی ہیں۔ بوڑھے دھانگ کے مقابلے میں میڈم جونگ کا بڑھاپا ان کے پورے جسم پر بہت واضح نظر آنے لگا تھا۔ انہیں دیکھ کر مجھے ان پر ترس بھی آیا تھا اور بے چینی بھی ہوئی تھی کیونکہ میرے ساتھ یہی گذر رہی تھی۔ لیکن میرے الفاظ میرے اصل جذبات کی عکاسی نہیں کر رہے تھے۔

''اوہو' آپ خود کیسے تشریف لے آئیں؟ آپ کو تو اور لڑکیوں کی ضرورت ہوگی۔ یہ دھایونگ تو آپ کے لیے امریکی ڈالر کمانے کا بڑا ذریعہ ہوگی۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ اس وقت میں اس لڑکی کا معائنہ کر رہی تھی۔ اور یہ بات میں نے ویٹنگ روم کی طرف جھانک کر کہی تھی۔

''جی نہیں۔ آپ سمجھتی ہیں کہ میں یہاں یہ دیکھنے آئی ہوں کہ اس کتیا کے اندرونی اعضا کو کیا ہوا ہے؟۔'' میں تو یہاں اس لیے آئی ہوں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ صرف کل تک ہی علاج کریں گی۔''

''آپ کو اس کا افسوس ہے؟''

''جی ہاں' مجھے افسوس ہے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں آپ کی طرح میرا دل بھی پتھر کا ہے۔ مجھے آپ پر ترس بھی آ رہا ہے اور رشک بھی ہو رہا ہے۔ میں اپنا منحوس پیشہ کب چھوڑوں گی اور کب آرام کی زندگی گذاروں گی۔''

یہ کہہ کر میڈم جون نے ٹھنڈی سانس لی اور سگریٹ پینے لگیں۔ ان کی موٹی موٹی انگلیوں

MashalBooks.com

کے ناخنوں پر سرخ پالش میلا اور گندا لگ رہا تھا۔ ان پر ترس کھانے کو جی چاہتا تھا۔

''آپ رو کیوں رہی ہیں؟ آپ نے اتنی دولت جو اکٹھی کی ہے اس کا کیا ہوا؟'' میں نے تڑ سے جواب دیا اور کھٹاک سے ویٹنگ روم کا دروازہ بند کر دیا۔ جب سے امریکی فوجیوں نے زراعتی کالج پر قبضہ کیا تھا اسی وقت سے میڈم جون میری گاہک تھیں۔ پہلے وہ خود طوائف تھیں اور اب قحبہ خانہ چلاتی تھیں۔ اس عرصے میں انہوں نے کئی بار میری خدمات حاصل کی تھیں۔ وہ میری مستقل گاہک تھیں اور فاصلے کے باوجود وہ اپنی لڑکیاں میرے پاس بھیجتی رہتی تھیں۔ اتنی پرانی گاہک ہونے کے باوجود وہ مجھے تو یا تم کہنے کے بجائے احترم کے ساتھ میڈم کہتی تھیں۔ البتہ ان کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے بھی اپنا ساتھی ہی سمجھتی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ ہم دونوں کا کام تو مختلف ہے مگر کمائی کا ذریعہ ایک ہی ہے۔

دھایونگ کا معائنہ مکمل ہو گیا تو پہلا سوال اس نے یہ کیا کہ وہ اپنا کام کب شروع کر سکتی ہے؟

''کل بھی شروع کر سکتی ہو۔ لیکن اگر آرام کرنا چاہو تو چند دن آرام بھی کر سکتی ہو۔''

''نہیں، مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس ہے۔ پہلے ہی میں میڈم کی ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اتنے دن آرام کرنے دیا۔''

''اچھا؟ تو پھر ٹھیک ہے، کل سے کام شروع کر کے تم اپنا فرض پورا کر لوگی'' میں نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

''مادام، ہماری میڈم جیسی اور کوئی میڈم نہیں ہو سکتی۔'' دھایونگ نے اپنی خوبصورت ٹانگوں اور کولہوں پر پتلون چڑھاتے ہوئے کہا۔

دھایونگ نے اپنے چہرے پر خوب میک اپ تھوپا ہوا تھا لیکن میک اپ کے بغیر وہ عام سی شکل کی تھی۔ اس نے میز پر لیٹتے ہوئے جس نفاست کے ساتھ اپنا زیر جامہ اتار کر اپنی ٹانگیں میرے سامنے پھیلائی تھیں میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی تھی کہ وہ اپنا کام خوب جانتی ہے ا۔ ور میں نے مان لیا تھا کہ وہ خوبصورت لڑکی ہے۔

اب ہم تینوں، میڈم جون، دھایونگ اور میں ویٹنگ روم میں بیٹھ گئے۔ اس وقت وہاں پر گھریلو سا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے سامنے کی سڑک چوڑی کی جا رہی ہے۔ اس کے بعد اس

علاقے کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔'' میڈم جون نے کہا۔

''آپ نے صحیح کہا۔ اگر آپ کا مکان آج بھی یہاں ہوتا تو آپ بہت دولت مند عورت بن جاتیں۔'' میں نے کہا۔

''اب ماضی کی کیا باتیں کرنا۔ ایک بار تو نہیں، میں تو کئی بار موقع سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہی ہوں۔ میں تو کئی بار دولت مند ہوتے ہوتے رہ گئی ہوں، میڈم جون بولیں۔''

''ہاں، ماما کو اس بار بھی زبردست نقصان ہوا ہے۔'' دھایونگ بیچ میں بولی۔

''اس بار بھی انہوں نے لالچ کیا ہوگا؟'' میں نے کہا۔

''مادام، آپ نے کبھی مجھے اپنے کام سے غافل دیکھا ہے۔ اچھی ہو یا بری میں نے خلوص کے ساتھ اپنا کاروبار چلایا ہے۔ خیر، حادثے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ اس کام سے توبہ ہی کر لوں۔ مگر میرا کوئی سہارا بھی تو نہیں ہے۔'' میڈم جون نے کہا۔

آپ اتنی مایوس کیوں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ ایک لڑکی جسے میں نے بھاری رقم خرچ کر کے خریدا تھا بھاگ گئی اور اپنے پیچھے بہت بڑا قرض بھی چھوڑ گئی ہے۔''

''مجھے یقین ہے آپ اسے تلاش کر لیں گی۔ وہ ہاتھ جوڑتی ہوئی آپ کے پاس آئے گی۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔

''اگر میں چاہتی تو اسے تلاش کر سکتی تھی۔ اگر کوئی زبردستی لے جاتا تو میں ضرور اس کا پیچھا کرتی۔ مگر وہ تو ایسے آدمی کے ساتھ گئی ہے۔ جس کے بغیر وہ رہ نہیں سکتی۔ مجھے یہ معلوم ہوا تو میرا دل پسیج گیا اور اب میں اس کے لیے دعائیں کرتی ہوں۔''

''میڈم آپ تو جنت میں جائیں گی۔'' میں نے کہا

''مجھے محبت کرنے والے لوگ اچھے لگتے ہیں'' میڈم جون نے کہا۔

''دھایونگ، تم بھی کسی سے محبت کر لو۔ اپنے آپ سے ہمدردی میں ہی سہی'' میں نے کہا۔

میں ہمیشہ لوگوں کے ساتھ ایک فاصلہ رکھتی تھی لیکن اس وقت مجھے ایک گھریلو سا ماحول لگ رہا تھا۔

''ہاں مادام، جن لوگوں کے گھر گرائے جائیں گے وہی نقصان میں رہیں گے۔ اگر کیونگ

MashalBooks.com

سونگ اسٹور کھڑا رہا تو آپ کا کلنک دس سال اور چل سکتا ہے۔''

''نہیں' میں بروقت یہ کلنک بند کر رہی ہوں۔ میں نے آخری تاریخ مقرر کر دی ہے۔ اب اگر کوئی مجھے مار بھی ڈالے تب بھی میں ایک دن بھی زیادہ یہاں نہیں رہوں گی۔'' میں نے کہا۔

''آپ کو معلوم ہے بوڑھا دھانگ کہاں جا رہا ہے؟۔ وہ بڑا کنجوس ہے۔ مجھے یقین ہے اس نے کسی جگہ دولت چھپائی ہوگی۔''

''اس علاقے میں اس کی دکان کا رقبہ سب سے بڑا ہے اس لیے اسے معاوضہ بھی کافی ملے گا۔ کسی نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے پہلے ہی بہت اچھا سا دو منزلہ مکان خرید لیا ہے۔ اس میں اس کے اسٹور کے لیے بھی جگہ ہے۔ وہ کہتا ہے اپنا سارا سامان اٹھا کر وہاں لے جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''آپ کے ریٹائر ہونے کا سوچ کر مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں اپنے ایک ہاتھ سے محروم ہو جاؤں گی۔ مجھے اپنے نئے گھر کا پتہ بتا دیجیے گا۔ کیا میں آپ کے نئے گھر آ سکتی ہوں؟ نئے گھر کی خوش حالی کے لیے میں دیا سلائی کی ڈبیہ لاؤں گی۔'' میڈم جون نے کہا۔

''میرا اپنا گھر ایک صاف ستھرے محلے میں ہے۔ آپ وہاں کیوں آنا چاہتی ہیں؟'' میں نے جواب دیا اور اپنے گھر کا پتہ بتا دیا۔

''مجھے اس علاقے میں جانا بہت پسند ہے جہاں لوگ مجھ سے خوش نہ ہوتے ہوں۔ یہ میری فطرت ہے۔'' وہ میرے گھر آنے پر مصر تھی۔

''اس نے میرے گھر کے پتے کا کاغذ سنبھالا اور کھڑی ہو گئی۔'' اچھا پھر ملاقات ہوگی۔''

صرف دو دن رہ گئے تھے۔

میری مریض عورتیں زیادہ تر جنسی بیماریوں میں مبتلا ہوتی تھیں یا ان کے پیٹ میں وہ بچہ ہوتا تھا جسے وہ گرانا چاہتی تھیں۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی میں نے خود ہی یہ راستہ چنا تھا۔ اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اپنی اس شہرت سے نجات پانا بہت مشکل تھا۔

صرف دو دن رہ گئے تھے۔ لیکن میری یہ خواہش میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی کہ ریٹائر ہونے سے پہلے اپنے ہاتھوں سے ایک بچہ پیدا کرا دوں۔

مگر ہوا یہ کہ اس دن جن عورتوں کے بچے میں نے گرائے ان کے وہ بچے تین مہینے کے تھے اور ان کی شکل وصورت خاصی بن چکی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ تینوں عورتیں اس دن میرا مذاق

اڑانے آئی تھیں۔ تین مہینے کے بچے اکثر گرانے کے عمل میں زخمی ہو جاتے ہیں لیکن اس دن بالکل ایسا نہیں ہوا۔ شاید کوئی حاملہ عورت یہ نہیں جانتی کہ اس کے پیٹ میں تین مہینے کا جو بچہ ہے وہ ہے تو انگلی کے پورے کے برابر' مگر اس کے انسانی خط وخال واضح ہوتے ہیں۔ البتہ اس کے تمام حصوں میں مکمل انسان والا تناسب اور توازن نہیں ہوتا' کیونکہ سر زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ وہ سر بھی لوبیے کے دانے کے برابر ہی ہوتا ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ اس میں آنکھیں نمایاں ہوتی ہیں۔ ان آنکھوں پر اس وقت پپوٹے نہیں بنے ہوتے اس لیے وہ پوری کھلی ہوتی ہیں' جیسے پپوٹوں کے پیچھے وہ رکھ دی گئی ہوں۔

وہ آنکھیں جنہیں میں نے پیدا ہونے سے پہلے ہی مار دیا' وہ آنکھیں جو باہر کی دنیا کبھی نہیں دیکھیں گی' میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک مجھے جھرجھری آ گئی' جیسے وہ آنکھیں ایک خاص زاویے سے میری پوری زندگی میں داخل ہو گئی ہوں، میرے ماضی میں' میرے مستقبل میں۔ میری ساری زندگی ان آنکھوں میں جھلک رہی تھی۔ میرے ہاتھ خون سے بھرے ہوئے تھے۔ اور اب میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ بوڑھے دھانگ نے اپنی بیٹی کے بیٹے کا بچہ اس دنیا میں لانے کے لیے میری مدد لینے سے کیوں انکار کر دیا تھا۔

وہ آنکھیں میری زندگی کے ماضی اور مستقبل کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ میرے جذبات کا اتار چڑھاؤ بھی دیکھ رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہی ہوں۔ ایک کامیاب عورت کا مذاق' ایک ایسی قابل رحم بیوقوف عورت کا مذاق جس نے ایک مرد کی محبت ٹھکرائی' جس نے گرمیوں کی ایک رات کو گھاس پر کی جانے والی اپنی شرمناک آبروریزی کی ایک بار بھی وجہ تلاش نہیں کی۔ جس وقت اس کی آبروریزی کی جا رہی تھی اس وقت دور سے توپیں چلنے کی آوازیں آ رہی تھی اور قریب ہی مینڈک ٹرا رہے تھے۔ اس کے باوجود یا اس کی وجہ سے اس عورت نے خوش حال زندگی گذاری۔

ان آنکھوں نے مجھے خیالی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ پھر وہ مرجھاتی چلی گئیں اور مسلمہ منافع کو نقصان میں بدل دیا۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ وہ آنکھیں میری پیشہ ورانہ حیثیت پر ہنس بھی رہی تھیں۔ میں صرف ایک میڈیکل ڈاکٹر کی حیثیت سے ہی ناکام نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ ایک معالج' ایک مسیحا کی حیثیت سے بھی ناکام ہو گئی تھی' کیونکہ میرے علاج کا مقصد مریض کی تکلیف

MashalBooks.com

دور کرنا نہیں ہوتا تھا بلکہ مقصد یہ ہوتا تھا کہ میں اپنی مکروہ اندرونی لذت کے لیے ایک بے جان شے سمجھ کر ان کا علاج کر رہی ہوں۔

میں جب بھی کسی کا بچہ گراتی تھی تو میرے اندر انتقام کا جذبہ جاگ اٹھتا تھا۔ گھورتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں میری اس اندرونی لذت پر گڑی ہوتی تھیں جو انتقامی جذبے کے ساتھ میں محسوس کر رہی ہوتی تھی۔ آنکھوں کے بدلے آنکھ' دانت کے بدلے دانت وہ اذیت جو میں نے اپنی نوجوانی میں برداشت کرنے پر مجبور کر دی گئی تھی۔

مخملی کرسی اب بھی جنوبی کھڑکی کے ساتھ اس صاف ستھرے کشادہ کمرے میں رکھی ہوئی تھی' جسے میں ویٹنگ روم اور مریضوں کے معائنے کے کمرے کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ ہر روز وہ کرسی میری آنکھوں میں چبھتی تھی۔ آج بھی وہ دیکھنے میں بہت ہی گھناؤنی نظر آتی ہے۔ اگر ہتھیلی سے اسے صاف کیا جائے تو اڑا ہوا اس کا بھورا رنگ تھوڑے سے ہرے پن کے ساتھ ابھر آتا ہے۔ تیس سال میں وہ ہرا رنگ بھی کچھ سے کچھ بن چکا ہے۔ یہ کرسی جب چمک دار ہری تھی اس وقت بھی وہ میرے دوسرے فرنیچر کے ساتھ میل نہیں کھاتی تھی اور آج جب وہ بھوری ہو گئی ہے تب بھی وہ الگ تھلگ ہی نظر آتی ہے۔ سوائے اس وقت کے جب میرے باپ اس پر بیٹھے تھے۔

اس کرسی پر بیٹھے ہوئے میرے باپ نے کیا کہا تھا؟۔ ''پرانے زمانوں سے طب کے فن کو مسیحائی فن کہا جاتا ہے۔ یہ اصول دماغ میں رکھو اور خلوص نیت کے ساتھ اپنا کام کرو۔'' جب بھی ان کی یہ بات یاد آتی ہے تو مجھے ہنسی آ جاتی ہے۔ اس وقت بھی میری ہنسی نکل پڑی تھی جب میرے باپ نے یہ کہا تھا۔ اس وقت میں تیاری کر رہی تھی کہ اپنے پیشے سے زیادہ سے زیادہ دولت کماؤں گی۔ کبھی کبھی ایسا ہوا کہ میں نے تصور میں اپنے خوش شکل باپ کو اس کرسی پر بیٹھے دیکھا' لیکن ان کے کہنے کے مطابق میں کام کرنے پر میں اپنے آپ کو کبھی آمادہ نہ کر سکی۔ میں اپنی مرضی کے مطابق زندگی گذارتی رہی۔ البتہ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ مخملی کرسی میری روح پر اپنی گرفت مضبوط کر رہی ہے۔ اس روح پر نہیں جس میں نفرت ہی نفرت بھری ہوئی ہے بلکہ دوسری روح پر۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے وہ کرسی جنوبی کھڑکی کے ساتھ پڑی رہنے دی تھی۔ وہ کرسی جو کسی کام کی نہیں تھی' جو دوسرے فرنیچر کے ساتھ بالکل میل نہیں کھاتی تھی۔ میں اسے پھینک نہیں سکتی تھی

اور نہ اسے نظر انداز کر سکتی تھی۔ میں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا کہ اپنے ساتھ یہاں سے کوئی بھی فرنیچر نہیں لے جاؤں گی لیکن میں اپنے دماغ میں نئے گھر کا جو بھی نقشہ بناتی تھی اس میں بھی جنوبی کھڑکی کے ساتھ یہ کرسی رکھی ہوئی نظر آتی تھی۔

دو دن رہ گئے ہیں۔

اب صرف ایک دن میں میرے لیے کسی کا بچہ پیدا کرانا ممکن نہیں تھا۔ خزاں کے سورج کو میری خواہش سے کوئی غرض نہیں تھی۔ شام کے جھٹ پٹے نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹ کاٹنے اور ایک کمرے سے دوسرے کمرے کے چکر نکالنے لگی۔ میں نے معائنہ کی میز پر ایک چیز رکھی دیکھی اور ٹھٹھک گئی۔ وہاں لوبیے کے دانے کے برابر تین ادھورے بچے رکھے نظر آئے۔ یہ کچے بچے پنسلین کی خالی بوتل میں پڑے ہوئے تھے۔ میں یکدم غصے میں اپنی نرس مس چوئی پر ایسے چیخی جیسے میرا ہاتھ جل گیا ہو۔

''یہ کیا ہے مس چوئی؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ یہاں کیوں رکھے ہیں؟'' میں نے لرزتی آواز میں کہا۔ میری آواز میں خوف تھا جیسے کوئی بچہ مدد کے لئے آواز نکالتا ہے۔

''یہ میں نے نہیں کیا ہے مادام' یہ آپ نے ہی کیا ہے ...'' مس چوئی نے احتجاج کیا اور آنکھیں پھاڑ کر مجھے ایسے دیکھا جیسے اسے میری دماغی حالت پر شک ہونے لگا ہو۔

مس چوئی میرے ساتھ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی، اور نہ مذاق کر سکتی تھی۔ یہ میں نے ہی کیا ہو گا۔ مگر میں نے کیوں کیا؟ میں تو ایسا نہیں کر سکتی۔ میں مانتی ہوں کہ ماں کے پیٹ سے ابتدائی مہینوں کا نامکمل بچہ صحیح سلامت نکالنا اور اسے اس طرح محفوظ کرنا ایک اسرار ہی تھا۔ میں نے پہلی بار ایسے نامکمل بچے نہیں دیکھے تھے۔ مگر میں نے یہ کام کیسے کیا؟ میں نے پہلی بار اپنے کالج میں شیشے کے مرتبانوں میں مہینے کے حساب سے ایسے کچے بچے رکھے دیکھے تھے۔ پہلی بار میں نے وہ دیکھے تھے تو مجھے متلی آنے لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے مرتبانوں میں انسانوں کا اچار ڈالا گیا ہو۔ اس وقت تو ایسا ہوا تھا اور اب میں نے خود وہی کام کیا' سوچے سمجھے بغیر ہی انسان کا اچار ڈال دیا۔

''میں انہیں پھینک دوں مادام؟'' مس چوئی نے وہ مرتبان اٹھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں' نہیں' انہیں پھینکو نہیں۔'' میں چلائی اور مرتبان اس سے چھین لیا۔ میں اسے پھینکنا نہیں چاہتی تھی۔ میرا ارادہ اسے رکھنے کا نہیں تھا۔ میں صرف یہ چاہتی تھی کہ جب تک شعوری

MashalBooks.com

طور پر وہ میرے دماغ میں ہے اس وقت تک وہ یہاں رکھا رہے۔ اب تک میں ایسے نامکمل بچے پھینک دیا کرتی تھی۔ مجھے وہ بہت ہی بھیانک نظر آتے تھے اور میں ان کے بارے میں سوچتی بھی نہیں تھی۔ تو پھر میں نے آج یہ مکروہ کام کیوں کیا تھا؟ میں نے وہ مرتبان میز پر رکھوا دیا اور مس چوئی سے کہا کہ میں وہاں سے چلی جاؤں تو اسے پھینک دینا۔

میں جب اس بارے میں سوچ رہی تھی تو مجھے اپنے اوپر شک ہونے لگا۔ اگر میرے سامنے کوئی بے معنی بات ہو جائے' یا کوئی غلط سلط حرکت کرے تو میں اتنی زیادہ پریشان کیوں ہو جاتی ہوں؟ جب سے میں نے وہ بیہودہ اور فضول شادی کی تقریب دیکھی ہے مجھے اس خواہش نے اپنی گرفت میں جکڑ لیا ہے کہ میں کسی کا زندہ سلامت بچہ پیدا کروں' مکمل بچہ۔ اس وقت سے میں اپنے آپ کو اپنی ذات سے الگ تھلگ محسوس کرنے لگی ہوں' جیسے میں کوئی اور ہوں جسے میں خود بھی نہیں سمجھ سکتی۔ میں اپنے آپ کو سمجھاتی ہوں کہ اپنے اوپر نکتہ چینی نہ کرو' جیسی ہو ویسی ہی رہو مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں میں پارے کی طرح بکھر نہ جاؤں۔ پارے کو جتنا ہاتھ لگاتے ہیں اتنا ہی وہ پھیلتا چلا جاتا ہے۔

''مادام' اگر میں ڈریس شاپ والی آنٹی اور ہارڈ ویئر اسٹور والی آنٹی سے بات کروں اور یہ انہیں دے دوں تو ٹھیک ہے؟'' مس چوئی نے میرے چہرے کے تاثرات پڑھتے ہوئے پوچھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ایسی چیز تھی جیسے مچھلی کے بھنے ہوئے انڈے جن پر ابھی مصنوعی رنگ نہ کیا گیا ہو۔ وہ پلاسٹک کی پلیٹ میں رکھے ہوئے تھے۔

''یہ کیا ہے؟''

''آپ تو آج عجیب باتیں کر رہی ہیں۔ یہ وہی بچے کا نال اور زچہ کی آنول ہے جو آپ نے کاٹی تھی۔''

میں نے اس کے چہرے پر شک کا سایہ پھر دیکھا۔ میں اپنا شک وشبہ تو برداشت کر سکتی ہوں مگر کسی اور کا شک برداشت نہیں کر سکتی۔

''ہاں ٹھیک ہے ان عورتوں نے یہ مانگا تھا۔ مگر تم نے پہلے ان سے بات کیوں نہیں کی۔'' میں نے اپنا موڈ بدلتے ہوئے کہا۔ اس سے مس چوئی بھی خوش ہو گی۔ عورتوں میں یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ جوانی اور حسن برقرار رکھنے کے لیے بچہ پیدا کرنے والی عورت کی آنول بہترین غذا ہے۔

ایک میڈیکل ڈاکٹر کی حیثیت سے میں اسے بالکل نہیں مانتی مگر شک کا فائدہ دیتے ہوئے میں انہیں یہ دے دیتی تھی کہ اگر ان عورتوں کو اس پر اتنا ہی بھروسہ ہے تو ہو سکتا ہے نفسیاتی طور پر انہیں فائدہ بھی ہو جائے اور ان کی خوبصورتی اور جوانی برقرار رہے۔

وہ عورتیں جو میری مستقل گاہک تھیں اور میرے سامنے ٹانگیں پھیلاتی تھیں خود مجھ سے کبھی یہ آنول نہیں مانگتی تھیں۔ یہ بات وہ مس چوئی سے کہتی تھیں۔ میں تو ان عورتوں سے کہتی تھی کہ وہ یہ آنول مس چوئی کے کمرے میں لے جائیں۔ مجھے فکر یہ تھی کہ کہیں اس کی خرید وفروخت نہ شروع ہو جائے۔ میں اسے روکنا چاہتی تھی۔

جو عورتیں مس چوئی سے آنول مانگتی تھیں وہ میرے ساتھ بھی اچھے تعلقات رکھتی تھیں۔ اس وجہ سے وہ بلا تکلف آنول کھانے آ جاتی تھیں۔ جن عورتوں کو آنول کھاتے ہوئے متلی آتی تھی وہ اپنے ساتھ ''سوجو'' (کوریا کی شراب) لاتی تھیں۔ اور پھر ایسے منرے لے لے کے کھاتی تھیں جیسے کچی مچھلی کھا رہی ہوں۔ جو عورتیں اتنی بے شرم ہو جاتی تھیں کہ جنسی دواؤں کے نام پر کچھ بھی کھانے کو تیار ہو جاتی تھیں وہ شراب پی کر گندے گندے قصے بھی سنانے لگتی تھیں۔ میں ان عورتوں کو دیکھتی تھی تو ایک بے رحمانہ تلذذ سا میرے اندر جاگ اٹھتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں دنیا کی بدصورتی کی انتہا دیکھ رہی ہوں۔ خاص طور سے اس وقت جب وہ معائنے کی میز پر میرے سامنے ننگی لیٹی ہوتی تھیں۔ اور اپنے اندرونی اعضا ایسے دکھا رہی ہوتی تھیں جیسے وہ ان کا چہرہ ہو۔ چنانچہ میں نے انہیں سزا دینے کا یہ طریقہ نکالا تھا کہ میں انہیں کسی عورت کی آنول کھاتے ہوئے دیکھتی رہتی تھی اور ان کی بدبودار سانسوں کے ساتھ ان کے گندے اور فحش قصے سنتی تھی۔ مسلسل ایسے کام کر کے میں اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی ہولناک یادیں اپنے ذہن سے مٹانا چاہتی تھی۔ میرے ساتھ یہ ظلم اس لیے کیا گیا تھا کہ میں عورت تھی۔ میں اجنبی عورتوں کو اپنے تجربے میں شریک کرنا چاہتی تھی چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن ہوا یہ کہ میں نے جو کچھ بھی کیا اس سے میرا غصہ کم نہیں ہوا۔ میں نے دوسری عورتوں کو جتنا بھی المناک اور بدصورت بنانے کی کوشش کی اس میں آخر میں خود ہی المناک اور بدصورت بنتی چلی گئی۔

وہ عورت جو ہارڈ ویئر اسٹور چلاتی تھی چیختی چلاتی میرے پاس آئی۔ وہ نشے میں لڑکھراتی ہوئی چل رہی تھی جیسے اس نے ''سوجو'' کے دو گلاس چڑھا رکھے ہوں۔ اس کی آنکھوں کے گرد آڑو

MashalBooks.com

کے پھولوں کی طرح لال لال حلقے پڑے ہوئے تھے۔ وہ جھومتی ہوئی ویٹنگ روم میں آئی اور مخملی کرسی پر گر گئی۔ نہایت حقارت کے ساتھ میں نے اسے صوفے پر دھکیلا۔ ڈریس اسٹور کی عورت بھی اندر آئی اور وہ بھی ہارڈ ویئر اسٹور کی عورت کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس کی پریشانی دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھے الوداع کہنے آئی ہے۔

''آپ پرسوں جا رہی ہیں نا؟'' ڈریس اسٹور والی نے' جو خاصی سمجھ دار تھی اور شراب زیادہ نہیں پیتی تھی' اپنا منہ کھولا۔

''مادام' کیا آپ سچ مچ ریٹائر ہو رہی ہیں؟ اب ہم کیا کریں گے۔''

''میں جانتی ہوں کہ آپ ریٹائر ہونے کا سوچ رہی ہیں مگر دیکھ لینا ایسا نہیں ہوگا۔ آپ نے جو اتنا پڑھا ہے اور آپ کا جو اتنا تجربہ ہے اسے آپ کیسے چھوڑ سکتی ہیں۔ آپ چھٹی کر کے تفریح کے لیے کہیں چلی جائیں اور پھر واپس آ جائیں۔''

''اس وقت تک ہم اپنی نئی عمارت بھی تعمیر کر لیں گے۔ ہم آپ کو اس سے اچھی جگہ دیں گے۔ ہم آپ کو آرام کرنے کا موقع بھی دیں گے۔ اگر آپ نے ہماری بات نہ مانی تو ہم زبردستی آپ کو یہاں لے آئیں گے۔''

پچھلے دنوں جو رہائشی اور کاروباری علاقے تقسیم کیے گئے تھے اس کی وجہ سے سڑک کے کنارے ایک نیا کاروباری علاقہ بنایا گیا تھا۔ ڈریس اسٹور اور ہارڈ ویئر اسٹور اب اس علاقے میں منتقل ہو جائیں گے۔ ان دکانوں کے مالک بہت خوش تھے کہ انہیں اچھا بازار مل جائے گا۔ رہائشی علاقے کے لیے اتنی جگہ تو نہیں تھی لیکن چونکہ وہ بھی علاقے ہی کا حصہ تھے اس لیے ان کے لیے بھی فائدہ ہی تھا۔

''اگر آپ اپنے گھر میں بھی علاج جاری رکھیں گی تو ہم وہاں بھی آ جایا کریں گے۔ کسی نئی ڈاکٹر کو دکھانے میں بھی ہمیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔ لیکن اپنی پرانی ڈاکٹروں کے پاس جانا ہی ہمیں اچھا لگتا ہے۔''

''ہاں ہاں' تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ کسی مرد کے سامنے اپنی ٹانگیں پھیلانے میں ہمیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی مگر کسی مرد ڈاکٹر کے سامنے اپنا دودھ بہانا بالکل اچھا نہیں لگے گا۔ مادام' بچہ روکنے کے لیے میں کیا کروں؟''۔

''مردوں کے پاس نہ جاؤ۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ میں جوان تھی تو عورتوں کو حمل سے بچنے کا مشورہ دیا کرتی تھی۔ میں انہیں چارٹ بھی دیا کرتی تھی اور بتاتی تھی کہ کن تاریخوں میں مرد کے پاس جانے سے حمل ٹھہر سکتا ہے۔ لیکن وہ عورتیں میرا دیا ہوا سبق بھول جاتی تھیں۔ وہ کسی کام پر توجہ مبذول کرنے سے گھبراتی تھیں۔ پھر وہ خوش ہونے کا مسئلہ بھی تھا۔ اس لیے میرے پاس ایک ہی مشورہ ہوتا تھا اور وہ میں انہیں سنا دیتی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کے ہر سوال کا ایک ہی جواب ہوگا۔ پھر بھی وہ بولے چلی جاتی تھیں۔ میں انہیں جواب دے دیتی تھی تو مجھے تسلی ہو جاتی تھی جیسے میں نے ان پر تھوک دیا ہو۔

''ہمیں وہ کھا کر مزہ آتا ہے مادام'' ہارڈ ویئر اسٹور والی بولی۔

''شکریہ مس چوئی۔'' دوسری عورت نے کہا۔

میں نے ان عورتوں کے وہاں سے جانے کی آواز سنی وہ ایسے جا رہی تھیں جیسے کسی خوشی کی تقریب میں خوب پیٹ بھر کر کھانا کھا کر جا رہی ہوں۔

میں اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی اور باہر دیکھنے لگی جہاں ایک ایک کر کے روشنیاں جلائی جا رہی تھیں۔ بوڑھے وانگ کا صحن میرے سامنے ایسا کھلا ہوا تھا جیسے میری ہتھیلی۔ صحن میں روشنی تھی۔ اور میں نے دیکھا کہ گھریلو سامان لپیٹا جا رہا ہے۔ میں نے وہانگ کی بیٹی کو دیکھا وہ کل مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ شاید وہ باپ کی مدد کرنے آئی ہوگی۔ وہ مان ویوک کا بچہ گود میں لیے کھڑی تھی۔ وہ صرف سامان اکٹھا ہوتے دیکھ رہی تھی' خود کوئی کام نہیں کر رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ اپنا گال بچے کے گال سے رگڑتی اور بچے سے کچھ کہتی۔ بچہ شاید ہنس رہا تھا کیونکہ وہ بغیر آواز میں بھی کچھ کہتی تھی جیسے کسی اور کو بھی بچے کی طرف متوجہ کرنا چاہتی ہو۔ اگرچہ وہ لوگوں کے سامنے بچے کی پھوپھی تھی لیکن اصل میں تو وہ اس کی دادی تھی۔ اس منظر نے میرے اوپر جادو سا کر دیا تھا۔ میں اس کی ایک ایک حرکت غور سے دیکھ رہی تھی اور مجھے اپنے خالی پن کا احساس ہو رہا تھا جیسے میرے جسم کا بیرونی خول ہی باقی رہ گیا ہو۔

چونکہ بوڑھے وہانگ کی بیٹی کے راز سے میں خوب واقف تھی اس لیے سمجھتی تھی کہ وہ میرے قابو میں رہے گی۔ لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ اس نے بہت پہلے اپنے آپ کو میری گرفت سے آزاد کر لیا تھا اور اب وہ ایسے مقام پر تھی جو میرے خیال اور میری دسترس سے باہر

MashalBooks.com

تھا۔اب وہ نہیں بلکہ میں ڈراؤنے خواب کی اسیر تھی۔

دو دن رہ گئے ہیں اور مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں تیزی سے ڈوبتی جا رہی ہوں' وقت گذرنے کی رفتار بہت تیز ہوگئی ہے۔اس حالت میں میرے اوپر عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ شادی شدہ عورت غیر شادی شدہ عورت سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے' چاہے اس نے صرف دو بچے پالنے کی خواہش میں کتنی ہی بار اور بچے گرائے ہوں۔وہ عورت جو کئی بچوں کی ماں سے بھی زیادہ خوبصورت ہوتی ہے' وہ ہے طوائف جس کے بے شمار مردوں کے ساتھ تعلقات ہوتے ہیں مگر پھر بھی زندگی میں صرف ایک بار کسی ایک مرد کے ساتھ محبت کرنے کی خواہش میں مری جاتی ہے۔اس طوائف سے بھی زیادہ خوبصورت قحبہ خانے کی مالک بوڑھی عورت ہوتی ہے۔وہ عورت جس نے زندگی میں ہر قسم کے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں وہ عورت جس نے فیصلہ کرلیا ہے کہ کسی ایسی عورت کا پیچھا نہیں کرے گی جو اس مرد کے ساتھ چلی گئی ہو جس سے وہ دل و جان سے محبت کرتی ہے۔میں ان تمام عورتوں کا سوچتی ہوں اور اپنے خیالوں کا ریزہ ریزہ بکھیر کر انہیں الٹے رخ سے دوبارہ سمیٹنے کی کوشش کرتی ہوں۔

رات گہری ہوگئی ہے۔اب میں اس ملگجے اندھیرے میں کلیساؤں کے مینار گننا شروع کرتی ہوں۔ایک دو تین سات۔

یا خدا' اگر اب میں کسی سے محبت کرنے کی خواہش کروں تو کیا ہوگا۔کیا یہ مذاق نہیں ہوگا۔ یا خدا' مجھے اتنا بدصورت نہ کر دینا۔مجھے صرف ایک موقع دیدے کہ میں اپنے ہاتھوں سے زندہ بچہ پیدا کراؤں۔مجھ سے یہ سوال نہ کرنا کہ میں ایسا کیوں چاہتی ہوں۔میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔میرے لیے ''کیوں'' اتنا اہم نہیں ہے۔مجھے تو اپنا کام کرنا ہے۔اے خدا' میری یہ دعا قبول کرلے۔''

یہ سوچ کر مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا اور ہنسی بھی آ رہی تھی کہ زندگی میں پہلی بار میں دعا مانگ رہی ہوں۔

3۔آخری دن

اب میں اپنے نئے گھر کے صحن میں تھی۔میرا گھر چونکہ بہت ہی اچھی جگہ پر تھا اس لیے مجھے اپنے سامنے وہ خوش نما گھر نظر آ رہے تھے جن کے سرسبز لان میں رنگ رنگ کے پھول کھلے

ہوئے تھے۔میرا باغیچہ خالی تھا اور اس میں کنکریٹ بھری ہوئی تھی۔میرے پاس پھولوں کے بیج تھے اور میں نے وہاں سے کنکریٹ ہٹا کر انہیں بونے کے لیے جگہ بنانے کی کوشش بھی کی مگر کنکریٹ میں جگہ ہی نہیں بنی۔میرے پاس اوزار نہیں تھے میں صرف اپنے ہاتھوں سے ہی جگہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔مجھے افسوس ہوا کہ میرے پاس اپنے اوزار نہیں ہیں پھر بھی میں نے سوچا' اچھا ہی ہوا کہ میں اپنے اوزار لے کر نہیں آئی۔میرے اوزار تھے نشتر اور قینچی وغیرہ درانتی اور پھاوڑے نہیں تھے۔

اب میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ جیب سے بیج نکال کر کنکریٹ پر ہی ڈال دوں ۔چند دن بعد یہ بیج اپنی طاقت سے کنکریٹ کے اندر سے زمین میں چلے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کنکریٹ میں سے راستہ بنا کر ننھی ننھی پتیاں باہر نکل آئیں پھر ان پودوں میں پھول بھی آ گئے۔لال' پیلے' گلابی اور نیلے میرا لان پورٹولا کا کے پھولوں سے بھر گیا۔پھر وہ پھول آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔میں نے ان کا رونا اور شور مچانا سنا تو اندازہ ہوا کہ وہ تو بچوں کی طرح لڑ رہے ہیں۔صرف ان کی آوازیں ہی نہیں ان کے چہرے بھی لڑنے والے بچوں کی طرح تھے۔ ہر پھول کے منہ آنکھیں اور ناک بن گئی تھی اور وہ بچے کے چہرے سے ملنے لگے تھے۔ اب میرے لان میں پھولوں کی کیاریاں نہیں تھیں۔بلکہ پورا لان جہنم بن گیا تھا' بے شمار بچوں نے اپنے چہرے زمین سے اوپر نکال لیے تھے اور وہ رو رہے تھے۔خاموش ہو جاؤ۔خاموش ہو جاؤ۔اگر تم نے رونا بند نہ کیا تو میں بلڈوزر منگا کر تمہارے اوپر دوبارہ کنکریٹ ڈال دوں گی' بند کرو یہ رونا دھونا۔

مجھے پھر ڈراؤنا خواب آیا تھا۔میں جاگ گئی تھی مگر رونے کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔تاہم یہ آواز کہیں اور سے آ رہی تھی۔اپنی عادت کے مطابق میں نے کھڑکی کھول دی۔وہ آوازیں جو دور سے آ رہی تھیں اب قریب سے آنے لگیں۔جیسے کسی نے ان کے سامنے مائیکروفون لگا دیا ہو۔

رونے کی آوازیں عیسائی عبادت گذاروں کی تھیں۔ابھی سویرا تھا اور وہ رو رو کر مناجاتیں پڑھ رہے تھے۔اب پھر کلیساؤں کے مینار ڈوبتے ہوئے جہاز کے مستول معلوم ہونے لگے۔ اور عبادت گذاروں کی آوازیں ایسے لگنے لگیں جیسے ڈوبتے ہوئے جہاز کے مسافر مدد کے لیے کسی اور جہاز کو پکار رہے ہوں۔میرے اندر عجیب سی کشمکش جا رہی تھی۔میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی

MashalBooks.com

زور زور سے رونا شروع کر دوں مگر میری آنکھوں سے ایک بھی آنسو نہیں نکل رہا تھا۔

آخر دن

آخری دن کے آخری لمحوں کی گنتی کرتے ہوئے میرے اوپر تشنج کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ دن ختم ہو رہا تھا اور میری خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔ دونوں کے درمیان پھنسی ہوئی میں اپنے آپ کو بے بس پا رہی تھی۔

میں جانتی تھی کہ میری خواہش پوری نہیں ہوگی۔ مگر پھر بھی توقع کر رہی تھی کہ کوئی نہ کوئی معجزہ ضرور ہو جائے گا۔ آخری دن تک ہی معمول کے مطابق کام کرتی رہی تھی۔ لیکن مس چوئی نرس کی یونیفارم پہنے ہوئے بھی صبح سے اپنا سامان سمیٹ رہی تھی۔ سڑک کے آخری سرے پر عمارتیں گرانے کا کام شروع ہو چکا تھا۔ کھڑکی کے باہر خوب دھول اڑ رہی تھی اور فضا گرد آلود تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی گھر کے گرنے کی آوازیں آتی تھیں۔ مجھے کسی چیز نے یہاں باندھ رکھا تھا کہ میں آخری دن کا منحوس چہرہ دیکھ رہی تھی؟

بوڑھے دھانگ' اس کے نواسہ بیٹے مان ویوک' وہ عام گھریلو عورتیں جو جوان اور خوبصورت رہنے کے لیے دوسری عورتوں کی آنول کھاتی تھیں' اور نہیں جانتی تھیں کہ وہ اپنی ہی آنول کھا رہی ہیں طوائفیں جو کچی عمر کی لڑکیوں کی طرح معصوم تھیں' قحبہ خانوں کی مالک عورتیں جنہیں لوگ ''ماما'' کہتے تھے میں نے ان کے ساتھ خفیہ تعلقات رکھ کر ان کے دکھ دور کرنے کی کوشش کی تھی' اب میں ان سب کو چھوڑ کر جا رہی تھی۔ کسی پچھتاوے کے بغیر میں ان سب کو بھول جاؤں گی۔ میں ہمیشہ یہ سمجھتی رہی کہ انہیں کچھ دے رہی ہوں حالانکہ یہ اس کے برعکس تھا۔ اب سوچتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ اصل میں تو میں ان کی احسان مند ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اندر باہر سے خوب جانتے ہیں۔ ہمارے تعلقات ایک خاندان کی طرح بن گئے تھے اس لیے میں ہی انہیں یاد کروں گی۔ وہ مجھے یاد نہیں کریں گے۔ سوائے ان کے میرے لیے اور کون ہے جسے میں یاد کروں گی۔ لیکن جیسے ہی وہ میری نظروں سے دور ہوئیں وہ مجھے بھول جائیں گے۔

''کیا آج بھی کوئی مریض آئے گا؟'' مس چوئی کو جانے کی جلدی تھی میں نے اسے اتنی تنخواہ دے دی تھی کہ دوسری ملازمت ملنے سے پہلے وہ چند دن آرام سے گذار سکتی تھی۔ ہم دونوں

نے طے کیا تھا کہ آنیوالے کل ہم اکٹھے ہی یہاں سے جائیں گے۔ لیکن میں نے سوچا تھا کہ اگر اس نے پہلے جانے کا ارادہ کیا تو میں اسے روکوں گی نہیں۔ پھر بھی میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ پہلے چلی جائے۔

''مس چوئی تم نے کبھی یہ دیکھا ہے کہ کسی دن ہمارے کلنک میں کوئی بھی عورت نہ آئے؟'' میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ بالکل بازاری عورتوں کی طرح۔

اسی لمحے ایک لڑکی کا چہرہ سیڑھیوں کے اوپر نمودار ہوا۔ وہ پندرہ سولہ سال کی نظر آتی تھی۔ وہ آخری سیڑھی پر نہیں آئی بلکہ نیچے سے ہی کلنک کا جائزہ لینے لگی۔ اس کی گھبرائی ہوئی نظریں میری نظروں سے ملیں تو وہ رونے سی لگی۔ وہ ایسی بے حس و حرکت کھڑی تھی جیسے اس نے کوئی جرم کیا ہو۔ وہ ہچکچا رہی تھی کہ اوپر آئے یا نہیں۔ مجھے اس پر رحم آ گیا اور جی چاہا کہ وہ واپس چلی جائے۔ میں جان گئی تھی کہ رد ہانسا چہرہ لیے کوئی نوعمر لڑکی کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس کیوں آئے گی۔ لیکن اپنے آخری دن میں اس قسم کا آپریشن نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن مس چوئی نے جلدی جلدی گاؤن پہن لیا تھا اور اس لڑکی کی مدد کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ لڑکی ابھی تک سیڑھیوں پر ہی کھڑی تھی۔ میں نے اپنی پیشہ ورانہ فطرت کی بنا پر سوچا کہ مس چوئی میرے اوپر بہت بڑا احسان کر رہی ہے کہ اس نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

لڑکی آخری سیڑھی پر آئی تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ غیر متوقع طور پر اس کا پیٹ بہت پھولا ہوا تھا۔ پیٹ چھپانے کے لیے لڑکی نے اپنے کولہے پیچھے کو نکالے ہوئے تھے مگر تجربہ کار آنکھوں کو وہ دھوکہ نہیں دے سکتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے پیٹ میں پورے دنوں کا بچہ ہے۔ اگر وہ لڑکی بچہ پیدا کرانے آئی تھی تو اس کے ساتھ ایک دور شتہ دار بھی ہونا چاہیے تھے لیکن مجھے اور کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ لڑکی جو میرے سامنے کھڑی تھی بری طرح کانپ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شرمندگی سے کانپ رہی ہے یا خوف سے۔ بہر حال میرے لیے یہ ضروری تھا کہ میں اسے تسلی دوں۔

''مجھے معلوم ہے تمہارے پیٹ میں بچہ ہے۔ ڈرو نہیں تم بہت کم عمر معلوم ہوتی ہو۔ لیکن اگر بچہ ٹھہر ہی گیا ہے تو تم اتنی بڑی تو ہو کہ آسانی سے اسے پال پوس سکو۔ اب شروع سے اپنی کہانی سناؤ۔'' میں نے ایک چارٹ اٹھاتے ہوئے نہایت نرمی سے کہا۔ میں بہت منہ پھٹ

MashalBooks.com

اور ترش رو ڈاکٹر مشہور تھی لیکن اس وقت جس لہجے میں بات کر رہی تھی وہ میری بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے خود بھی اپنے اوپر حیرت ہو رہی تھی۔

''نہیں مادام' میرے پیٹ میں بچہ نہیں ہے۔ کون کہتا ہے میں ماں بننے والی ہوں۔'' لڑکی نے زور سے سر ہلایا اور احتجاج کیا۔

''اچھا۔۔؟ میں معافی چاہتی ہوں۔ پھر تم یہاں کیوں آئی ہو؟۔''

''اوں ... صرف دکھانے ...''

''یہ لیڈی ڈاکٹر کا کلنک ہے تم جانتی ہو یہاں کس قسم کا علاج ہوتا ہے؟'' میں اس سے ایسے باتیں کر رہی تھی جیسے وہ بچی ہو مجھے خیال آیا کہ شاید وہ ذہنی طور پر معذور ہے۔

''جی' میں جانتی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ اور پورے اعتماد کے ساتھ مجھے دیکھا۔

چارٹ پر میں نے ابتدائی معلومات درج کیں۔ اس کا نام' پتہ' تاریخ پیدائش وغیرہ اس کے بعد اس کے آنے کی وجہ پوچھی۔

اس نے بتایا کہ اسے تاریخ تو یاد نہیں مگر موسم بہار کے شروع میں اچانک اس کی ماہواری بند ہوئی اور آہستہ آہستہ پیٹ بڑھنے لگا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ دو مہینے سے اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پیٹ میں کوئی چیز حرکت کر رہی ہے۔ وہ کم عمر مگر تیز طرار لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ وہ کیا چاہتی تھی مگر لگتا تھا جیسے وہ میرا مذاق اڑانے آئی ہو۔ اب اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے بلکہ اب وہاں آنسوؤں کا نشان تک نہیں تھا۔ وہ ڈٹ کر بات کر رہی تھی۔

''مجھے تفصیل کے ساتھ تمہارے معائنے کی ضرورت ہوگی۔ مگر تم نے جو بتایا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم ماں بننے والی ہو۔'' میں نے رسان سے کہا۔ غصہ بالکل نہیں دکھایا۔

''میں کسی مرد کے پاس نہیں گئی۔'' لڑکی نے بہت تیز آواز میں احتجاج کیا۔

''میں نے تمہاری عمر کا غلط اندازہ لگایا۔ میں نے کہا میں سمجھ رہی تھی کہ تم بہت کم عمر ہو۔ مگر تمہارے پیدائش کے سرٹیفکیٹ کے مطابق تم بیس سال کی ہو۔ اس عمر میں تمہیں ایسا جھوٹ نہیں بولنا چاہیے جو پکڑا جائے۔ چلو' معائنہ کراؤ۔''

لڑکی نے ہونٹ بھینچے اور غصے سے مجھے دیکھا۔ مس چوٹی تقریباً گھسیٹتی ہوئی اسے معائنے کی میز تک لے گئی۔ میں دستانے پہن کر کمرے میں گئی تو میں نے دیکھا کہ مس چو اور وہ لڑکی بحث

کر رہے ہیں۔ لڑکی معائنہ کے لیے تیار ہونے سے انکار کر رہی تھی۔ میں نے مس چوٹی سے کہا کہ لڑکی کو میز پر چت لٹا دو۔ میں اس کے پیٹ کا معائنہ کر لوں گی۔ میں نے اس کے پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ لگایا تو لڑکی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں اپنی ننگی آنکھوں سے بھی دیکھ سکتی تھی کہ پیٹ میں بچہ بالکل صحت مند ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن بھی صحیح ہے اور پوزیشن بھی ٹھیک ہے۔

''تم حمل سے ہو' بچہ سات آٹھ مہینے کا ہے۔''

''نہیں' یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نے آپ کو بتایا نا' میں کسی مرد کے پاس نہیں گئی۔'' وہ چیخی اور جھٹکے کے ساتھ بیٹھ گئی۔ پھر خود ہی اس نے اپنا زیر جامہ اتارا اور میز پر لیٹ گئی۔

''ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ مہربانی سے آپ پوری طرح معائنہ کیجیے۔''

اس کے رویے میں ایک جلد بازی سی تھی۔ اب مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں اسے پھر بتاؤں کہ وہ پیٹ سے ہے۔

آپ سچ کہہ رہی ہیں۔؟ کہیں مجھے کوئی خطرناک بیماری تو نہیں ہے؟۔'' لڑکی نے کہا اور زیر جامے کے بغیر کھڑی ہو گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے لڑکی کے بجائے مجھ سے تفتیش کی جا رہی ہے۔

''خطرناک بیماری؟ ہرگز نہیں۔ ماں اور بچہ دونوں صحت مند ہیں۔ تم جلد ہی ماں بن جاؤ گی'' میں نے اسے خوش کیا۔

لڑکی ایک دم میرے سینے پر گر گئی۔

''نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں تو مر جاؤں گی۔ میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ مجھے مر جانا چاہیے۔''

وہ کانپ رہی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا تھا۔ اور اس کے کاندھے اور سینہ ایسے لرز رہے تھے جیسے اس پر دورہ پڑ گیا ہو۔ اس کے آنسوؤں سے میرا کالر اور بلاؤز بھیگ گئے تھے۔ اس کے بازو میری گردن سے لپٹے ہوئے تھے۔

''اب میں کیا کروں مادام؟ میں کیا کروں گی؟ مرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے میرے پاس ...''

میں نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اب وہ اور بھی زور زور سے کانپ رہی تھی۔

''بہن میں کیا کروں' مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مرنے کے سوا میں اور کیا کر سکتی ہوں' میری بڑی

MashalBooks.com

بہن، میں ابھی مرجاؤں گی۔ ''

میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ میرے پیٹ میں بچہ ہے تو میں میڈیکل کالج میں اپنی سینئر ڈاکٹر کے پاس گئی تھی اور اسی طرح رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ اپنا وہ زمانہ مجھے یاد آ گیا تھا۔ مگر اس وقت یا اس کے بعد میں نے کبھی مرنے کا نہیں سوچا تھا۔ اس دن بھی مجھے اس آدمی پر طیش آ رہا تھا جس نے اس لڑکی کی یہ حالت بنائی تھی۔ میں بھی لڑکی کی طرح غصے میں کانپنے لگی۔ میرا غصہ اس لڑکی کے ساتھ ہمدردی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ مجھے اپنا ماضی یاد آ گیا تھا۔

''مس چوٹی، ذرا سکون آور دوا تو دو۔''

مس چوٹی گولی لائی اور میں نے وہ لڑکی کو دی کہ وہ کھالے۔ لڑکی گولی کھاتے ہوئے زور زور سے رونے لگی۔

''مس چوٹی ایک گولی اور دو ...''

میں نے بھی ایک گولی کھائی اور لڑکی کو لے کر اپنے دفتر میں چلی گئی۔ معلوم نہیں گولی کا اثر تھا یا پھر میرا غصہ خود بخود ختم ہو گیا تھا۔ لڑکی نے بھی رونا بند کر دیا تھا اور آہستہ آہستہ اپنی کہانی سنانا شروع کر دی تھی۔

اس نے بتایا کہ جب وہ مڈل اسکول میں پڑھتی تھی اور اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتی تھی تو غربت کے باوجود وہ اس کا خاندان بہت خوش تھے۔ پھر اس کی ماں ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی کسی پراسرار بیماری سے مر گئی تو اس کے بہن بھائی چچا، ماموں اور پھوپھی کے پاس چلے گئے۔ وہ لڑکی سب سے بڑی تھی۔ اس نے کہا میں پھوپھی کے پاس رہوں گی۔ حالانکہ وہ پھوپھی تمام رشتے داروں میں سب سے زیادہ غریب تھیں۔ وہ پھوپھی ایک بورڈنگ ہاؤس چلاتی تھیں۔ اس لیے وہ لڑکی بھی وہاں کام کرنے لگی جب وہ بڑی ہوئی تو اس نے سوچا کہ پھوپھی کے بورڈنگ ہاؤس میں کام کرنے کے بجائے کسی اچھے گھر میں گھریلو نوکرانی کا کام تلاش کر لے تاکہ اسے اچھی ماہوار تنخواہ ملا کرے۔ جب وہ یہ نوکری تلاش کر رہی تھی تو یہ ہو گیا۔ اب وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ وہ کسی مرد کے قریب گئی ہے۔ وہ لڑکی اپنی پھوپھی کی بیٹی کے ساتھ کمرے میں رہتی تھی۔ ایک رات جب اس کی پھوپھی کی بیٹی کہیں باہر گئی ہوئی تھی تو سوتے میں کسی نے اسے دبوچ لیا۔ اس

وقت بالکل اندھیرا تھا اور وہ نیند میں تھی اس کے باوجود اس نے پوری طاقت سے مقابلہ کیا۔ لیکن ایک بھاری بوجھ کے نیچے وہ بالکل دب گئی تھی۔ وہ زیادہ دیر مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ حاملہ کیسے ہو گئی۔ اس کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس میں اندھیرے میں زیادتی کی گئی تھی۔ وہ نہیں جانتی کہ وہ آدمی کون تھا۔ کہنے لگی کہ اگر مجھے معلوم بھی ہو جاتا تھا کہ وہ کون آدمی ہے تب بھی میں کیا کر سکتی تھی۔

لیکن میرا خیال ہے کہ اگر اسے معلوم ہو جاتا تو وہ غصے میں اس آدمی کو مار دیتی اور خود بھی مر جاتی۔ کہنے لگی کہ اگر مجھے معلوم بھی ہو جاتا کہ وہ کون ہے تو میں اس کے ساتھ کسی بھی قسم کا رشتہ قائم کرنے کو تیار نہیں تھی۔ جب میں نے کہا کہ ایسا ہو بھی سکتا ہے تو وہ طیش میں آ گئی۔ مگر تھوڑی دیر بعد خود ہی پرسکون ہو گئی۔

''اب میں کیا کروں مادام؟ اب تو مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ اب اسی طرح مجھے زندہ رہنا ہے۔ شرم تو دور کی بات ہے میں تو زندہ ہی نہیں رہنا چاہتی مگر پہلے میں اسے مارنا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد میں مروں گی۔''

لڑکی نے زور سے سر جھٹکا اور گردن سیدھی کی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے مگر وہ لال ہو رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں قاتلانہ چمک تھی۔ میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتی ہوں کہ کسی کو مارنے کا جذبہ جب شدت اختیار کرتا ہے تو عام طور پر وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچانے کا باعث ہی بنتا ہے۔ اپنے زمانے میں اگر میری سینئر ڈاکٹر میرے پیٹ کا بچہ گرانہ دیتی تو میں بھی اسی طرح اپنے آپ سے انتقام لے رہی ہوتی۔ پھر بھی میں بہت شرمندہ تھی۔ اپنے پیٹ کے اندر کی چیز کو مارنے کا بہت دکھ پر تھا کہ میں اپنے آپ کو مار لیتی۔ اسی لیے میں مرجانا چاہتی تھی۔

میں نے طے کیا کہ میں اس لڑکی کو مرنے نہیں دوں گی اس کے ساتھ ہی ہمدردی کا وہی سلوک کروں گی جو میری سینئر نے میرے ساتھ کیا تھا۔ بلکہ میں تو اپنی سینئر سے زیادہ تجربہ کار ہوں۔ البتہ میں قسم کھا سکتی ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی ایسا بچہ نہیں گرایا جو اتنا بڑا ہو کہ دنیا میں آتے ہی رونے لگے یعنی میں نے کبھی پورے دنوں کا بچہ قتل نہیں کیا۔

میں اس سے بھی بے خبر نہیں تھی کہ ہر جگہ یہ کام ہو رہا ہے۔ پھر بھی ایسا کرنے کو میرا دل نہیں مانتا تھا۔ اس سے مجھے کسی نے روکا نہیں تھا، اور نہ میں لوگوں کی رائے سے ڈرتی تھی۔ بس میں نے

MashalBooks.com

اپنے اوپر خود ہی یہ پابندی لگا رکھی تھی۔

میرے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میرے ریٹائر ہونے کے آخری دن مجھے اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ میرا آخری دن تھا اور وہ دن میں اپنے عہد کے مطابق گذارنا چاہتی تھی۔ میرے دل میں آتا تھا کہ اگر میں آخری دن چپکے سے یہ کام کرلوں تو کسی کو کیا تکلیف ہوگی۔ پھر بھی ڈر لگتا تھا کہ اگر ایک بار ایک ایسا بچہ گرایا جو باقاعدہ سانس لیتا ہو اور روتا ہو تو یہ جرم عمر بھر میرا پیچھا کرتا رہے گا۔ اور میں انسانوں کی قصائی بن جاؤں گی۔ بوڑھے وھانگ نے اپنے بیٹے کا بچہ مجھ سے پیدا نہ کرا کے مجھے خاصہ ذلیل کیا تھا پھر بھی میں نے اس کے ساتھ اپنے تعلقات برقرار رکھے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ بوڑھا ایسی ہی باتیں کرتا رہتا ہے میں اس کی فکر کیوں کروں۔ اس کے علاوہ میرے اندر یہ خود اعتمادی بھی تھی کہ میں انسانوں کی قاتل نہیں ہوں۔ اس کے باوجود اس آخری دن جب میں نے یہ کام کرنے کا سوچا تو میرے دماغ میں بوڑھے وھانگ کی بات آ گئی۔ اس نے مجھے انسانوں کی قصائی کہا تھا۔ یہ سوچ کر میرا جسم جیسے سن ہو گیا۔

لیکن وہ لڑکی جس عذاب سے گذر رہی تھی وہ عذاب صرف اس لڑکی کا نہیں تھا اب وہ میرا بھی بن گیا تھا' بلا مبالغہ لڑکی کا درد میرا درد بن گیا تھا' اور مجھے قتل کرنے کے ارادے کے ساتھ اس حقیقت کا احساس بھی تھا۔ اس وقت میرے دماغ میں وہ لڑکی یا اس کے جذبات نہیں تھے۔

یوں بھی مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں اپنی مرضی سے کام کرتی تھی۔ میں نے کبھی کسی کی نہیں سنی۔ میں نے بار بار سوچا کہ اس بچے کو بچانا چاہیے یا اس لڑکی کو؟۔

آخر میں نے فیصلہ کیا کہ لڑکی کی زندگی کے لیے بچہ ضائع کر دیا جائے۔ لڑکی نے میرا فیصلہ سنا تو خوشی سے رونے لگی یہ سوچ کر میری اپنی زندگی کا اتار چڑھاؤ میرے دماغ سے نکل گیا کہ وہ لڑکی شروع سے ہی یہ چاہتی تھی۔ اب میری نفرت کا نشانہ وہ لڑکی نہیں تھی بلکہ وہ بچہ تھا جو پیدا ہونے کے لیے لڑکی کے پیٹ میں نہیں آیا تھا بلکہ اس لڑکی کے لیے ایک آفت بن کر آیا تھا۔

میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنا کام آہستہ آہستہ شروع کیا کیونکہ یہ اس لڑکی کا پہلا بچہ تھا۔ میں نے اس کے اندر ایسی دوائیں داخل کیں کہ وہ سکون سے لیٹی رہی۔ اس کے رحم کے نچلے حصے میں سیال دوا ڈال کر اس کے درد شروع کرانے کی کوشش کی اس کے بعد درد بڑھانے کے

لیے انجکشن بھی لگایا۔ درد شروع ہوئے تو لڑکی نے کراہنا شروع کر دیا۔ میں اسے تسلی دیتی رہی اور انتظار کرتی رہی کہ کب وہ زور زور سے رونا شروع کرتی ہے۔ آخر وہ چیخیں مارنے لگی۔

ان گنت لمحوں کے اندر سے لامتناہی اندھیرا نکل کر کھڑکی پر چھاتا جا رہا تھا۔ اندھیرے میں کھڑکی تاریک آئینہ بن گئی تھی اور پسینے میں بھیگا ہوا میرا چہرہ اور میری شعلہ بار آنکھیں اس میں سے جھانک رہی تھی۔ میرا چہرہ نہایت اذیت میں مبتلا کسی انسان کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ایک ایسا چہرہ جس نے تیس سال دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ کی اذیت برداشت کی ہو۔ اور اب اس کا دماغ بالکل ہی ماؤف ہو گیا ہو۔

لڑکی نے آخری کوشش کرتے ہوئے جب ذبح کیے جانے والے جانور کی طرح آوازیں نکالنا شروع کیں تو میری روح کے اندر زہر بھرا ہوا تھا وہ بھی شعلہ بار ہو گیا۔ اسی لمحے نہایت کامیابی کے ساتھ بچہ پیدا ہو گیا۔ اور بچے کی پیدائش کے بعد کے تمام مرحلے بھی مکمل ہو گئے۔ خون اور آلائش کی بو سے کمرہ بھر گیا۔ اور مکمل امن وسکون ہو گیا جیسے اس سے پہلے جو بھی تھا وہ ایک خواب تھا مس چوٹی جو لڑکی کے ساتھ ہی اذیت برداشت کرتی رہی تھی' ایسی لڑکھڑاتی ہوئی وہاں سے ہٹی جیسے وہ نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ میرا جسم ایسا تھکا ہوا تھا جیسے ابھی بکھر جائے گا۔ لیکن خالی پن کے احساس نے میرا ذہن صاف کر دیا تھا اور میں پوری طرح جاگ گئی تھی۔

میں نے کئی مرتبہ اپنی گھڑی دیکھی' میں نہیں کہہ سکتی تھی کہ آج کونسا دن ہے میں تازہ ہوا کے لیے زچہ بچہ کے کمرے سے باہر آ گئی۔ میں خون کی بو سے دور جانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ بو میرے ساتھ باہر آ گئی تھی۔ میں جدھر بھی جاتی وہ میرے ساتھ ہی جاتی۔ مجھے پہلی بار آزادی کا احساس ہو رہا تھا مگر خون کی بو سے مجھے جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ میں نے ٹہلنا شروع کر دیا۔

کہیں سے ایک ہلکی سی آواز آ رہی تھی۔ میں سمجھی وہ کھڑکی کے باہر سے آ رہی ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوریا کے پرانے روایتی دروازے کے بھاری کواڑ کھولے اور بند کیے جا رہے ہوں۔ اور ان میں سے چرچر کی آواز آ رہی ہو۔ میں جانتی تھی کہ ہر آواز کہیں قریب سے ہی آ رہی ہے حالانکہ لگ یہ رہا تھا جیسے کہیں دور سے آ رہی ہے۔ ڈرتے ڈرتے میں نے ویٹنگ روم کا دروازہ کھولا اور روشنی کا سوئچ آن کر دیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سب سے پہلے میری نظر کرسی پر پڑی۔ وہ آواز کرسی سے آ رہی تھی۔ کرسی پر وقت سے پہلے پیدا ہو جانے والا

MashalBooks.com

بچہ پڑا تھا اور اس آواز کے ساتھ موت اور زندگی کی کشمکش جاری تھی۔

''مس چوٹی' مس چوٹی تم نے اسے یہاں کیوں رکھ دیا؟'' میں نے چیخ کر مس چوٹی کو آواز دی۔ وہ گاؤن کا بٹن بند کرتے ہوئے باہر آئی اور عجیب عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

''مادام' آج آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ آپ نے خود ہی تو کہا تھا۔ آپ نے کہا تھا ماں کا خیال تم رکھو اور بچے کو میں دیکھ لوں گی۔''

میں نے کہا تھا؟ کیا واقعی میں نے کہا تھا؟ اس خیال سے کہ وقت سے پہلے پیدا ہونے والا بچہ آخر مر رہی جائے گا اس کی نال نہیں کاٹی جاتی ہے۔ میں نے تو یہ بھی سنا تھا کہ بعض ڈاکٹر ایسے بچے کو اوندھا لٹا دیتے ہیں اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے پانی میں ڈبوتے ہیں۔ میں یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ وقت سے پہلے پیدا ہونے والے بچے کی قسمت یہی ہوتی ہے کہ اسے اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ لیکن اس لڑکی کا بچہ زندہ تھا۔ سوچے سمجھے بغیر میں نے اس بچے کی پورے دنوں والے بچے کی طرح دیکھ بھال کی تھی۔ ایک صحت مند بچے کی طرح۔ اس کی نال سنبھال کر کاٹی تھی۔ اور اس کے پوتڑا بھی باندھ دیا تھا۔

اب میں اپنے جذبات نہیں چھپا سکتی تھی۔ میں بچہ پیدا کرنا چاہتی تھی۔ ایسا بچہ جس کی میں پرورش کروں اور اس سے پیار کروں۔ اپنے ہاتھ سے کسی کا بچہ پیدا کرنے کی خواہش دراصل اپنا بچہ پیدا کرنے کی تمنا کا ہی پرتو تھا۔ میرے روئیں روئیں میں یہ خواہش زندگی بن کر دھڑک رہی تھی۔

میں نے بچے کو گود میں اٹھایا اور پاگلوں کی طرح سیڑھیوں کی طرف بھاگی' ٹھوکر مار کر دروازہ کھولا اور دوڑتی چلی گئی۔ میرے پیچھے مس چوٹی لرزتی ہوئی آواز میں کچھ کہہ رہی تھی۔ شہر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور سب لوگ سو رہے تھے۔ کوئی بڑا ہسپتال بڑا ہسپتال جہاں انکیو بیٹر ہو۔ میں بچے کو بازوؤں میں بھرے ہوئے تیر کی طرح دوڑی۔ وہ ہسپتال جہاں انکیو بیٹر بھی ہو بہت دور تھا۔

راستے میں ایک چوکیدار نے مجھے پکڑ لیا۔ میرے چاروں طرف سے سیٹیوں کی آوازیں آ رہی تھی۔ میں نے اپنے بازوؤں میں لیٹی چیز انہیں دکھائی۔ بچہ بچہ اسے بچانا ہے۔ میں رو رہی تھی۔ پاگل کتیا' اسے جانے دو سیٹیوں کی آواز ریزہ ریزہ ہوگئی اور دور چلی گئی۔ میرے سامنے کھلی

سڑک تھی۔ مگر انکیو بیٹر والا ہسپتال ابھی دور تھا۔ ہسپتال میں ہی اس بچے کے زندہ رہ جانے کی امید تھی۔ میرے شعور میں بھی وہ امید دور جاتے جگنو کی طرح مدھم ہوتی جا رہی تھی۔

ہسپتال ابھی بہت دور تھا۔ لیکن میں اپنے خیالوں میں اپنے آپ کو انچارج ڈاکٹر کے قدموں میں ڈال رہی تھی کہ اس بچے کی جان بچا لو۔ ڈاکٹر صاحب' خدا کے لیے اسے بچا لو۔ میرا یہی ایک بچہ ہے۔ میں نے یہ ابھی پیدا کیا ہے۔ یہ وقت سے پہلے ہو گیا ہے۔ مجھے اس کی سزا مل رہی ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ بچہ پیدا ہو۔ لیکن اب میں بدل گئی ہوں۔ ڈاکٹر میرا اعتبار نہیں کرے گا۔ میری عمر بہت زیادہ ہے میں بوڑھی عورت ہوں۔ کوئی نہیں مانے گا کہ میں بچہ بھی پیدا کر سکتی ہوں۔ چلو' میں ڈاکٹر سے کہہ دوں گی کہ یہ میرا نواسا ہے۔ ڈاکٹر سے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہمارے خاندان میں یہ واحد بچہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب' خدا کے لیے اس بچے کو بچا لیجیے۔ ہماری پانچ پشتوں میں یہ واحد بیٹا ہے۔ میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور میری آواز رندھ گئی تھی۔

مگر آخر کار جب میں ہسپتال پہنچی اور وہ بچہ ڈاکٹر کے ہاتھوں میں دیا تو میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔

بچہ پہلے ہی مر چکا تھا۔ مجھے ڈاکٹر کے چہرے پر ہمدردی کی ایک کرن سی چمکتی نظر آئی۔ اس کی آنکھوں میں وہی عکس تھا جو اس چوکیدار کی آنکھوں میں تھا جس نے کہا تھا'' پاگل کتیا کو جانے دو۔'' میں نے بڑی احتیاط سے بچہ پھر اپنے بازوؤں میں لے لیا اور ہسپتال سے چلی آئی۔ ایک ٹیکسی' جس کی لائیٹ مدھم تھی' آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے پاس سے گذر گئی' رات آنکھیں ملتی ہوئی کروٹ لے رہی تھی۔ بچہ کل پیدا ہوا تھا آج مر گیا۔ گذرا ہوا کل میرا وہ آخری دن تھا جب میں بچہ پیدا کرنے کی اپنی آخری خواہش پوری کر سکتی تھی۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے آخری دن میری خواہش پوری ہوگئی تھی۔ آج بالکل ہی نیا دن تھا۔ مجھے اس حقیقت کا احساس تھا کہ کٹھور نامرادی کے ساتھ میری آخری خواہش پوری ہوئی تھی۔

بچے کو اسی طرح گود میں لیے ہوئے آہستہ آہستہ میں اپنے گھر کی طرف چلی جا رہی تھی۔ یہ دن وہ تھا جب مجھے نئے گھر میں منتقل ہونا تھا۔ میں اس بچے کے ساتھ اس گھر میں داخل ہوں گی۔ میں اپنے نئے گھر کے صحن میں بچے کو لٹاؤں گی جہاں خوب دھوپ آتی ہے۔ میں نے سوچا وہ

MashalBooks.com

عورت جس کے بچے کی قبر ہو اس عورت سے زیادہ خوبصور ہوتی ہے جس کے عمر بھر کوئی بچہ ہی نہ ہوا ہو۔ اگلے موسم بہار میں اس جگہ میں پورٹولا کا کے بیج بوددوں گی جہاں یہ بچہ سور ہا ہوگا۔ پورٹولا کا کے بیج جیسے ان بے شمار بچوں کی آنکھیں جنہیں میں نے ایک لمحے کو بھی دنیا دیکھنے کی مہلت نہیں دی۔

مجھے معلوم نہیں کہ میں کتنی دور چلی آئی تھی۔ اب مجھے چرچ سے عبادت گذاروں کی آہ وزاری کی آوازیں آرہی تھیں۔ صبح کی عبادت ہورہی تھی۔ اس علاقے میں بھی ایک چرچ ہے جہاں صبح کی عبادت میں عیسائی عبادت گذار گڑگڑا کر دعائیں مانگتے ہیں چرچ میں بہت ہجوم تھا۔ ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی بائبل اور دلوں میں دنیا جہاں کا دکھ لیے ہوئے عبادت گذار وہاں اکٹھے ہورہے تھے۔

یکا یک میرے قدم خود بخود چرچ کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ میں ان عبادت گذاروں میں شامل ہوگئی میرے اندر کا دکھ ان عبادت گذاروں کی آہ وزاری میں گھل مل گیا تھا۔

میرے اندر دکھ کا بھاری بوجھ کم ہوگیا تھا۔ اب آنسو کا وہ قطرہ آنکھوں سے ٹپک سکتا تھا جسے میں نے کب سے اپنے اندر دبائے رکھا تھا۔ اب وہ قطرہ طوفان بن کر باہر آرہا تھا۔ کشادہ اور کھلی جگہ پر آرہا تھا۔

غربت جو چوری کر لی گئی

اب پھر مجھے سانگ ہون کی حرکت اچھی نہیں لگی۔ میں نے ہانڈی کا ڈھکن اٹھایا تو دوسرے مسالوں کے باوجو ٹوفو کے سلائس پر صرف ایک بڑی سی انچوی مچھلی رکھی دکھائی دی۔ سانگ ہون نے بھی یہ دیکھا۔

''تم نے اس کمبخت مچھلی کا سر پھینکا کیوں نہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''انچوی مچھلی کی آنکھ دیکھ کر تو کراہت ہوتی ہے۔'' وہ بھنویں سکیڑ کر بڑی نرمی سے بول رہا تھا۔

میں نے اس کی اس بات کو نظر انداز کیا اور محض اسے دکھانے کے لئے اسی وقت مچھلی کے سر کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اپنے منہ میں ڈال لیا۔ پھر مزے لے لے کر چبانے لگی۔ ''تمہیں معلوم نہیں اس کے سر میں زیادہ غذائیت ہوتی ہے'' میں نے اسے چڑایا۔

اگر انچوی بہت زیادہ بڑی بھی ہو تب بھی وہ انچوی ہی ہوتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس معمولی سی آنکھ کے لئے اتنا ہنگامہ کیوں کر رہا ہے۔ آخر کیوں؟ وہ تو سرسوں کے بیج کے برابر ہی تھی۔ سانگ ہون کی حرکت سے مجھے نہ صرف متلی سی ہونے لگی تھی بلکہ مجھے پریشانی اور بے چینی بھی ہوگئی تھی۔

میں نے اپنی ناپسندیدگی ظاہر کرنے کے لئے اسے گھور کر دیکھا۔ مگر سانگ ہون نے اس کی پروا نہیں کی۔ بلکہ الٹا اس نے مچھلیاں نکال نکال کر کھانا شروع کر دیں۔ وہ ٹوفو کے سلائس اور شلجم کے پتے ایک طرف رکھتا جاتا تھا۔

''اوہو، کسی بھی انچوی کی آنکھ بند نہیں ہے''

MashalBooks.com

اس لئے کہ وہ وقت سے پہلے مرگئی تھیں۔'' میں نے کہا۔

''اگر ایسا ہوتا تو اعلیٰ قسم کی مچھلیاں جیسے سی بریم یا کوڈ بھی کھلی آنکھوں کے ساتھ ہی مرتیں۔''

''وہ ایسے ہی مرتی ہیں۔ خیر چھوڑو، ان کے بارے میں باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر ہم دونوں ہنسے اور اپنا ناشتہ ختم کیا۔

''ہوں۔۔ تو تمہیں ایک عورت کے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ہاں، اچھا لگتا ہے۔ مگر تمہیں اس چھوٹے سے کمرے میں تکلیف نہیں ہوتی؟''

میں نے اسے سمجھایا کہ اس علاقے میں پانچ چھ افراد کا خاندان آسانی سے اتنے بڑے کمرے میں رہ سکتا ہے۔ پھر میں نے ایک ایک چیز کا حساب لگا کر بتایا کہ مل جل کر رہنے سے ہم کتنی رقم بچا لیتے ہیں۔ میں اسے جب بھی یہ بتاتی کہ ہم اس طرح کتنا بچا رہے ہیں تو مجھے بہت ہی خوشی محسوس ہوتی اور لگتا جیسے میں ہوا میں اڑی جا رہی ہوں۔ پہلے تو یہ کہ ہم اپنے سب سے بڑے خرچ یعنی کرائے کی مد میں چار ہزار روان بچا رہے ہیں، پھر ایندھن، کوئلے، کھانے پینے کی چیزوں اور مسالوں کے خرچ میں بھی بچت ہو رہی ہے۔ اور اگر میں ایک ایک کر کے کم خرچ والی چیزوں کی فہرست بنانا شروع کرتی تو اس کا کوئی حد و حساب ہی نہ ہوتا۔ میں نے بجلی، پانی اور سیوریج کے بلوں میں ہونے والی اس بچت کا ذکر تو کیا جو اکٹھا رہنے کی وجہ سے ہو رہی ہے، مگر میں جان بوجھ کر سب سے اہم بات بالکل ہی گول کر گئی۔ اور وہ بات یہ تھی کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔

یہی وہ سب سے اہم وجہ تھی جس کی بنا پر ہم دونوں ابھی تک اکٹھے رہ رہے تھے۔ مگر میں ہمیشہ اس کا ذکر کرنے سے گریز کرتی تھی۔ دراصل میں اتنی شرمیلی تھی کہ میری زبان پر یہ بات آتی ہی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی چاہتی تھی کہ سانگ ہون خود ہی اپنے منہ سے وہ خاص جملہ بولے کہ ''ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔'' اگرچہ یہ تجویز میری ہی تھی کہ ہم دونوں اکٹھے رہیں، اس کے باوجود میں یہ الفاظ اپنی زبان پر نہ لا سکی تھی۔ میں اتنی ڈھیٹ ضرور تھی کہ میں نے زیادہ سوچ بچار کئے بغیر ہی اس سے کہہ دیا تھا کہ دو کمروں کے بجائے ہم ایک ہی کمرے میں رہیں گے اور کمرہ گرم کرنے والے ایندھن کے چار حصوں کے بجائے دو حصوں پر ہی گزارا کر لیں گے تاکہ ہم روزانہ کوئلے وغیرہ کا آدھا یا ایک حصہ بچا لیں۔ اور پھر ہم ایک ہی کمبل میں ایک

دوسرے کے ساتھ چمٹ کر سوئیں گے بھی۔ یہ سب تو میں نے کہہ دیا تھا، مگر وہ خاص فقرہ نہیں بول سکی تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں یہ کہنا نہیں چاہتی تھی بلکہ میں چاہتی تھی کہ پہلے وہ یہ بات کہے۔ میں اسی لیے خاص لمحے کا انتظار کر رہی تھی۔

میں نے سانگ ہون کے لئے لنچ بکس تیار کیا، اسے کام پر بھیجا اور اس کے بعد جلدی جلدی برتن دھوئے۔ سانگ ہون ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا جو مختلف دھاتوں کی پلیٹیں بناتی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اس فیکٹری میں چاندی کی انگوٹھیوں کو نہایت مہارت سے سونے میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اور نکل کے چمچوں اور چاپ سٹک کو چاندی میں بدل دیا جاتا ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ اصلی اور ملمع کی انگوٹھی میں کافی فرق ہوتا ہوگا۔ لیکن اس نے جواب دیا تھا کہ فیکٹری میں ایسی صفائی سے کام کیا جاتا ہے کہ بظاہر دیکھنے میں اصلی اور نقلی میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے۔

جب میں نے برتن دھونا شروع کئے تو آس پاس کے چھ کمروں کی عورتیں بھی وہاں آ گئیں۔ اور وہ بھی اسی کام میں لگ گئیں۔ سب عورتیں لکڑی کے تنگ سے برآمدے میں لگے شیلفوں پر برتن دھو رہی تھیں۔ یہ شیلف ہر کمرے کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ایندھن کا چولہا اور برتن، جیسے بالٹیاں اور سوئے ساس کی بوتلیں ہم نے شیلف کے نیچے رکھ دی تھیں۔ اس طرح یہ چھوٹا سا برآمدہ بیک وقت برتنوں کی صفائی اور باورچی خانے دونوں کے کام آتا تھا۔ عمارت کے مالک نے یہ برائے نام کچن کرایہ داروں کے لیے لوہے کے گارڈروں اور دیوار کے درمیان محدود سی جگہ پر بنا رکھا تھا۔ اس سے پہلے جس جگہ سے آسمان کا تھوڑا سا حصہ نظر آتا ہوگا وہ چھپ گیا تھا۔ اس کھلی جگہ کو دیوار اور چھت نے بند کر دیا تھا۔ اس طرح اس عارضی کچن میں تاریکی اور گھٹن سی پیدا ہو گئی تھی۔ جلتی ہوئی انگیٹھیوں اور کھانے پینے کی اشیاء سے پیدا ہونے والی سڑاند سے دم گھٹنے لگتا تھا۔ نمک اور مرچوں والی اشیاء کی بو اتنی تیز ہوتی تھی کہ اس جگہ گھستے ہی آنکھوں میں پانی آ جاتا تھا۔ یہ بدبو کمروں، کپڑوں حتیٰ کہ بستروں میں بھی رچ بس چکی تھی، اور مجھے یقین تھا کہ میرے بدن سے بھی یہ بو آتی ہوگی۔

بہرحال میں نے اس بو سے نفرت کرنا یا شرم محسوس کرنا چھوڑ دیا تھا۔ البتہ میرے ماں باپ اور دو بڑے بھائی اس بدبو سے نفرت کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بدبو برداشت کرنے سے تو مر جانا ہی بہتر ہے۔ اور آخر وہ مر گئے، اور مجھے تنہا چھوڑ گئے۔ میرے ماں باپ اور بھائی جو مجھے

MashalBooks.com

اکیلا چھوڑ گئے تھے ان کی اس افسوس ناک موت کا انتقام لینے کے لئے ہی میں نے یہ کوشش کی کہ میں اس بدبو کی عادی ہو جاؤں۔

میں خوب سمجھتی تھی کہ یہ سب عورتیں برتن دھوتے ہوئے مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ وہ اس نوجوان کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین نظر آتیں جسے میں اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ مگر ان کی نیت بری نہیں معلوم ہوتی تھی۔ البتہ، ہماری قطار کے آخری کمرے میں رہنے والی بوڑھی عورت جس طرح باتیں بناتی تھی اور مجھے گھور گھور کر دیکھتی تھی اس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے کہنا چاہتی ہے کہ میں شادی کرلوں، چاہے بہت سادگی سے ہی کروں۔ مگر میں نے اس کی باتوں پر توجہ نہیں دی تھی۔ یوں تو میں شادی کی تقریب سے متعلق ان کی یہ تشویش بآسانی دور کر سکتی تھی اور اس تقریب میں ان چھ آنٹیوں کو نوڈلز سوپ بھی پیش کر سکتی تھی' لیکن جب تک سانگ ہون یہ نہ کہے کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے اس وقت تک یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ میں برتن دھو رہی تھی اور زور زور سے گا رہی تھی کہ کہیں وہ عورتیں مجھ سے باتیں نہ کرنے لگیں۔ مگر صرف دو آدمیوں کی پلیٹیں دھونے میں اتنا وقت بھی نہیں لگتا جتنا ''ہرے بھرے میدان میں بنے ہوئے گھر کی تصویر'' والے گیت کا ایک بول گانے میں۔ میری طرح دوسری کرایہ دار عورتوں نے بھی جلدی جلدی پلیٹیں دھو ڈالیں۔ انہیں کارخانوں یا ان ملازمتوں کی طرف بھاگنا تھا جو حکومت نے بے روزگار یا بے آسرا لوگوں کو دے رکھی تھیں۔

یہ ایک یخ بستہ صبح تھی اور سرد ہوا جسم میں چاقو کی کی طرح اتر رہی تھی۔ یہ ہوا سڑکوں کو ایسے چاٹ رہی تھی جیسے اس کی صفائی کر رہی ہو۔ ہوا کے تیز جھونکے انگیٹھیوں کی راکھ اور دوسرا کوڑا کرکٹ سڑک کنارے ڈھیر کی صورت میں اکٹھا کر دیتے تھے۔ یہ ڈھیر بگولے بن کر اڑ رہا تھا اور گرد و غبار ہوا میں اڑ کر چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ تیز ہوا سے میرے گال چیخ رہے تھے اور ریت اور دھول میں سب کچھ دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ پہاڑی کی ڈھلان پر بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکانوں کی چھتوں پر لگی ٹین کی چادریں ہوا کے جھونکوں میں ایسے کھڑا کھڑا رہی تھیں جیسے مڑی جا رہی ہوں۔

حالانکہ لوگوں نے اپنے چہرے مفلروں سے خوب ڈھانک رہے تھے جس سے وہ خول میں چھپے کچھوے دکھائی دے رہے تھے، اور آنکھوں کے سوا ان کے چہرے کا کوئی بھی حصہ نظر نہیں

آ رہا تھا، جس سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ چور ہوں، پھر بھی وہ سب ایک دوسرے کو پہچان رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر روز سڑک پر اسی وقت ان کی ایک دوسرے کے ساتھ مڈبھیڑ ہوتی تھی۔ ایک عورت نے، جس کے ہاتھ میں بیلچہ تھا، میرے اوپر فقرہ کسا ''سنا ہے تم آج کل خوب مزے اڑا رہی ہو!''۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ پھٹے پرانے کپڑوں کی دبیز تہہ میں چھپی ہوئی تھی پھر بھی اس کے جسم سے جنسی لذت کی بو آ رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے بچپن میں ایک جانور کو اس حالت میں دیکھا تھا۔ میں نے اس عورت کے بارے میں شرم' نفرت اور تجسس کے ملے جلے جذبات محسوس کیے۔ پھر مجھے یہ سوچ کر بے چینی سی ہونے لگی کہ سانگ ہون کے ساتھ میرے جو تعلقات ہیں ان کی وضاحت کیسے کی جا سکتی ہے۔ میں اس کے ساتھ رہتی ہوں، اس کے ساتھ سوتی ہوں۔ اس کا جواز صرف یہی پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس طرح کوئلوں وغیرہ کی بچت ہو جاتی ہے۔

سردیوں کی اس صبح ہر چیز منجمد تھی' پھر بھی اس پہاڑی گاؤں کی ہر گلی میں تیز تیز چلنے پھرنے والے لوگ نظر آ رہے تھے۔ ہر شخص پھرتیلا معلوم ہو رہا تھا جیسے بہار میں اگنے والے پودے جو زندگی کی توانائیوں سے پھر پور اوپر ہی اوپر بڑھتے چلے جا رہے ہوں۔ میری ماں ان لوگوں کے اس عجیب سے پھرتیلے پن سے سخت نفرت کرتی تھی جو غربت کے پنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں پھر بھی جیئے جا رہے ہیں۔ اپنی شکست مانتے ہی نہیں۔ ماں اکثر کہا کرتی تھی کہ یہ لوگ جس طرح معاشرے کو برا بھلا کہتے ہیں اور پھر بھی اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ اس کا حصہ بنے ہوئے ہیں، اس سے وہ تنگ آ چکی ہے۔ لیکن ماں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ یہ بات زبان پر بھی لے آتی۔ اس نے اپنے شوہر اور بیٹوں کے دلوں میں بھی ایسی زندگی سے اتنی شدید نفرت بھر دی تھی کہ آخر انہوں نے بھی اس کے ساتھ ہی خودکشی کر لی۔ اور یوں انہوں نے اپنی غربتی اپنی بدنما موت کا منظر اور اس کی بدبو میرے اوپر مسلط کر دی۔ مرنے کے بعد ان کی آنکھیں بھی ایسے ہی کھلی ہوئی تھیں جیسے سالن میں پکی ہوئی انچوی مچھلی کی آنکھیں۔ لیکن میں نے اس غربت سے اپنائیت اور قربت محسوس کی جسے میرے ماں باپ اور بھائیوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور موت کو ترجیح دی تھی۔ اگرچہ میرا دل زخمی تھا اس کے باوجود مجھے زندگی کی مسرتوں کے احساس نے اپنے بازوؤں میں بھر رکھا تھا۔ میرے ماں باپ اور بھائی ظاہر تو یہ کرتے تھے کہ وہ غربت

MashalBooks.com

سے نفرت کرتے ہیں مگر میں جانتی تھی کہ اصل میں وہ اس سے ڈرتے ہیں۔ جیسے جب میں بچی تھی تو میں نے بہادری دکھانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اپنا سینہ پھلایا تھا اور سیدھی پہاڑی کی ڈھلان سے دوڑتی ہوئی اترتی چلی گئی تھی۔

میں جس کارخانے میں کام کرتی تھی وہ محض نام کا کارخانہ تھا۔ کیونکہ وہ صرف ایک چھوٹا سا ۳۶ مربع فٹ کا گرم فرش والا کمرہ تھا۔ وہاں مختلف سائنز کے کپڑے کی کترنوں کا ڈھیر فرش پر پڑا ہوتا تھا۔ کھڑکی کے پاس تین سلائی مشینیں رکھی ہوئی تھیں۔ کارخانے کی مالکن نے کپڑے کے اوپر کپڑا رکھا، پھر اس پر ڈیزائن رکھا اور کاٹ دیا۔ پھر اس نے کٹائی بند کی، آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ میں نے اسے کپڑے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹتے دیکھا تو میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ لیکن بہرحال ایک گڑیا کو بھی کپڑوں کی ضرورت تو ہوتی ہے۔ ہمیں ان کے لئے نیکر، سکرٹ، بلاؤز اور بریزیئر تیار کرنا ہوتے تھے۔ گڑیا کے لباس پر بھی، جیبیں اور بٹن لگانا اور کڑھائی کا کام کرنا ہوتا تھا۔ اسکرٹ کے کناروں پر لیس لگانا بھی ضروری تھی۔ اور چونکہ یہ کام مختلف عورتوں میں تقسیم تھا اس لئے ایک گڑیا کا چھوٹا سا دار ڈروب تیار کرنے میں کئی ہاتھ لگتے تھے۔ میرے ذمے یہ کام تھا کہ آنٹی میرے لئے جو پیٹرن کاٹتی تھیں ان کی سلائی کردوں۔ میں نے لگاتار گڑیوں کے اتنے لباس سیئے تھے کہ میں اپنے آپ کو کپڑے سینے والی وہ کنیز سمجھنے لگی تھی جسے بونوں کے دیس میں قید کر دیا گیا ہو۔

مالکن شام کو کام کرتے کرتے تھک جاتی تو مجھ سے اپنے کندھے دبواتی۔ پھر وہ ان فضول گڑیوں کو کوسنے دیتی جو ان کپڑوں کے لائق بھی نہیں تھیں۔ لیکن ہم جانتے تھے کہ جس دن گڑیاں یہ لباس پہننا بند کر دیں گی، اور وہ کارخانے سے ننگی باہر جائیں گی، تو اس دن کارخانہ کی مالکن کے ساتھ ہماری روزی بھی بند ہو جائے گا۔

سلائی کرتے ہوئے میں خواب دیکھا کرتی تھی کہ ایک دن میں بھی ڈریس ڈیزائننگ کا فن سیکھ جاؤں گی۔ میں سوچا کرتی تھی کہ ایک دن میں فرسٹ کلاس ڈریس میکر بن جاؤں گی اور کسی اول درجے کے بڑے فیشن سیلون میں اپنا مقام بنالوں گی۔ جاگتی آنکھوں کے ان خوابوں نے روزمرہ کے اس کام کو میرے لئے کم مشکل بنا دیا تھا۔

لیکن اگر میں فرسٹ کلاس ڈریس میکر بن گئی اور سانگ ہون یونہی دھاتوں کی پلیٹیں بنانے

والی فیکٹری کا مزدور بنا رہا تو پھر کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر میں کچھ پریشان ہو جاتی تھی۔ اگرچہ مہارت کے ساتھ چاندی کو سونے میں تبدیل کرنا بھی ایک حیرت انگیز کام تھا، مگر میں یہ سوچتی تھی یہ لوگ بہت ہی چالاک ہیں اور وہ کام کر رہے ہیں جو ٹھگ اور جرائم پیشہ لوگ کرتے ہیں۔ مگر سانگ ہون کا کہنا تھا کہ وہ دکاندار جو تھوک میں یہ انگوٹھیاں خریدتے ہیں وہ اپنے گاہکوں کو یہ کہہ کر کبھی دھوکا نہیں دیتے کہ یہ اصلی سونے کی ہیں۔ ویسے ان کے گاہک بھی اصلی سونے کی انگوٹھیاں ہی پسند کرتے ہیں مگر وہ اتنے غریب ہیں کہ انہیں خرید نہیں سکتے۔ وہ دکاندار انہیں سستے داموں انگوٹھیاں دیتے تھے۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ واقعی اچھا کام کر رہے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو مجھے بھی ویسی ہی انگوٹھی چاہیئے۔

کسی دن سانگ ہون مجھ سے ضرور کہے گا کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے۔ یہ میں جانتی تھی۔ اگر وہ میری انگلی میں ملمع والی انگوٹھی ڈالتے ہوئے یہ کہے تو کتنا اچھا ہو۔ میں کسی کو یہ نہیں بتاؤں گی کہ انگوٹھی اصلی سونے کی نہیں ہے۔ یہ خوش کن خواب دیکھتے ہوئے میں ہمیشہ مسکرانے لگتی تھی۔

بھلا کارخانے کی مالکن کہاں سمجھ سکتی تھی کہ میں کیوں خوش ہو رہی ہوں، اس لئے اس نے یہ کہہ کر میری خوشی پر پانی پھیر دیا۔ ''چچ چچ چچ۔۔۔ تمہاری ماں کو تو مر جانا ہی چاہئے تھا۔ وہ ٹھیک ہی مری!'' وہ بڑبڑائی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے یہ کیوں کہا۔ آخر اس نے ایسی بیہودہ بات کیوں کی۔

وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میری ماں چند مہینے پہلے ہی مری ہے۔ اس کے باوجود اس نے اس کے بارے میں ایسی فضول بات کی۔ یہی آنٹی میری ماں کی موت کا سن کے سب سے پہلے وہاں پہنچی تھیں۔ اس وقت بھی انہوں نے لرزتے ہوئے کہا تھا ''اس مظلوم عورت کو دیکھو۔ اسے مر جانا ہی چاہئے تھا۔''

یہ آنٹی میری ماں کی واحد سہیلی رہ گئی تھیں۔ جب ہم انتہائی غریب ہو گئے تھے تب بھی وہ ہمارے گھر آتی تھیں۔ یہی ایک ایسی دوست تھیں جو کسی حد تک میری ماں کی غیرت اور ان کی اونچی ناک کو سمجھتی تھیں۔ جب وہ کمپنی جس میں میرے باپ کام کرتے تھے دیوالیہ ہو گئی اور بڑھاپے میں بیروزگار ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں ریٹائرمنٹ کے فوائد بھی نہ ملے تو میری ماں کی واحد سہیلی یہ آنٹی ہی تھیں جن سے میری ماں نے اپنے مستقبل کے بارے میں مشورہ کیا تھا۔ یہ

MashalBooks.com

آنٹی بھری جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں۔اس کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کا بوجھ خود ہی اٹھایا۔

جب انہیں پتہ چلا کہ اس عرصے میں ہم انتہائی کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارتے رہے ہیں تو آنٹی حیران رہ گئیں' پھر انہوں نے ماں کو آڑے ہاتھوں لیا''یہ بتاؤ تم نے اس اکٹھی رقم کا کیا کیا جو میں نے تمہیں کیلاسیونگ کلب سے کئی بار دلوائی تھی۔(کیلاسیونگ کلب جان پہچان والی عورتوں کی بچت کا کلب تھا)۔

ماں نے بہانہ تراشنے کی کوشش کی''تم ایک تنخواہ دار گھرانے کی زندگی کے بارے میں نہیں جانتیں۔ہر مہینے ہمارے پیسے جلدی ختم ہو جاتے ہیں اور میں یہ کمی اسی رقم سے دور کرتی ہوں۔''

آنٹی بولیں''تو پھر تم اسی لائق ہو کہ تکلیف میں زندگی گزارو۔میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اپنے گھر کا ایک کمرہ کرائے پر دے دو اور کرائے کی رقم سے پنساری کی دکان کھول لو۔خوش قسمتی سے تمہارے گھر کی لوکیشن بہت اچھی ہے' اور میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ اگر تم اور تمہارا شوہر محنت سے کام کریں تو اس دکان کی آمدنی سے تم اچھی زندگی گزار سکتی ہو۔''

مگر ماں نے اپنی سہیلی کے مشورہ پر عمل نہیں کیا۔''میں ایک چھوٹی سی دکان کیوں کھولوں۔ میری سہیلیوں کے شوہروں نے تو خوب دنیا کمائی ہے اور اب وہ بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں ۔مجھے تو دکان کرتے شرم آتی ہے!!''

بھرپور زندگی گزارنے کے لیے انسان کے پاس بلند خیال اور جوش وجذبہ ہونا چاہئے ۔ اسے یہ بھی علم ہونا چاہئے کہ موقع سے فائدہ کیسے اٹھایا جاتا ہے۔اور اس وقت اس کے باپ کے لئے وہی موقع تھا فائدہ اٹھانے کا۔مگر میری ماں نے میرے باپ کو اس طرف نہیں جانے دیا۔حتٰی کہ جب میرے باپ ایک کمپنی میں کام کر رہے تھے اور ان کی آمدنی بھی معقول تھی تو میری ماں باہر کی سیر سے واپس آنے کے بعد میرے باپ کو مسلسل کچوکے دیتی رہتی تھی۔وہ شکایت کرتی تھی کہ دوسرے لوگ تو خوب اچھی زندگی گزارنے کا سلیقہ جانتے ہیں اور ان کے اثاثے بھی مسلسل بڑھ رہے ہیں مگر ہمارا گھرانہ بدستور بدحالی کی زندگی گزار رہا ہے۔ہم ایک ہی جگہ کھڑے ہیں۔ وہ میرے باپ کو ایسے ڈانٹتی جیسے کوئی مالک اپنے ملازم کو ڈانٹتا ہے۔اس نے میرے باپ کی زندگی جہنم بنا دی تھی۔ایسی تھی میری ماں۔اس کا خیال تھا کہ چونکہ اس کے شوہر کی ملازمت ختم ہو گئی ہے اور اسے معمولی تنخواہ والی نوکری سے نجات مل گئی ہے تو اب اس کے لئے بہترین موقع

ہے کہ وہ بڑے بڑے خطرے مول لینے والا کاروباری بن جائے۔

ماں اپنی ایک ایسی سہیلی کے پاس گئی جو لکھ پتی ہونے کا دعویٰ کرتی تھی اور بالآخر اس کے پاس اپنا گھر گروی رکھ کر ایک بڑی رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ماں کے اس بے باکانہ اقدام کی وجہ سے میرے باپ نے ایک دفتر کرائے پر لیا۔وہاں ٹیلی فون لگوائے،ایک ریوالونگ چیئر خریدی'ایک فیشن ایبل لڑکی بھی ملازم رکھی اور کمپنی کے صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ماں اس بات سے بہت خوش ہوتی تھی کہ وہ دن میں کئی کئی بار باپ کو فون کرے اور اس کی سیکریٹری سے کہے ۔''اوہ مس چوئے؟ میں صدر کی بیوی بول رہی ہوں۔ پلیز میری صدر سے بات کرادو''۔ماں کو جب بھی موقع ملتا وہ یہی الفاظ دہراتی۔یہ الفاظ دہرائے بغیر ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔

افسوس!!اس سے قبل کہ ماں صدر کی اہلیہ کا لہجہ اچھی طرح اختیار کر لیتی' میرے والد کی کمپنی دیوالیہ ہوگئی۔اور یوں دفتر،گھر اور گھر کی ہر چیز ہم سے چھن گئی۔سو تو دور کی بات ہے،ہم اصل رقم کی ایک پائی بھی ادا کرنے کے قابل نہیں تھے۔ماں نے گھر گروی رکھ کر جو اصل رقم حاصل کی تھی وہ بھی ادا نہ کی جا سکی۔ہمیں گھر کی ملکیت سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔اور ہمیں وہاں سے نکال باہر کیا گیا۔

اس سے بھی بدتر بات یہ ہوئی کہ میری ماں گاہے بگاہے جو چھوٹی چھوٹی رقم ادھار لیتی رہی تھی اسے ادا کرنے کے لئے گھر کی جو چیز بھی فروخت ہو سکتی تھی وہ بھی ہم سے چھن گئی۔ ماں نے اپنی دولتمند سہیلی کے سامنے بہت آنسو بہائے اور شکوہ کیا کہ''میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ تم اتنی ظالم ہو سکتی ہو۔''بعد میں اس سہیلی کے ساتھ ماں کی خوب تو تو میں میں ہوئی۔آخر میں تمام مال ومتاع اس سہیلی کے قبضے میں چلا گیا۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب اس معزز خاتون نے کسی بھی قسم کا لحاظ کئے بغیر ہماری ہر چیز پر قبضہ کر لیا تھا۔

البتہ اس ساری صورت حال کے باوجود ماں کی اس سہیلی نے ہمیں سڑک پر نہیں پھینکا بلکہ اس نے ایک کمرہ ہمیں کرائے پر دے دیا۔

''تم تو اسی قابل ہو کہ ایسی مصیبتیں بھگتو،مگر مجھے تمہارے بچوں پر رحم آتا ہے۔اس لیے میں یہ مہربانی کر رہی ہوں۔''

ماں کی دونوں سہیلیوں،یعنی دونوں آنٹیوں نے،ایک وہ جو گڑیوں کے ملبوسات تیار کرتی

MashalBooks.com

تھی اور دوسری وہ جو لکھ پتی تھی اور جس نے قرضہ دیا تھا، یہ تو کہا کہ تم اسی لائق ہو کہ سختیاں جھیلو، لیکن ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا تھا کہ تمہیں مر ہی جانا چاہئے''۔

جب ماں کے پاس کرائے کے کمرے میں رہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا تب بھی اس نے یہ ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا کہ اب وہ اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے کے قابل نہیں رہی۔ وہ بالکل بچوں کی طرح ضد کرتی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم بچوں کو کالج نہ بھیجیں۔ وہ انسان تھی، کتا یا سور تو نہیں تھی۔ ماں اور باپ دونوں کے پاس ایک پائی تک کمانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا مگر ان کی ایک ہی رٹ تھی ''پڑھو، پڑھو اور پڑھو''۔ انہوں نے وہ جمع پونجی بھی ایک تھرڈ کلاس یونیورسٹی میں میرے بھائیوں کی پڑھائی اور ہائی اسکول میں میری پڑھائی کی نذر کر دی جو مکان کی گروی چھڑانے کے لئے رکھی تھی۔ اور یوں ہمیں کرائے کے ایک کمرے میں منتقل ہونا پڑا۔ یہ کرایہ ہمیں ہر مہینے ادا کرنا ہوتا تھا۔ اس سے ہماری رہی سہی بچت بھی ختم ہو گئی۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب ہمیں نہ صرف اسکول بلکہ بعض دیگر چیزیں بھی چھوڑنا پڑیں۔ آخر ہم نے نواحی علاقے میں پہاڑی پر ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ اس طرح بچت کرنے کے بجائے ہر مہینے ہمیں چار ہزار واون کرایہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت تک بھی ماں یہ ماننے کو تیار نہ تھی کہ ہم بالکل قلاش ہو چکے ہیں۔ غربت کے تعفن سے بیزار ہو کر وہ کانپنے لگتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس پر دورہ پڑ گیا ہے۔ وہ غریبوں کو غلیظ اور بدبودار سمجھتی تھی اس لئے ان کے ساتھ اس نے کبھی کوئی تعلق نہیں رکھا۔ وہ غریبوں کے اس ناقابل شکست جذبے پر ہمیشہ ناراض رہتی تھی کہ وہ ہر قیمت پر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ وہ انہیں بہت ہی حقیر جانتی تھی اور حیران ہوتی تھی کہ وہ صفائی کی سہولتوں سے محروم اپنے کھولی نما کمروں میں کیسے زندہ رہتے ہیں۔ یہ لوگ جو نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، افلاس زدہ ہیں، اپنی ناقابل برداشت تعفن زدہ دنیا میں زندہ ہیں اور صرف کہنے کو ہی انسان ہیں۔

اپنے ان جذبات سے قطع نظر جب میری ماں کو گھر داری کرنا پڑی تو صورتحال اور بھی خراب ہو گئی۔ ہمارے کمرے سے ملحقہ چوبی برآمدے میں ہر وقت گندے برتنوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔ یہ برتن اگلے کھانے تک یونہی پڑے رہتے تھے اور ارد گرد کے علاقے کی مکھیاں سارا دن ان پر بھنبھناتی رہتیں۔ یہ تھی میری ماں کی ڈھٹائی کہ وہ اب بھی اپنی غریبی کا اعتراف کرنے کو تیار نہ تھی۔

گٹریوں کے ملبوسات تیار کرنے والی آنٹی نے کئی بار ماں کو مشورہ دیا کہ وہ اس کے ساتھ کام کر لے تا کہ اس کے بچے بھوک سے بچ جائیں۔ لیکن ماں کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ آخر آنٹی نے مجھے کام پر لگا کر کسی حد تک یہ مسئلہ حل کیا۔ میں نے خوشی خوشی یہ کام قبول کر لیا اور ننھے منے لباسوں کی سلائی سیکھنے کے لیے وہاں چلی گئی۔ اگر آپ کو سلائی مشین چلانا آتی ہو تو یہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جس میں مہارت حاصل کرنا مشکل ہو۔ آنٹی نے کئی دن میرا کام دیکھنے بعد مجھ سے کہا کہ وہ مجھے دس ہزار واون مہینے دیا کریں گی۔ انہوں نے کہا کہ وہ میرے ساتھ خصوصی سلوک اس لئے کر رہی ہیں کیونکہ اس خطیر رقم سے وہ میرے گھرانے کو فاقوں سے بچا لیں گی۔

میں اس دن چھلانگیں مارتی گھر پہنچی کہ اپنے گھر والوں کو یہ خوشخبری سناؤں۔ مگر دس ہزار واون تو جیب خرچ کے لئے ہی کافی ہو سکتے تھے۔ کمرے کا کرایہ ادا کرنے کے بعد باقی رقم سے پانچ افراد کے کنبے کے لیے مہینے بھر کے چاول بھی نہیں خریدے جا سکتے تھے۔ بہر حال، میں نے، جو گھر میں سب سے چھوٹی تھی، یہ ثابت کر دیا کہ میں دس ہزار واون کما سکتی ہوں۔ اور یہ بھی جتلا دیا کہ گھر کا ہر فرد اگر اپنے جھوٹے پندار کا مکھوٹا اتار کر اور اپنی نام نہاد انا کا دکھاوا چھوڑ کر محنت کرنے پر تیار ہو جائے تو کم سے کم دس ہزار واون ضرور کما سکتا ہے۔

''اگر ہم دل سے ایک ہو جائیں تو ہم یہ کام کر سکتے ہیں۔ اس علاقے کا ہر گھرانہ اسی طرح کمائی کرتا ہے اس لئے آپ کو شرمسار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جوان، بچے اور بوڑھے سب پیسے کما رہے ہیں، وہ کتوں کی طرح کام کرتے ہیں مگر شاہانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ کچھ گھروں میں تو ٹیلی وژن بھی ہے۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو ہر دو تین دن بعد بھنا ہوا گوشت کھاتے ہیں۔ وہ ہنستے کھیلتے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم بھی اس طرح زندگی گزار سکتے ہیں۔ ہمارے گھر میں تو کوئی بوڑھا یا بچہ بھی نہیں ہے، ہم سب کمائی کر سکتے ہیں۔ ایک ہی فرد پر انحصار کرنے کے بجائے اگر ہم سب کام کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اچھی طرح گزر اوقات نہ کر سکیں''، میں نے اس طرح اپنے خاندان کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

''اچھا تو تم اس بات سے ڈرتی ہو کہ کہیں ہم تمہارے سر نہ پڑ جائیں گے؟ ہرگز نہیں! تم انتظار کرو اور دیکھو'' ماں نے کہا۔ اور اگلے دن جب میں کام سے گھر واپس آئی تو میرا پورا کنبہ مر چکا تھا۔ گلابی جاڑوں کے اس دن انہوں نے چھوٹے سے کمرے میں کوئلوں کی انگیٹھیاں

MashalBooks.com

دہکائی تھیں اور کمرے کا ایک ایک سوراخ بند کر دیا تھا۔ اور وہ چاروں' ایک دوسرے کے پہلو میں مردہ پائے گئے۔ سب مر گئے، سوائے میرے۔

اس کے بعد میں نے سانگ ہون کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ میں نے یہ عادت بنالی تھی کہ کام سے واپسی میں بازار ضرور جاتی، چاہے کتنی ہی دیر کیوں نہ ہو رہی ہو۔ اس دن میں نے خاص طور سے مچھلیوں کے سٹال پر کوڈ اور سی بریم مچھلیاں دیکھیں۔ اگرچہ میں نے اس صبح بڑے اعتماد سے سانگ ہون سے کہا تھا کہ کوئی مچھلی چاہے کتنی ہی قیمتی کیوں نہ ہو جب وہ مرتی ہے تو اس کی آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں، مگر پھر بھی میں اس کا پورا یقین کر لینا چاہتی تھی۔ واقعی یہ سچی بات تھی، وہاں پڑی ہر مچھلی کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں۔ یہ سوچ کر میری بے ساختہ ہنسی نکل گئی کہ مچھلی کا تو سرے سے پپوٹا ہی نہیں ہوتا۔

میں نے نمک لگی میکرل مچھلی خریدی۔ اس مچھلی میں چونکہ کافی چکنائی ہوتی ہے اس لئے اگر اسے کوئلے کی انگیٹھی پر بھونا جائے گا تو اس سے صرف دھواں ہی نہیں اٹھے گا بلکہ اس سے بدبو بھی بہت آئے گی۔ مچھلی کی تیز بساند عمارت کے اس سرنگ نما باورچی خانے میں پھیل جائے گی جسے چھ گھرانے استعمال کرتے ہیں۔ فتح مندی کے احساس کے ساتھ میں جلدی جلدی پہاڑی کے علاقے میں پہنچ گئی۔ سانگ ہون کمرے میں تھا' اور کوئی کام کئے بغیر ہی چت لیٹا ہوا تھا۔

''تم بھول گئے کہ ہم نے یہ طے کیا تھا کہ ہم دونوں میں سے جو بھی پہلے آئے گا وہ چاول پکائے گا؟''

سانگ ہون نے جیسے سنا ہی نہیں۔ اس نے کابلی سے سگریٹ سلگایا اور کش لینے لگا۔

''اچھا۔ تو تم اب یہ کرو گے؟ اگر تم چاہتے ہو کہ میں ہی کام کروں، تو کیا تم میری اتنی سی مدد بھی نہیں کر سکتے؟۔ ہم اس لئے تو اکٹھے نہیں رہ رہے ہیں کہ ایک کام کرے اور دوسرا اس سے فائدہ اٹھائے۔''

ہم دونوں نے برابر کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ حتیٰ کہ روزانہ کا خرچ بھی برابر برابر تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس لئے ہم نے گھر کے کام کاج بھی بانٹ رکھے تھے۔ بلاشبہ مجھے یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنے طے شدہ حصے سے زیادہ کام کرتی ہوں۔ اور مجھے اس پر غصہ بھی آتا تھا۔

''پلیز آج مجھے تنہا چھوڑ دو'' سانگ ہون پریشان سا نظر آ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ کوئی غم

چھپا رہا ہے۔

''کیا آج ورکشاپ میں کچھ ہو گیا؟'' فوراً میرا دل پسیج گیا۔

''آج مان سک کو کام کرتے ہوئے خون کی الٹی آ گئی۔'' سانگ ہون نے کہا۔

''اوہ' میرے خدایا' اس کا مطلب ہے اسے ٹی بی ہے! اس کے بعد کیا ہوا؟''

میں مان سک سے نہیں ملی تھی، لیکن سانگ ہون سے معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک زرد رنگت والا آدمی ہے جو ہر وقت بری طرح کھانستا رہتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ شاید مان سک کو ٹی بی ہے۔ اور شکایت کی کہ کھانے کے وقفے میں جب وہ اکٹھے تھے تو اس نے بہت ہی برا وقت گزارا۔

''اچانک اس نے خون تھوکا اور بیہوش ہو کر گر گیا۔ مالک گھبرا گیا کہ شاید وہ مر گیا ہے، اور اب اسے ہی سب کچھ بھگتنا پڑے گا۔ وہ ہم غریبوں پر چیخا کہ مان سک کو فوراً اٹھاؤ اور اس کے گھر لے جاؤ۔ ہم نے اس کے حکم پر عمل کیا۔ اسے وہ رقم بھی دی جو مالک نے دی تھی اور واپس آ گئے۔''

''مالک نے اسے کتنی رقم دی؟'' میں نے پوچھا۔

''کتنی رقم؟ وہی جو ایک دن پہلے دی تھی۔''

''کنجوس کہیں کا۔ اور تم لوگ خاموش کھڑے دیکھتے رہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اور کرتے بھی کیا۔''

''یعنی تم یہ کہہ رہے ہو کہ تمہارا ایک ساتھی مصیبت میں تھا اور تم اسے یونہی کھڑے دیکھتے رہے؟ گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس کے بعد تم سکون سے بیٹھ گئے!۔ یہ کوئی مناسب بات تو نہیں ہے۔ لوگ چاہے کچھ بھی کہیں لیکن اچھی بات تو یہ ہے کہ ضرورت مند لوگوں کو ایک دوسرے کی مدد کرنا چاہئے۔ ہم ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ ضرورت مندوں کو نظر انداز کرنا اچھا نہیں ہے۔''

میں نے اپنی بات ختم کی تو مجھے محسوس ہوا کہ سانگ ہون میری بات سمجھ ہی نہیں سکا ہے۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھا۔ سانگ ہون جب ایسی حالت میں ہوتا تھا تو وہ بہت ہی بیوقوف سا دکھائی دیتا تھا۔ اپنی اچھی شکل وصورت کی وجہ سے وہ غریب و نادار نظر نہیں آتا تھا مگر سیدھا سادہ ضرور معلوم ہوتا تھا۔ مجھے سانگ ہون کے اس رویے سے شدید نفرت تھی۔ اس لئے میں اس سے ناراض ہو جاتی تھی۔ میں نے اس سے پھر کہا کہ ہم غریبوں کو ایک دوسرے کو اس طرح اکیلا نہیں

MashalBooks.com

چھوڑنا چاہئے۔ میں نے کہا ہمیں بیمار کے لئے چندہ جمع کرنا چاہئے۔ اور اس کے گھر والوں کو تسلی دینا چاہئے۔ میں نے مان سک کے ساتھ جھوٹ بولنے پر سانگ ہون کو برا بھلا کہا۔ میں نے اس سے کہا کہ مان سک سے کہو، وہ کسی بات کی پروا نہ کرے اور اپنا خیال رکھے۔ میں مان سک کی موت تک سانگ ہون کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ میں نے یہ جو کہا کہ ''موت تک'' تو اس سے لگتا ہے جیسے اس کی موت میں بہت عرصہ لگا ہو، حالانکہ جب کسی آدمی کو خون کی قے آجائے تو بھلا وہ کتنے دن زندہ رہ سکتا ہے۔ میں نے غصے میں اس کا اندازہ بھی لگا لیا تھا۔

ہم نے رات کا کھانا اٹھایا اور بیزاری کے ساتھ بیٹھ گئے۔ پھر بستر پر چلے گئے۔ ہمارے لئے یہی بہتر تھا کہ بستر پر چلے جائیں کیونکہ ہمارا کمرہ یخ بستہ ہوا سے محفوظ نہیں تھا۔ ہوا اتنی ٹھنڈی تھی کہ اگر ہماری ناک کمبل سے باہر نکل آتی تو سردی سے جم جاتی۔ اس سے بھی زیادہ خرابی یہ تھی کہ فرش برائے نام ہی گرم تھا۔ وہ اتنا گرم نہیں تھا کہ کمرے کو ٹھنڈ سے بچا سکے۔ اس لئے ہمارے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک دوسرے کے ساتھ چمٹ کر لیٹ جائیں۔ اور جب ہم نے وہ کیا جو عام طور پر ایک ہی کمبل میں لیٹے ہوئے عورت اور مرد کرتے ہیں تو میں نے سوچا۔۔۔ ایسے نہیں۔ اس طرح نہیں۔ اس خیال کا تعلق اس پریشانی سے نہیں تھا جو ہم دونوں کے اناڑی ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ اس طرح کچھ حرارت پیدا ہو اور کچھ تسکین ملے۔ لیکن ہمیشہ اس کے برعکس ہی ہوتا تھا۔ میں اس وقت رونا چاہتی تھی مگر میں نے یہ خواہش دل میں ہی دبالی۔ عام طور پر میں بہت روتی تھی حتی کہ خوشی کے موقع پر بھی رو پڑتی تھی۔ اور مجھے یہ اچھا لگتا تھا کہ خوب رونے کے بعد دل کا غبار نکل جاتا ہے۔ لیکن اس وقت میں رونا نہیں چاہتی تھی۔

دوسرے دن میں نے اپنی مشترکہ پاس بک سانگ ہون کو دی اور کہا کہ جو آدمی چندہ جمع کرے سب سے پہلے اسے خود ہی رقم دینا چاہئے، اس کے بعد پھر وہ دوسروں سے چندہ لے۔ اس طرح کام آسان ہو جائے گا۔ میں نے اس سے بار بار کہا تھا کہ جیسے ہی رقم جمع ہو، اور جتنی بھی جمع ہو، اسے بیمار آدمی کو جا کر دے دینا۔ اس دن میں اپنے کام پر بھی دن بھر مطمئن رہی کہ میں ایک اچھا کام کر رہی ہوں۔ مجھے اس بات پر فخر تھا کہ میں زندہ ہوں اور کسی کی مدد کر رہی ہوں۔

لیکن شام کو گھر آئی تو یہ دیکھ کر صدمے سے بیہوش ہوتے ہوتے رہ گئی کہ سیونگ اکاؤنٹ

میں ایک پائی بھی نہیں بچی تھی۔ سانگ ہون نے ایک ایک پائی نکال کر مان سک کو دے دی تھی۔ یہ کام کوئی اسی وقت کر سکتا ہے جب وہ بالکل ہی پاگل یا عقل سے عاری ہو جائے۔

''معاف کرنا'' اس نے کہا ''میں جانتا تھا کہ تم یہ بات نہیں سمجھ سکو گی۔ آخر میں کس سے چندہ لیتا؟۔ وہ تو سب کے سب غریب ہیں۔''

کیا؟۔۔۔'' میں نے کہا ''وہ سب غریب ہیں! تو ہم کیا ہیں؟ امیر؟ ہم امیر ہیں؟''

میں نے غصے میں اس کی قمیض کا کالر پکڑا اور کھینچ کر اس کا سر دیوار پر مارا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ تیس ہزار وان میں سے آدھی سے بھی زیادہ رقم اس کی تھی مگر لگتا تھا کہ سانگ ہون کو اس کی پروا ہی نہیں ہے۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ اسے ٹی بی کے مریض سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ اسے مریض یا رقم دونوں میں سے کسی کی بھی پروا نہیں تھی۔ اور یہی اصل معاملہ تھا۔ کچھ لوگ مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن اپنی دولت خرچ کرنا نہیں چاہتے۔ وہ یہ بحث کرنے کے لئے جیب سے رقم نکالتے ہیں کہ دو ہزار وان دیئے جائیں یا تین ہزار؟ اور پھر واپس رکھ لیتے ہیں۔ اور پھر ایک ہزار کے فرق پر پریشان ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ گھٹیا انصاف پسندی اور خود غرضی کے جھمیلوں میں پھنسے رہتے ہیں اور یہ سوچتے ہی رہتے ہیں کہ انہیں کتنی رقم دینا چاہئے۔ اس قسم کی دل دوز سوچ بچار کے بغیر ہی سانگ ہون نے میرے تیس ہزار وان ایسے پھینک دیئے تھے جیسے پھٹا ہوا جوتا پھینکتے ہیں۔ میں یہ سوچ کر لرز گئی۔

''تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟ تم ہو کیا؟ تم دولت مند آدمی ہو؟ امیر ہو؟'' میں چیخی۔ سانگ ہون خاموش بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ میں بہت ہی تھک گئی تھی مگر مجھے بالکل نیند نہیں آئی۔ مگر وہ فوراً ہی سو گیا۔ میں نے بیس واٹ کے دودھیا بلب کی مدھم روشنی میں اس کا سویا ہوا چہرہ غور سے دیکھا۔ بتاؤ تو سہی تم کیا ہو؟ تم کیسے آدمی ہو کہ پھٹے جوتے کی طرح تیس ہزار وان پھینک کر اتنے آرام سے سو رہے ہو؟۔ ٹھیک ہے، میں یہ برداشت کر سکتی ہوں کہ تمہارے جذبات صحیح ہیں۔ لیکن تمہارے جذبات دوسرے غریب لوگوں سے مختلف ہیں۔ وہ بہادر ہیں اپنے معاملات میں اٹل اور تازہ دم۔ اور تم بالکل ہی مختلف ہو۔ میں خوف سے تھرا گئی۔

میں پہلی بار سانگ ہون سے ایک خوانچہ فروش کی ریہڑی کے پاس ملی تھی۔ وہ خوانچہ فروش پانچ وان کا سستا کیک بیچتا تھا۔ پہلی نظر میں وہ ان گھریلو سامان بنانے والی فیکٹریوں کا کوئی

MashalBooks.com

مکینک معلوم ہوتا تھا جو وہاں قطار در قطار موجود تھے۔ بہر حال، وہ جس طرح کیک کھا رہا تھا میں اسے زیادہ دیر دیکھنا برداشت نہ کر سکی۔ اسے اپنے ہاتھوں کا کچھ زیادہ ہی خیال تھا، کیونکہ وہ خالی ہاتھ سے کیک نہیں کھا رہا تھا بلکہ اس نے پھولدار ٹشو پیپر میں کیک اٹھا رکھا تھا۔ کیک کھالیا تو اس نے بڑے سلیقے سے ٹشو سے اپنے ہونٹ صاف کئے۔

اگر چہ اس نے پانچ وان کا وہی کیک ٹشو پیپر میں رکھ کر کھایا تھا جو دوسرے مزدور بھی کھا رہے تھے، مگر وہ فیکٹری کے بھوکے ننگے اور تھکے ماندہ مزدوروں سے اپنے آپ کو برتر سمجھ رہا تھا۔ اس کی برتری کی یہ نمائش دیکھ کر مجھے تکلیف ہوئی۔ میں اپنا لنچ نہیں لا سکی تھی اس لئے اتنی بھوکی تھی کہ ایک کے بعد ایک کیک ٹھونسے چلی جا رہی تھی۔ اس طرح کیک ٹھونسنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ جو بیہودہ آدمی ٹشو میں رکھ کر کیک کھا رہا تھا وہ برابر مجھے دیکھے جا رہا ہے۔

''اس طرح جلدی جلدی کیک کھانے کے بعد تمہیں پیاس نہیں لگ رہی ہے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا میں تمہارے لئے چائے کا کپ خرید سکتا ہوں؟''

اس کی اس پیش کش پر میں ہنس پڑی۔ اور ہنستے ہنستے مجھے پھندا لگ گیا۔

''یہ جملہ تم نے کہیں اور سنا ہوگا۔ یہ تو ایک احمق بھی جانتا ہے کہ چائے خانے میں چائے پلانے کی دعوت دے کر کسی لڑکی کو کیسے رجھایا جا سکتا ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ واقعی یہ مسخرہ پن ہی نظر آ رہا تھا۔ ''میں نے اور تم نے نہایت میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اور کھانے میں یہ سستے کیک کھا رہے ہیں۔''

چائے خانہ ہماری استطاعت سے باہر تھا۔ پھر بھی میں اس سیدھے سادے آدمی کے پھندے میں آ گئی۔ پھر ایک دن میں نے اسے اس خوانچہ فروش کے پاس نہ دیکھا تو میرا دل بیٹھنے لگا، جیسے میرا سارا دن کسی مقصد کے بغیر ہی گزر گیا ہو۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ اکیلا ہی رہتا ہے تو میں سمجھی کہ میری طرح اس کے بھی ماں باپ نہیں ہیں۔ چنانچہ میں نے اسے راضی کر لیا کہ میرے ساتھ رہا کرے۔ یہ ہے ساری کہانی کہ، میں سانگ ہون سے کیسے ملی، اور اس وقت سے ہم اکٹھے کیوں رہتے ہیں۔

ٹی بی کے مریض کے واقعے کے بعد بھی ہم ساتھ ہی رہتے رہے، حالانکہ کبھی کبھی تنگ آ کر میں سانگ ہون سے لڑ بھی لیتی تھی۔ ظاہر یہی کرتی تھی کہ میں تیس ہزار وان کی وجہ سے ناراض

ہوں مگر اصل میں یہ بات نہیں تھی۔ وہ جس لاابالی پن سے زندگی گزار رہا تھا اور ٹی بی کے مریض کی بالکل پروا نہیں کرتا تھا اس سے میرا دماغ جھنا جاتا تھا اور میں پریشان ہو جاتی تھی۔

ایک دن کچھ بتائے بغیر ہی سانگ ہون گھر نہیں آیا۔ اس کے دوسرے دن اور اس کے بعد تیسرے دن بھی نہیں آیا۔ میں برابر انتظار کرتی رہی۔ پھر ایک دن اپنی بے عزتی کی پروا کئے بغیر میں اس کے ورکشاپ پہنچ گئی۔ معلوم ہوا کہ اس نے وہاں بھی کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ مالک نے مجھے اور بھی ڈرا دیا۔ اس نے کہا کہ کہیں کوئی خوف ناک حادثہ ہو گیا ہوگا۔ اگر کوئی آدمی کہیں اور جاتا ہے تو وہ عام طور پر اگلے دن کی مزدوری سے پیشگی رقم ادھار مانگ لیتا ہے۔ بلکہ اس پر علاقے کی دکانوں کا قرض بھی ہوتا ہے۔ لیکن سانگ ہون نے تو اپنی مزدوری بھی نہیں مانگی۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کار سے اس کی ٹکر ہوئی ہے اور وہ مر گیا ہے، یا پھر کسی غنڈے نے اس کے چھرا گھونپ دیا ہے۔ اس کے اس طرح غائب ہونے کی یہی دو وجہ ہو سکتی ہیں۔

میں نے ان ہولناک واقعات پر غور کیا تو سوچتی ہی چلی گئی حتیٰ کہ میری نیند ہی اڑ گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں اور اس تک کیسے پہنچوں۔ میں نے سیول جیسے شہر کی وسعت کے بارے میں سوچا تو میرا خوف اور بھی بڑھ گیا۔ اتنے بڑے شہر میں اسے کہاں ڈھونڈتی۔ ہر رات میں پیر سکیڑ کر سوتی اور سوتے میں رات بھر روتی رہتی۔ لیکن صبح کو کام پر ضرور جاتی۔ کھانے پینے کے لئے کام کرنا بھی تو ضروری تھا۔ مجھے یہ خیال تسلی دیتا تھا کہ میں کام سے واپس آؤں گی تو وہ آ چکا ہوگا۔ میں اس یقین کے ساتھ کام کرتی رہتی کہ وہ آ گیا ہوگا۔ کام کے بعد سیدھی ڈھلان پر میں پاگلوں کی طرح بھاگتی دوڑتی جاتی اور سوچتی کہ اب میرے کمرے میں ضرور روشنی ہوگی۔ اس روشن توقع پر میں ہر دن پورے جوش و خروش کے ساتھ کام پر جاتی تھی۔

مجھے دھندلا سا خیال تھا کہ معجزے ہمیشہ اچانک ہی رونما ہو جاتے ہیں۔ کسی کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ یہ سوچ کر میں روزانہ اپنا کمرہ خالی چھوڑ کر جاتی کہ میرے پیچھے معجزہ رونما ہو جائے گا۔ حالانکہ یہ توقع بے کار ہی ثابت ہو رہی تھی اس کے باوجود میرے دل میں امید کی ایک کرن جگمگاتی رہتی تھی۔ میں اور کیا کرتی، انتظار ہی کر سکتی تھی۔

آخر ایک دن میرے کمرے میں روشنی نظر آئی۔ سانگ ہون سچ مچ آ گیا تھا۔ اس نے کسی گرم جوشی کے بغیر میرا استقبال کیا۔ وہ اچھے کپڑے پہنے تھا اور سر سے پیر تک صاف ستھرا دکھائی

MashalBooks.com

دے رہا تھا۔ اس وجہ سے وہ میرے کمرے میں بیٹھا غیر حقیقی سا نظر آ رہا تھا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اتنا شاندار انسان بن کر واپس آئے گا۔ میں تو یہ سوچتی تھی کہ وہ برے حالوں میں لوٹے گا۔ میں تو اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ میرا جی چاہا کہ کچھ دیر کے لئے میں وہاں سے بھاگ جاؤں، اور پھر واپس آؤں۔ اس طرح میں حالات پر قابو پالوں گی۔

''کیا ہوا تھا؟'' میں اتنا ہی پوچھ پائی۔ میری آواز بھرا گئی تھی جیسے میرے گلے میں بلغم اٹک گیا ہو۔ خود میرے کانوں کو بھی میری آواز اجنبی لگ رہی تھی۔

''اوہو۔۔۔ میں تمہارے پیسے واپس کرنے آیا ہوں۔ کتنے تھے وہ؟ تیس ہزار روان یا اس کے قریب؟'' اس نے بڑا مہربان بن کر یہ کہا۔ اس کا لہجہ کسی بینک والے کا، یا کسی تاجر کا تھا۔ ایک دم مجھے لگا کہ میرے دل میں اس کے لئے پیار کا جو جذبہ تھا وہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ میں عجیب سی الجھن میں پھنس گئی۔

اچانک اس کے کوٹ کے کالر پر چمکتی ہوئی کالج کی پن پر میری نظر پڑی۔ میز پر ایک موٹی سی کتاب بھی رکھی ہوئی تھی جو اس کی ہی معلوم ہوتی تھی۔ میرے دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔

''کیا واقعی تم پاگل ہو گئے ہو؟ تم نے چوری بھی شروع کر دی ہے؟ تم اپنے آپ کو کالج کا طالب علم ظاہر کر رہے ہو! پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟'' میں اس پر دہاڑی۔

میں سمجھی کہ یہ سب کچھ اس نے میرے لئے کیا ہے، میں تیس ہزار روان کے لئے اسے ہر وقت پریشان کرتی رہتی تھی نا۔ میں ڈر گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے دل کو کچھ ہوا اور وہ زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اب میں پھوٹ پھوٹ کر رونے اور اس کے بازوؤں میں گرنے ہی والی تھی۔ مگر اس نے نرمی سے مجھے پیچھے ہٹا دیا۔

''ٹھہرو ٹھہرو، یہ نہ کرو۔ اپنے آپ کو سنبھالو اور میں جو کچھ کہنے والا ہوں اسے غور سے سنو۔ میں پاگل نہیں ہوں اور نہ چور ہوں۔ میں ایک دولت مند آدمی کا لاڈلا بیٹا ہوں۔ اور کالج کا طالب علم ہوں، جیسے تم دیکھ رہی ہو۔ میرے باپ کچھ سنکی سے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا زندگی کی مشکلیں اور کٹھنائیاں جانے بغیر بڑا نہ ہو، اس لئے انہوں نے اسکول کی چھٹیوں میں مجھے ایک پیسہ دیئے بغیر ہی گھر سے نکال دیا۔ تاکہ میں برا وقت بھی دیکھ لوں اور دولت کی قدر بھی پہچان لوں۔ تم سمجھیں؟''

میں بھلا کیسے سمجھ سکتی تھی۔ میری ماں دوسروں کو یہ دکھا کر ہی خوش ہو جاتی تھی کہ دولت مند کس عیش و عشرت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں نے ماں کو یہ کہتے ہوئے تو سنا تھا کہ پیسہ بولتا ہے، پیسہ ہو تو آدمی دنیا میں کوئی بھی کام کر سکتا ہے اور دولت سے ہر عیش و آرام حاصل کیا جا سکتا ہے۔ البتہ میں نے یہ کبھی نہیں سنا تھا کہ کوئی دولت مند اپنے آپ کو غریب ظاہر کرنے کا کھیل بھی کھیلے گا۔

''میرے باپ حیرت انگیز انسان ہیں۔ وہ اتنے اچھے آدمی ہیں کہ اس زمانے میں ان جیسا انسان ملنا مشکل ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے بچے صرف عیش و عشرت ہی نہ دیکھیں بلکہ تکلیفوں اور مصیبتوں کی زندگی کا تجربہ بھی کریں۔ میں نے اسکول کی چھٹیوں میں واقعی نہایت قیمتی تجربے حاصل کئے ہیں۔ اور اس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ یہ اتنا بیش قیمت تجربہ ہے جسے کسی بھی دولت سے نہیں خریدا جا سکتا۔''

ہاں، اس پر مجھے کچھ یاد آ گیا۔ گڑیوں کے کپڑے بنانے والی آنٹی نے ایک واقعہ سنایا تھا جو انہوں نے ٹی وی پر سنا تھا۔ ایک بہت بڑے سرمایہ دار کے بیٹے نے اصلی دنیا کا تجربہ حاصل کرنے کے لئے پینے کا پانی یا اسی قسم کی چیزیں فروخت کرنا شروع کر دی تھیں۔ میرے خیال میں یہ نہایت ہی فضول کہانی ہے، خواہ وہ ٹی وی ڈرامہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ لوگ آخر غربت کو کیا سمجھتے ہیں کہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ مجھے اس کی بالکل پروا نہیں ہے کہ یہ دولت مند اپنی دولت سے کیا کرتے ہیں، البتہ وہ غربت کے ساتھ جو مسخرہ پن کرتے ہیں اسے معاف کرنے کو میرا دل نہیں مانتا۔ ایک غریب لڑکی کا مذاق اڑانے کو تو میں معاف کر سکتی ہوں لیکن خود غربت کے ساتھ کھلواڑ کرنا کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ وہ میری جیسی غریبی کا کبھی تجربہ ہی نہیں کر سکتے۔ غریبی تو میرا مقدر ہے۔

''میرے باپ اس بات سے مطمئن ہیں کہ میں نے اس عرصے میں بہت سی مصیبتوں اور مشقتوں بھری زندگی دیکھ لی ہے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے اب وہ اپنے دوستوں کو بھی مشورہ دیں گے کہ وہ اپنے بچوں سے یہی کام کرائیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آج کل لوگ اپنے بچوں کو بہت ہی عیش و آرام کے ساتھ پالنا چاہتے ہیں''۔

خدایا، یہ میں کیا سن رہی ہوں! گویا اب غریبی کا یہ کھیل اعلیٰ سوسائٹی میں مقبول ہوتا جائے

MashalBooks.com

گا۔ بیٹے کٹے موٹے موٹے بوڑھے اکٹھے ہوں گے اور اس طرح باتیں کریں گے۔'' آپ نے اپنے بیٹے کو ابھی تک نہیں بھیجا؟''

''نہیں' ابھی تو نہیں' مگر اسے پاسپورٹ ملنے ہی والا ہے۔''

''میرا مطلب اسے اس غیر اہم ملک امریکہ بھیجنے سے نہیں' اسے جھونپڑیوں میں بھیجنے سے ہے۔!''

سانگ ہون پھر بول رہا تھا۔'' اس لئے میں نے اپنے باپ کا اچھا موڈ دیکھ کر تمہارے بارے میں بھی بتایا۔ جب میں نے انہیں زندگی کی اصل حقیقت اور اصل حالات کے بارے میں بتایا، اور ان کے سامنے گندی جھونپڑیوں کی اصل تصویر رکھی تو تمہارا بھی ذکر کر دیا۔ بالکل ایسے ،جیسے یہ کوئی اہم بات نہ ہو۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہاں ایک عورت ہے جس نے کوئلے بچانے کے لئے ایک مرد کو ورغلایا کہ اس کے جسم کو گرمی پہنچانے کے لئے اس کے ساتھ بستر پر سویا کرے ۔ ہاں ہاں، میں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ مرد میں ہی ہوں جسے اس نے ورغلایا تھا۔ مجھے بالکل یہ توقع نہیں تھی، مگر میرے باپ نے اس میں بہت دلچسپی لی اور مجھ سے کہا کہ اس عورت کو یہاں بلا لو، وہ گھر کے کام کاج کر دیا کرے گی۔ انہوں نے کہا کہ اگر اس نے اچھا کام کیا تو پھر ہم اسے رات کے اسکول میں پڑھنے کے لئے بھی بھیج دیں گے۔ تمہارے لئے یہ بہت اچھا موقع ہے۔ تم اس نادر موقع سے فائدہ اٹھا کر مصیبت کی زندگی سے چھٹکارا پا سکتی ہو۔ تمہاری زندگی تو صرف تکلیف دہ ہی نہیں، شرم ناک بھی ہے۔ تمہیں شرم تو آتی ہوگی کہ صرف آدھے کوئلے بچانے کے لئے کسی مرد کو ورغلا کر اپنے بستر پر لے گئیں۔''

ہاں، میں شرمندہ ہوں، شرمندہ ہوں، شرمندہ ہوں، اتنی شرمندہ ہوں کہ شرم سے ہوا میں تحلیل ہو کر اڑ جانا چاہتی ہوں۔ میں سب کی نظروں سے غائب ہو جانا چاہتی ہوں۔ ہاں، میں شرم سے پانی پانی ہو رہی ہوں۔

''یہ تمہارے لئے کچھ پیسے ہیں۔ میں تمہیں لینے پھر آؤں گا۔ اپنے کپڑے وغیرہ تیار رکھنا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ مگر ان گندے غلیظ کپڑوں میں تو نہیں جا سکتیں۔''

میں نے وہ پیسے اس کے منہ پر دے مارے اور دھکے دے کر اسے کمرے سے نکالنے لگی۔ میں اتنی زور زور سے اسے برا بھلا سنا رہی تھی کہ برابر رہنے والی چھ کی چھ کرائے دار نیاں

ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی باہر آ گئیں۔ وہ اس ہنگامے میں جلدی جلدی بھاگنے لگا۔ وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ اس کے منہ سے بات بھی نہیں نکل رہی تھی۔ میں چیخ چیخ کر اسے الٹی سیدھی سنا رہی تھی۔

''بے چاری۔۔۔ پاگل ہو گئی ہے۔۔۔'' باہر جاتے ہوئے جب وہ جوتے پہن رہا تھا تو اس نے کہا تھا۔ وہ میری ہمدردی میں یہ کہہ رہا تھا، مگر میں جانتی تھی کہ وہ جلد ہی مجھے بھول جائے گا۔ جیسے وہ ٹی بی کے مریض کو بھول گیا تھا۔

میں نے اسے جس طرح کمرے سے نکالا تھا اور اس کے پیسے لینے سے انکار کیا تھا اس پر مجھے فخر محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن میرا کمرہ اب وہ نہیں تھا جو چند منٹ پہلے تھا۔ اب مجھے کچھ اور ہی نظر آ رہا تھا۔ چھت پر لگے ہوئے کاغذ پر بارش اور سیلن سے دھبے پڑ گئے تھے اور وہ ایک کنارے پر بری طرح پھول بھی گیا تھا۔ دیوار کا گندا کاغذ کہیں کہیں سے پھٹ گیا تھا اور دیوار ننگی ہو گئی تھی۔ وینائل کے سوٹ کیس کی زپ ٹوٹی ہوئی تھی، سستے فارمیکا کی میز کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی، ٹرانسسٹر ریڈیو اپنے سے بڑی بیٹری کے ساتھ لگا ہوا تھا اور برتنوں میں گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ یہ سب چیزیں اگرچہ اپنی جگہ ہی رکھی ہوئی تھیں مگر وہ کل کی چیزیں نہیں تھیں۔ وہ سب بے کار اور بے معنے دکھائی دے رہی تھیں۔ کل تک وہ میری غریبی کا پتہ دیتی تھیں۔ اور آج وہ سوائے فضول اور بدشکل چیزوں کے اور کچھ نہیں تھیں۔

مکان گر جائے تو وہ لکڑی جس سے وہ بنایا گیا تھا، اس کی چھت کی سلیٹ، مٹی گارہ، کنکریٹ کے بلاک اور دروازے سب کوڑے کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔ میرا وہ سامان جو میری غریبی کا حصہ تھا اب میرے لئے بیکار سا ڈھیر بن چکا تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں ان سب چیزوں کو دوبارہ کوئی معنی بھی دے سکوں گی۔ اب تو کمرے میں میری غریبی بھی موجود نہیں تھی۔ وہ غریبی جس نے ان تمام چیزوں کو ایک بامعنی وجود بخشا تھا۔ سانگ ہون نے میری غریبی چوری کر لی تھی۔ میری غریبی، میری غریبی کے معنی، اب میں اسے واپس کیسے لاؤں گی۔

اپنے خاندان کی بدقسمتی کی وجہ سے میں خوب جانتی تھی کہ یہ امیر لوگ کتنے لالچی ہوتے ہیں۔ میں ان دولت مندوں کی سرشت سے اچھی طرح واقف تھی جو ہر دم ننانوے کے پھیر میں رہتے ہیں۔ لیکن میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ دولت مند کبھی غریبی سے بھی پیار کریں گے۔ وہ اپنی شاندار تدریسی زندگی اور آرام دہ طرز حیات سے مطمئن نہیں ہوں گے اور وہ غریبی کی

MashalBooks.com

چوری بھی کرنے لگیں گے، تاکہ اپنی ست رنگی زندگی کو اور بھی رنگین بنالیں۔ ان کی اس خواہش کی شدت کا مجھے اندازہ ہی نہیں تھا۔

جب میری غریبی چرالی گئی تو مجھے پہلی بار شدید مایوسی کا احساس ہوا۔ ایسا احساس تو مجھے اس وقت بھی نہیں ہوا تھا جب میرا خاندان اپنی ہر چیز سے محروم ہو گیا تھا۔

جیسے کوڑے کے ڈھیر پر ایک اور بے کار چیز پھینک دی جائے ویسے ہی میں نے اپنے آپ کو کمرے میں پھینک دیا۔ اجاڑ بیابان کے بیچوں بیچ۔ میں نے اپنا سارا وجود ہڈیاں منجمد کرنے والی سردی کے حوالے کر دیا۔

ڈوبتے سورج کی تصویر

مسٹر چو اور ان کی بیوی گرین بیلٹ میں رہتے تھے۔ سیول کے گرد و غبار اور دھوئیں سے دور۔ چونکہ اس علاقے میں نئی عمارت بنانے یا کسی عمارت میں توسیع کرنے کے لیے مشکل سے ہی اجازت ملتی تھی اور پھر وہاں ٹرانسپورٹ کی سہولت بھی نہیں تھی اس لیے گرین بیلٹ میں مکانوں کی قیمتیں کم تھیں۔

ہوا صاف ستھری اور تازہ تھی۔ کسی بھی ایسے جوڑے کے لیے یہ نہایت ہی موزوں جگہ تھی جس کا شوہر ریٹائرڈ ہو گیا ہو، اسے وقت پر دفتر جانے اور وقت پر ہی واپس آنے کی اب ضرورت نہ ہو اور بوڑھی بیوی باغبانی کا شوق پورا کرتی ہو۔ کبھی کبھی ہی مسٹر چو یا ان کی بیوی کسی کام سے گھر سے نکلتے تھے اور تھکے ہارے واپس آجاتے تھے۔ بازار جاتے ہوئے انہیں کئی بسیں بدلنا پڑتی تھیں۔ مگر وہ اپنی تھکن کا الزام سیول کی گندی ہوا کو ہی دیتے تھے۔ ان کے گھر سے جو پہاڑی نظر آتی تھی اس کی طرف منہ کر کے وہ گہری گہری سانسیں لیتے تھے اپنے گھر کے اندر صرف ایک دن ہی انہیں صحت مند کر دیتا تھا۔ انہیں لگتا تھا جیسے ان کے پھیپھڑوں سے سیول کا سارا گرد و غبار صاف ہو گیا ہے۔

مسٹر چو اگلے سال اپنی ساٹھویں سالگرہ منانے والے تھے۔ ان کی بیوی اٹھاون برس کی ہونے والی تھیں۔ اگرچہ وہ اپنی عمر کے اس حصے میں پہنچ گئے تھے جہاں بڑھاپے کی بیماریاں پریشان کرنے لگتی ہیں لیکن وہ دونوں خوب صحت مند تھے۔ ان کے کالے بال گھنے بھی تھے اور چمک دار بھی۔ کبھی کبھی دونوں میں سے کسی کے سر میں اکا دکا سفید بال نظر آتے تو اسے رنگنے کے

MashalBooks.com

بجائے نکال دیتے تھے۔ میاں بیوی کے بال نکالتا اور بیوی میاں کے۔ اردگرد کے لوگ ان پر رشک کرتے تھے۔ یہ لوگ یا تو کسان تھے جو دن رات اپنی زمینوں پر محنت کرتے تھے یا غریب مزدور تھے۔ گاؤں کے وہ باشندے جو وقت سے پہلے ہی بوڑھے ہو گئے تھے ان میاں بیوی کی اصل عمر سنتے تو حیران رہ جاتے۔ وہ ان کی صحت دیکھ کر ان سے جلتے بھی تھے۔ لیکن تمام میاں بیوی ان کے بارے میں ایسے جذبات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دیہات میں آنے کی وجہ سے وہ دوبارہ جوان ہو گئے ہیں۔

انہیں مالی پریشانی بھی نہیں تھی۔ مسٹر چو سرکاری دفتر میں کئی عشرے کام کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے تھے۔ انہیں پنشن ملتی تھی۔ ان کے مرنے کے بعد ان کی بیوی اس پنشن کی حق دار تھی۔ کفایت شعاری کے ساتھ زندگی گذارنے والے جوڑے کے لیے یہ پنشن کافی تھی۔ بلکہ اس سے ان کے اندر بڑھاپے میں تحفظ کا احساس رہتا تھا۔ ان کے چار بچے تھے۔ دو لڑکے دو لڑکیاں۔ یہ بچے ان کے لیے فخر اور خوشی کا باعث تھے۔

انہیں اپنی زندگی میں اتنا سکون اور اطمینان پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے مسٹر چو چھوٹے سے سرکاری افسر تھے۔ اس ملازمت میں انہیں کئی بار بڑے افسروں سے زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں ملازمت برقرار رکھنے کے لیے بے عزتی بھی برداشت کرنا پڑی۔ اور یہ مدت کافی طویل ہوتی تھی۔ زیادہ افسوس کی بات یہ تھی کہ اسی زمانے میں انہیں بچوں کی پڑھائی پر بھی رقم خرچ کرنا ہوتی تھی ان کے دو بچے کالج میں پڑھ رہے تھے۔ ایسے ہی وقت کسی بچے کی شادی ہوتی تو کسی بچے کو کالج میں داخل کرانا ہوتا۔ دو سال کے اندر اندر انہیں اپنا گھر فروخت کرنا پڑ گیا تھا اور وہ ایک چھوٹے سے گھر میں چلے گئے تھے۔ آخر انہیں بچوں کی ضرورتیں بھی تو پوری کرنا تھیں۔ اور پھر جب سب سے چھوٹی بیٹی کی شادی ہوئی تو انہیں اپنا چھوٹا مکان فروخت کر کے سیول سے باہر آنا پڑ گیا۔ یہاں آنے کے بعد انہیں سکون میسر آیا۔ اب وہ بچوں کی مالی مدد بھی نہیں کرتے تھے۔ جب یہ مکان خریدا تو مسٹر چو کی ریٹائرمنٹ قریب تھی اس لیے انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ خوش ہوئے کہ دفتر کی جھک جھک سے انہیں نجات ملنے میں چند دن ہی رہ گئے ہیں۔ وہ گھر ان دونوں کے لیے واقعی ایک نعمت تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مسٹر چو کو خالی وقت مل گیا تھا۔ اب انہیں کوئی پریشانی نہیں تھی۔

مکان بہت پرانا تھا اور خاصے تکلیف دہ انداز میں تعمیر کیا گیا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنا کافی وقت اس کی مرمت میں صرف کیا۔ شروع میں تو مسٹر چو نے جب اس طرف توجہ کی تو انہیں بجلی کا فیوز لگانا بھی نہیں آتا تھا۔ لیکن وقت گزارنے کے ساتھ وہ ہر کام کے ماہر ہو گئے تھے۔

مسٹر چو ہر کام خوشی خوشی کرتے تھے ان کی بیوی بھی ہشاش بشاش رہتی تھی۔ انہوں نے مجبوری سمجھ کر گھر کی مرمت کا کام شروع کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اندر اور باہر سے گھر کو خوبصورت بنا دیا جائے گا۔ چھت ٹپکتی تھی انہوں نے اسے ٹھیک کیا۔ اوٹڈول (کوریا کا روایتی فرش) کے پائپ نکال کر گرم پانی کے پائپ لگائے اور ہر دیوار کو سردی سے بچانے کا انتظام کیا۔ اس کام کے لیے پیشہ کاریگر کی ضرورت تھی مگر انہوں نے خود ہی یہ کام بھی کر لیا۔ ان کے لیے سب سے بڑا چیلنج کوریا کے روایتی گھر کا ڈھانچہ تبدیل کرنا تھا۔ شروع میں تو ان کا خیال تھا کہ وہ یہ کام نہیں کر سکیں گے۔ لیکن جب انہیں اندازہ ہوا کہ وہ تو بڑھئی اور مستری کا کام بھی کر سکتے ہیں تو وہ اپنا کام بڑھاتے گئے۔ وہ جانتے تھے کہ ایک عورت کے لیے کوریا کے روایتی گھر میں رہنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہ بات انہیں اس وقت معلوم ہوئی تھی جب وہ کوریا کے روائتی گھر سے شہر کے ایک جدید گھر میں منتقل ہوئے تھے اور ان کی بیوی نے اس پر انتہائی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ انہیں یاد تھا کہ ان کی بیوی خوشی سے پاگل ہو گئی تھیں۔ کوریا کے روائتی گھروں کا حال یہ ہے کہ وہ چاہے خوش حال علاقوں میں ہوں یا غریب محلوں میں سب ایک ہی انداز میں بنائے جاتے ہیں' نسل در نسل ایسے ہی مکان بنتے چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے نئے مکان کی مرمت کر لی تو انہیں احساس ہوا کہ کوریا کے روائتی گھر نہایت چالاکی کے ساتھ عورتوں کو سزا دینے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ مسٹر چو اپنی بیوی سے محبت کا اظہار زبان سے نہیں کرتے تھے۔ گھر کی مرمت اور اس میں تبدیلیاں کرتے ہوئے وہ یہ سوچتے تھے کہ اگر میری جگہ یہاں میری بیوی ہوتی تو وہ کیسا محسوس کرتی' گھر کی مرمت اور اس کی آرائش کرتے ہوئے وہ اس میں اتنا کھو گئے تھے کہ آخر میں یہ اندازہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ وہ اپنی بیویں سے زیادہ محبت کرتے ہیں یا اس گھر سے وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے اپنی بیوی کو بستر مرگ پر دیکھا تو وہ بھی خوشی خوشی موت کو گلے لگا لیں گے۔ اسی طرح جب وہ یہ سوچتے تھے کہ ان کی زندگی کا یہ آخری مکان ہے وہ انتہائی سکون محسوس کرتے۔

MashalBooks.com

مسٹر چو کو مذہب کے ساتھ کوئی خاص لگاؤ تو نہیں تھا۔ لیکن وہ سوچتے تھے کہ اگر مرنے کے بعد واقعی روح بھٹکتی پھرتی ہے تو چاہیں گے کہ ان کی روح اعراف میں چلی جائے۔ انہیں یقین نہیں تھا کہ وہ جنت میں جائیں گے۔ انہیں جہنم سے ڈر لگتا تھا اور سوچتے تھے کہ وہاں انہیں خطرناک سزائیں دی جائیں گی۔ اپنی ملازمت کے دوران انہوں نے کئی ایسے آدمی دیکھے تھے جو ان سے زیادہ دوسروں کا خیال رکھتے تھے۔ ان کا تعلق ایسے لوگوں سے بھی رہا تھا جو دوسروں کو نقصان پہنچاتے تھے۔ وہ چونکہ ان دونوں طبقوں کے بیچ میں تھے۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو اعراف کا مستحق سمجھتے تھے۔

مسز چو کیتھولک عیسائی تھیں۔ مسٹر چو نے انہیں انہیں عالم برزخ اور اعراف کی دعائیں پڑھتے سنا تھا۔ اس لیے ان کی اپنی خواہش بھی وہیں جانے کی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ مرنے کے بعد وہ اپنی بیوی کی توجہ اور محبت کا مرکز ہی رہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی بیوی کی دعاؤں کی اور عبادتوں کی وجہ سے انہیں بھی جنت مل جائے۔ جس طرح وہ اپنی روح کے لیے بیچ کا راستہ چاہتے تھے اسی طرح وہ سمجھتے تھے کہ وہ ان کا گھر نہ تو ان کی مالی استطاعت سے اوپر ہے اور نہ نیچے۔ وہ مکان باہر سے تو بدلا ہوا نہیں لگتا تھا لیکن اندر سے وہ جتنا آرام دہ ہو گیا تھا اس سے اس کے مالک کی مہارت اور اس کے لگاؤ کا اظہار ہوتا تھا۔

اس مکان کی مرمت میں مسٹر چو کا کافی وقت لگا تھا لیکن وہ اس کام سے اکتائے نہیں تھے۔ اور نہ ان کی زندگی بے معنی ہوئی تھی۔ ہر صبح وہ پہاڑی چشمے پر جاتے اور وہاں سے پینے کا پانی لاتے تھے پہاڑی پر چڑھنا ان کے لیے ایک قسم کی ورزش بن گیا تھا آچا گاؤں پہاڑی کی ترائی میں تھا۔ وہ دو بونگ پہاڑی' کو ایک پہاڑی یا پھر کھان پہاڑی کی طرح مشہور تو نہیں تھی مگر آچا پہاڑی پر بھی بہت سے پرانے آثار تھے۔ قریب ترین چوٹی تک جانے والا راستہ بہت ہی خوبصورت تھا۔ اور چوٹی پر سیاحوں کے لیے سہولتیں موجود تھیں۔ وہ چوٹی سب سے اونچی نہیں تھی اور گاؤں سے ایک کلومیٹر سے بھی کم فاصلے پر تھی۔ مسٹر چو سے بڑی عمر کے لوگ بھی وہاں جا سکتے تھے۔ چھٹی کے دنوں میں سیول سے بھی وہاں لوگ آتے تھے۔ پورے پورے خاندان وہاں آجاتے تھے اور بہار اور جاڑوں کے دنوں میں جب مطلع صاف ہوتا تو وہاں پکنک مناتے تھے۔ ان موقعوں پر ساری وادی بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو اور گانے بجانے کی آوازوں سے بھر

جاتی تھی۔

تفریح کرنے والے لوگ وہاں سے چلے جاتے تو مسٹر چو ہاتھ میں پلاسٹک کی ٹوکری اور لوہے کی سلاخ لے کر وہاں پہنچ جاتے تھے۔ اور وہ چیزیں اٹھاتے پھرتے جو وہ لوگ وہاں پھینک جاتے تھے۔ وہ یہ کام بلاناغہ کرتے تھے۔ جب سیاحت کا موسم اپنی بہار پر ہوتا تو مسٹر چو کو دن میں کئی بار صفائی کے لیے پہاڑی پر جانا پڑتا تھا۔ لیکن وہ کبھی جلدی میں نہیں ہوتے تھے۔ وہ اطمینان کے ساتھ اپنا کام کرتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ گاؤں کے دوسرے بزرگ بھی ان کا ہاتھ بٹانے وہاں پہنچ جاتے حالانکہ مسٹر چو ان سے کبھی مدد نہیں مانگتے تھے۔

مسٹر چو تو چاہتے تھے کہ یہ کام وہ اکیلے ہی کریں۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس کام پر وہ اپنی اجارہ داری چاہتے تھے بلکہ اس کا مقصد کچھ اور تھا۔ وہ اپنی مرضی سے اور اپنی رفتار سے یہ کام کرنا چاہتے تھے۔ دوسروں کے ساتھ کام کرنا انہیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ کیونکہ اس وقت انہیں ان لوگوں کے مزاج کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ لوگ بولتے بھی بہت تھے۔ جب بھی وہ زیادہ گندگی دیکھتے تو الٹی سیدھی باتیں شروع کر دیتے۔ وہ سیاحوں کو برا بھلا کہتے۔ کسی کو حرام زادہ' کسی کو کتے کا بچہ اور کسی کو ٹھگ اور ڈاکو کہتے۔ وہ کہتے ان لوگوں نے تو پہاڑی کو کوڑا گھر بنا دیا ہے۔ کیا وہ سمجھتے ہیں یہ ان کا کوڑا گھر ہے۔ وہ کام کرتے جاتے اور بولتے جاتے۔

ان لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنا مسٹر چو کے لیے بہت مشکل تھا۔ ان کی بات سن کر وہ کہہ دیتے۔ ''میں سمجھ رہا ہوں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' یا پھر ''ہاں ہاں' میں نے سن لیا۔'' اپنی ملازمت کے دوران بھی انہوں نے یہی سیکھا تھا۔ دوسروں کو خوش کرنے کا یہی طریقہ تھا۔ لیکن اب وہ ایسا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ دوسروں کا ساتھ بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد صرف اپنی بیوی کے ساتھ ہی وہ مطمئن تھے۔ وہ کسی اور کا ساتھ نہیں چاہتے تھے۔ ان کی بیوی اتفاق سے ہی کبھی ان کا سکون برباد کرتی تھیں۔ وہ باورچی خانے میں اپنی بیوی کی مدد کرتے تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہ مٹر کی پھلیوں کے ڈنٹھل کاٹتے یا ہری پیاز کا چھلکا اتارتے۔ انہیں رکابیاں دھونے میں بھی مزہ آتا تھا۔ سب سے زیادہ انہیں اپنی بیوی کو پھولوں کی کیاریوں میں کام کرتے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ اپنے مطالعے کے کمرے میں بیٹھے وہ گھنٹوں چھوٹی سی کھڑکی سے اپنی بیوی کو کام کرتے دیکھتے رہتے تھے۔

MashalBooks.com

جس طرح انہوں نے خود ہی اپنے ذمہ پہاڑی صاف کرنے کی ڈیوٹی لگائی تھی اس طرح ان کی بیوی پھولوں کی کیاریوں کی دیکھ بھال کرنا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کے کام میں دخل نہیں دیتے تھے بلکہ وہ تعریف کرتے تھے ایک دوسرے کے کام کی۔

مکان بریکٹ کی شکل میں بنا ہوا تھا۔ سامنے کے صحن میں جہاں دھوپ آتی تھی وہاں انہوں نے ایک فرش بنایا تھا جہاں سویابین کے مرتبان رکھے ہوئے تھے۔ باقی مکان سائے میں تھا۔ شہر کے مکان کے مقابلے میں اس مکان میں بیرونی دروازے کے زیادہ کھلی جگہ تھی۔ مکان کی رجسٹری کے مطابق اس کا رقبہ 78 پیونگ (اندازاً 312 مربع گز) تھا۔ مکان تعمیر شدہ رقبے اور سامنے کے صحن کو چھوڑ کر باقی زمین' پیچھے سبزیوں کی کیاریاں وغیرہ 40 پیونگ (اندازاً 160 مربع گز) سے بھی کم تھی۔ مکان چونکہ گاؤں کے سرے پر تھا اس لیے اس کے سامنے اور کوئی مکان نہیں تھا۔ اس لیے ان کا مکان اصل رقبے سے بھی زیادہ بڑا لگتا تھا۔

مسٹر چو نے لکڑی کے منڈوے پر گلاب کی بیلیں چڑھائی تھیں جو مکان کے ہر طرف پھیلتی چلی گئی تھیں۔ باہر جو جافری لگی تھی اس کے ساتھ ہی پہاڑی کی چڑھائی شروع ہو جاتی تھی۔ اس سے آگے چوٹی نظر آتی تھی۔ ایک طرف میدان تھا۔ اس سے آگے درختوں کے جھنڈ تھے۔ وہ جب گھر کے باہر کھڑے ہوتے' جہاں کا رخ جنوب کی سمت تھا تو دور تک جھاڑ جھنکار سے بھرا میدان اور پھر ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ نظر آتے۔ ایسا لگتا جیسے وہ سب بھی ان کے صحن کا ہی حصہ ہے۔

موسموں کے ساتھ میدان اور جنگل میں نہایت خوش گوار تبدیلیاں آتی رہتی تھیں۔ یہی خوش نما مناظر دیکھ کر مسٹر چو اور ان کی بیوی نے منہ مانگی قیمت پر یہ مکان خرید لیا تھا۔ حالانکہ لوگوں نے کہا تھا کہ جگہ کے اعتبار سے اور پھر مکان کی اپنی حالت کے حساب سے یہ قیمت بہت زیادہ ہے۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ اس علاقے کی خوبصورتی کے لحاظ سے انہیں یہ بہت اچھا مکان مل گیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس میدان اور جنگل کا مالک بھی سمجھتے تھے۔ جہاں وہ اپنی مرضی سے خوب گھومتے پھرتے تھے۔ اس لیے قیمت وغیرہ سب بے معنی بات تھی۔

ان کے ہاں مہمان آتے تو وہ گھر کے اندر لے جانے سے پہلے انہیں یہ خوبصورت منظر دکھاتے۔ گھنا جنگل پہاڑی کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ جیسے کسی نے ہری بھری باڑھ لگا دی

ہو۔ پہاڑی کے کنارے پر تیکھی ڈھلان تھی لیکن وہ تنگ گھاٹی مسٹر چو کے مکان سے دور تھی۔ وہ چوٹی جس کے قریب بیٹھے پانی کا چشمہ تھا مسٹر چو کے مکان سے دور تھی۔ وہ چوٹی جس کے قریب میٹھے پانی کا چشمہ تھا مسٹر چو کے مکان کے مغرب کی طرف تھی۔ اس وجہ سے ان کے لیے سورج جلدی ڈوب جاتا تھا۔ بس یہی ایک خرابی تھی۔ اس کے باوجود مکان کی اہمیت اپنی جگہ تھی۔

بہار میں پہاڑی پر بے شمار جڑی بوٹیاں نکل آتی تھیں۔ جنہیں مقامی لوگ سبزی ترکاری کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ان جڑی بوٹیوں کے بارے میں مسٹر چو اور ان کی بیوی اتنا نہیں جانتے تھے جتنا مقامی باشندے جانتے تھے۔ مسٹر چو اور ان کی بیوی نے بھی ان لوگوں سے سیکھ کر یہ جڑی بوٹیاں نکالیں اور انہیں پکایا۔ لیکن وہاں کے خوشبودار پھولوں کے بارے میں صرف مسٹر چو ہی جانتے تھے۔ بہار کے موسم میں ان پھولوں سے ساری وادی مہک اٹھتی تھی۔

ان خوبصورت پھولوں کا تختہ وہ وادی ہی تھی۔ وہ پھول پتوں کے اندر چھپے ہوئے تھے۔ ان چھوٹے چھوٹے سفید پھولوں کے سر نیچے کی طرف جھکے ہوئے تھے پھر بھی ان کی مہک دور دور تک جاتی تھی۔ پہلی بار جب وہ وادی میں گئے تھے تو اس خوشبو نے انہیں اتنا مسحور کر دیا تھا کہ انہیں ڈر لگتا تھا کہ کہیں وہ وہیں نہ رہ جائیں۔

مسٹر چو جانتے تھے کہ گاؤں کے لوگوں سے ان پھولوں کے بارے میں کچھ پوچھنا بے کار ہے۔ بلکہ ان کا خیال تھا کہ ان لوگوں کو تو علم ہی نہیں ہوگا کہ وہاں وہ پھول بھی ہیں اور اگر انہیں علم بھی ہوا تو وہ ان سے کیا خوش ہوں گے۔ یہ تو مسٹر چو ہی تھے جو ان پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ گاؤں والوں کے لیے تو جب تک کوئی پھول دوائی کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا اس وقت تک وہ بے کار ہے مسٹر چو نے فیلڈ گائیڈ سے اس پھول کا نام معلوم کیا۔ پھر انہیں پتہ چلا کہ گھنٹی نما اس پھول کا کیا نام ہے۔

بہار کے آتے ہی سارا جنگل ہرا بھرا ہو جاتا۔ درختوں کے پتے دھوپ میں چمکنے لگتے تھے۔ اس ہرے بھرے جنگل میں جب جھینگر بولتے تو مسٹر چو کو خالی خالی پن کا احساس اور بھی بڑھ جاتا۔ پھر زندگی کی قدر و قیمت اور چیزوں کے معانی تلاش کرنے کا احساس جیسے رخصت ہو جاتا۔ حالانکہ ساری عمر وہ انہیں معانی پر اعتماد چلے آئے تھے۔ انہیں لگتا جیسے کوئی ان کا مذاق اڑا رہا ہے۔ جیسے کوئی قہقہے لگا رہا ہے۔

MashalBooks.com

بڑے بڑے پتوں پر بارش کی بوندوں کے ساتھ جاڑوں کا موسم آجاتا اور اس کے ساتھ اداسی کا احساس بھی۔ اب ہر روز پتوں کا رنگ بدلنا شروع ہوجاتا' جیسے وہ اپنے مرجھانے کا عمل روکنے کی کوشش کررہے ہوں۔ اس وقت جنگل اپنی دم بخود کردینے والی خوبصورتی کی معراج پر ہوتا۔ اس موسم میں پیڑ پوری طرح تبدیل نہیں ہوتے تھے۔

آدھی رات کو ہلکی سی ہوا بھی یہ پتے شاخ سے جدا کردیتی۔ پتے گرنے کی آواز سے ایسا لگتا جیسے جنگل بین کررہا ہو۔ یہ آواز سن کر مسٹر چو بستر پر کروٹیں بدلنے لگتے۔ سوتے میں پیشاب کردینے والے بچے کی طرح ان کے اندر بھی اپنی تنہائی اور ننگا ہونے کا احساس بڑھ جاتا۔ اس وقت وہ اپنی بیوی کے کمرے میں چلے جاتے اور اس کے مرجھائے ہوئے سینے پر سر رکھ کر لیٹ جاتے۔ کافی دیر اس طرح پڑے رہتے اور اس کے گرم گرم جسم سے گرمی حاصل کرتے رہتے۔

اب جاڑے آنے والے تھے۔ ایک برف باری جلدی میں ہوچکی تھی۔ اس نے شاخوں سے پتے گرنے کا عمل تیز کردیا تھا۔ اس کی پرشور سانس نے کھڑکیوں کے پٹ ہلا دیے تھے۔ اور لوگوں کو خبردار کردیا تھا کہ آنے والے جاڑوں کے لیے تیاری کرلیں۔ اس سانس کے جاتے ہی پہلی برف باری ہوگئی تھی۔ ہر ننگی شاخ کی اپنی ہی شکل تھی' ڈھیلی ڈھالی' سخت' آسمان کی طرف اٹھی ہوئی یا زمین کی طرف جھکی ہوئی۔ بہت بڑے جال کی طرح ننگی شاخوں نے میدان' جنگل اور گھاٹی کو بھی عریاں کردیا تھا۔

شاندار خزاں کی تمکنت سے پتوں کا رنگ کتھئی ہوگیا تھا اور وہ خاموشی کے ساتھ زمین پر گرنے لگے تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ کس طرح اس عظیم الشان طریقے سے تمام پیڑ عریاں ہوجاتے ہیں۔ جاڑوں کے ان پیڑوں سے مسٹر چو بھی بہت متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ننھے منے پھولوں کے پودے پیڑوں سے گرنے والے پتوں کے ڈھیر تلے دب گئے ہیں۔ ان کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹے لیٹے یا بیٹھ کر پڑھتے رہتے تھے۔ معلوم نہیں یہ ان کے فالتو وقت کی وجہ سے تھا یا ان کے مزاج کی وجہ سے انہیں جاڑوں کے موسم کے پیڑوں سے خاص لگاؤ پیدا ہوگیا۔ وہ خالی وقت میں وہ پیڑ دیکھتے رہتے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ہر موسم میں ان کے پاس وقت ہی وقت تھا۔

اچانک پہاڑی نے وادی پر حملہ کردیا۔ اس کے سائے نے جنگل اور دریا کے اس کنارے کو

گھیر لیا جدھر دھوپ پڑتی تھی۔ ان کی بیوی شادی پر جانے سے پہلے ہدایت کرگئی تھیں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی کا خیال رکھنا۔ اس کے بعد سے وہ ہر آواز پر چونک جاتے تھے۔ ایک لمحہ پہلے گھنٹے نے صرف تین بجائے تھے پھر بھی سورج ڈوبنے لگا تھا۔ اگر یہ موسم نہ ہوتا تو ابھی سورج سر پر ہی ہوتا۔

پہاڑی کا سایہ کسی منحوس گھڑی کی طرح تیزی سے پھیلتا گیا تھا مسٹر چو نے چار بجنے کی آواز نہیں سنی تھی۔ اس لیے وہ ڈرائنگ روم میں گئے اور چار بجنے کی آواز کا انتظار کرنے لگے۔ انہوں نے اپنے مطالعہ کے کمرے کو دنیاوی آلائشوں سے پاک رکھا تھا۔ وہاں ٹیلی فون ریڈیو یا گھڑی تک نہیں تھی۔ اب اگر وہ اپنی بیوی کو بتاتے کہ دن بھر کوئی ٹیلی فون نہیں آیا تو وہ بالکل اعتبار نہ کرتی۔ پھر بھی وہ بے چین تھے۔ شاید وہ گھنٹے کی آواز نہیں سن سکے تھے۔ ہوسکتا ہے انہوں نے ٹیلی فون کی گھنٹی بھی نہ سنی ہو۔ جیسے کوئی بچہ ہوم ورک نہ کرنے کے بہانے ڈھونڈتا ہے اور ایسی دلیلیں دیتا ہے جن پر اس کے سوا اور کوئی اعتبار نہیں کرسکتا ویسے ہی مسٹر چو بھی بیوی کی غیر موجودگی میں اپنے آپ کو سمجھاتے رہے کہ ان کے کان تو اسی طرف لگے تھے کسی کا ٹیلی فون ہی نہیں آیا۔ اگر گھنٹی بجتی تو وہ ضرور سنتے۔

اچانک چڑیوں کا ایک جھنڈ درختوں سے اڑا اور آسمان کی طرف اڑتا چلا گیا۔ کیا یہ گوریاں تھیں؟ ان کا رنگ سوکھے پتوں کا سا تھا؟ کیا اس خالی' ٹھنڈی اور پتلی شفاف برف کے اندر کشش ثقل نے اپنے آپ کو چھپا رکھا ہے؟ ان کے خیال میں چڑیاں اپنے پر پھڑ پھڑائے بغیر ایسے اڑتی چلی گئی تھیں جیسے گھڑیال کا پنڈولم چلتے چلتے اپنی جگہ سے اکھڑ کر اڑ گیا ہو۔ پھر خلا میں بے قابو رفتار کے ساتھ ایسے غائب ہوگئیں جیسے ہوا کے ان دیکھے قالین پر بیٹھی ہوں۔

مسٹر چو جنگل اور پیڑوں کے بارے میں تو بہت کچھ جان گئے تھے مگر انہوں نے کسی پیڑ پر گھونسلا نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ انہوں نے کوئی چڑیا بھی نہیں دیکھی تھی۔ شاید یہ چڑیا دانے دنکے کی تلاش میں کہیں اور سے یہاں آگئی ہوں گی؟ انہوں نے سوچا۔ یا پھر یہ موسم کے ساتھ اپنے رنگ بدلتی رہتی ہیں؟ بہار میں ہرا' خزاں میں سوکھے پتوں کی طرح اور جاڑوں میں برف جیسا سفید تاکہ وہ آسانی سے پیڑوں کے پتوں میں چھپ سکیں۔ اب وہ کہاں چلی گئیں؟ کھلے آسمان میں ان کا نشان تک نظر نہیں آرہا ہے۔

چڑیوں کے جھنڈ کو اڑتا دیکھ کر مسٹر چو کے دل پر خوف سا چھا گیا جو کافی دیر برقرار رہا۔ سکون

MashalBooks.com

اور اطمینان کے اس عرصے میں بھی مسٹر چو کو بدشگونی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ جیسے چڑیوں کا اچانک اس طرح اڑنا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہی چڑیاں اچانک زمین کے اندر سے نکلیں اور ان کی طرف اڑتی ہوئی آ جائیں۔ بے بس ہو کر وہ اپنے خیالوں میں کھو گئے۔

مسٹر چو کو ڈرائنگ روم سے گھنٹہ بجنے کی آواز آئی۔ یہ چار تھے یہ وقت ان کی بیوی کے واپس آنے کا۔ وہ شادی میں گئی تھیں جو بارہ بجے ہونے والی تھی۔

''شادی کے بعد میں بازار جاؤں گی۔ واپسی پر کھانا پکانے کے لیے کافی وقت ہوگا۔ اس لیے مہربانی کر کے خود نہ پکانے لگنا۔ اگر لوگوں نے تمہیں باورچی خانے میں دیکھ لیا تو باتیں بنائیں گے۔'' ان کی بیوی نے جانے سے پہلے ان سے کہا تھا۔

''تم کن لوگوں کی بات کر رہی ہو؟'' انہوں نے سوال کیا تھا۔

ان کی بیوی اس بات سے خوش ہوتی تھیں کہ مسٹر چو ان کے ساتھ مل کر کام کریں۔ لیکن وہ انہیں اکیلا باورچی خانے میں کام کرتے نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ بیوی کا خیال تھا کہ اس طرح وہ اجنبی لوگوں کی نظر میں قابل رحم معلوم ہوں گے۔ مگر مسٹر چو کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس گھر میں انہیں کون دیکھ سکتا ہے جہاں صرف وہ دونوں ہی رہتے ہیں۔ کن لوگوں کی بات کر رہی ہو؟ لیکن کبھی کبھی انہیں یہ بھی خیال آتا کہ شاید لوگ انہیں دیکھ لیں۔ اور ان کے بارے میں باتیں کریں۔

ان کی بیوی واپس آئیں تو انہوں نے آرام کرنے کے بجائے فوراً ہی کھانا پکایا اور اپنے شوہر کو کھلایا۔ انہوں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ برتن اور باورچی خانہ صاف کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے۔ اس دوران بیوی اپنے کمرے میں بیٹھی اخبار پڑھتی رہتیں۔ وہیں سے وہ آواز لگاتیں۔'' پلیز' میرے لیے کافی کا ایک کپ بھی بنا دیجیے۔''

مسٹر چو سہ پہر کو کافی نہیں پیتے تھے۔ البتہ رات کے کھانے کے بعد وہ دونوں مل کر کافی پیتے تھے۔ اگر وہ برتن بھی دھوتے ہوتے تو بیوی کی آواز پر سب کچھ چھوڑ دیتے۔ کبھی کبھی وہ طعنہ بھی دیتے کہ وہ بیوی کے لیے خاص کافی بنا کر لائے ہیں۔ وہ مذاق کرتے کہ اگر لوگ دیکھ لیں تو سمجھیں گے کہ تم کمائی کر کے لاتی ہو۔ اس پر وہ سوال کرتیں۔'' کن لوگوں کی بات کرتے ہو؟''

گھنٹے نے چار بجائے تو مسٹر چو گھبرا گئے کہ بیوی واپس آتی ہوگی۔ اس عمر میں بھی ان کی

بیوی اونچی ایڑی کے پمپ پہنتی تھیں۔ وہ چلتیں تو ان کے جوتوں سے ایسی آواز آتی جیسے نوجوان لڑکی چل رہی ہو۔ مسٹر چو کا کمرہ بیرونی لان کے رخ پر تھا لان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک حصے میں پھول لگے تھے اور دوسرے حصے میں ترکاریاں۔ وہاں کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ صرف گل داؤدی کے پودے رہ گئے تھے جو شروع کی برف باری میں بھی زندہ رہتے تھے۔

پورا لان خالی تھا صرف وہ پتھر نظر آتے تھے جو راستہ چلنے کے لیے لگائے گئے تھے۔ یہ پتھر پھولوں اور ترکاریوں کی کیاریوں کے درمیان لگے تھے۔ مسٹر چو نے جب بوائکر سسٹم لگایا تھا تو پرانا سسٹم بے کار ہو گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے وہ پتھر یہاں لگا لیے تھے۔ یہ پتھر صرف آنکھوں کو ہی اچھے نہیں لگتے تھے بلکہ ان پر چلنے کی آواز کانوں کو بھی بھلی لگتی تھی۔

جب ان کی بیوی ان پر چلتیں تو ان کی چاپ بہت اچھی لگتی تھی۔ ان کی چال ابھی تک ویسی ہی تھی جیسی بیس سال کی عمر میں تھی۔ اپنے ہنی مون کے دوران بھی وہ ایلیمنٹری اسکول میں پڑھاتی رہی تھیں۔

وہ تھیں تو نئے زمانے کی مگر جب وہ ساتھ ساتھ کہیں جاتے تو وہ پرانے زمانے کی عورتوں کی طرح ان سے چند قدم پیچھے چلتی تھیں۔ پیچھے چلنے والی بیوی کے قدم' فخریہ' آزادانہ اور مضبوط ہوتے تھے۔ وہ فرماں بردار بیوی کے قدم نہیں ہوتے تھے۔

اب بھی ان کی بیوی کے قدموں کی چاپ بڑی پر اعتماد ہوتی تھی۔ یہ چاپ انہیں بہت پسند تھی۔ پرانے زمانے کے اسکالر کی طرح جو اپنے گھر کے سامنے پولیو نا پیڑ لگاتے تھے تا کہ وہ اس کے پتوں پر پڑنے والی بوندوں کی رم جھم سن سکیں۔

اگر وہ مسٹر چو کے اس شوق کا سنتے تو وہ ان کا مذاق اڑاتے کہ انہوں نے اپنے لان میں پتھر اس لیے لگائے ہیں کہ اپنی بیوی کی اونچی ایڑی کی چاپ سن سکیں۔ ان کی بیوی باہر سے واپس آتیں تو مسٹر چو ان کے جوتوں کی آواز سن کر خوش ہو جاتے۔ وہ کھڑکی کے سلائیڈنگ پٹ کھولتے اور اپنی بیوی کے جسم کا اوپر کا حصہ دیکھتے۔

مسز چو فخر کے ساتھ سر اونچا کیے ہوئے چلتیں جیسے کوئی ان دیکھی ڈور پیچھے سے ان کے کان کھینچ رہی ہے۔ وہ فطری طور پر سر اونچا کر کے ایسے چلتی تھیں جیسے پر اعتماد ماڈل۔ مسٹر چو کے لیے یہ نہایت فخر کی بات تھی کہ ان کی بیوی لباس کی پرواہ کیے بغیر ہی ایسی با اعتماد نظر آتی تھیں کہ انہیں

MashalBooks.com

دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔

اپنی بیوی کے قدموں کی چاپ سن کر مسٹر چو کا سر بھی فخر سے اونچا ہو جاتا اور وہ سوچتے کہ انہوں نے انہیں اتنا آرام اور ایسی آسائش مہیا نہیں کیں۔ جس کی وہ حق دار تھیں۔ ان کی بیوی نے بھی کبھی ان سے زیادہ فرمائش نہیں کی۔ ابھی پچھلے دنوں ہی انہیں احساس ہوا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو خوش رکھنے کے لیے تمام سہولتیں مہیا نہیں کر سکے۔ ان کے لیے یہ خیال سوہان روح بن گیا تھا کہ ان کی بیوی کی زندگی میں کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جن کے ذمہ دار وہ نہیں ہیں۔

چڑیاں ابھی واپس نہیں آئی تھیں۔ کیا وہ اپنی مرضی سے اڑتی ہیں؟ ہو سکتا ہے کوئی خطرناک جانور انہیں ڈراتا ہو اور وہ اس کے ڈر سے اڑ جاتی ہوں۔ مگر پھر یہ خیال انہوں نے جھٹک دیا۔ وہ جنگل اور اس کے پیڑوں کو خوب جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ بھیڑیا تو دور کی بات ہے وہاں تو انہوں نے کبھی خرگوش تک نہیں دیکھا۔ اگر وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ اگلے لمحے ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے تو وہ چڑیوں کی زندگی کے بارے میں کیسے کہہ سکتے ہیں۔

مسٹر چو کے گھر میں کئی بیڈ روم تھے۔ بلکہ اصل میں تو تین ہی تھے۔ ماسٹر بیڈ روم، دوسرا بیڈ روم اور فالتو بیڈ روم مسٹر چو نے اندر کی دیوار گرا دی تھی جس سے ایک بڑا کمرہ بن گیا تھا جسے انہوں نے اپنے مطالعے کا کمرہ بنا لیا تھا۔ اس تبدیلی سے ان کی بیوی کو غصہ آ گیا تھا۔ وہ بھی ایک الگ کمرہ چاہتی تھیں۔

اگر مطالعے کا کمرہ شوہر کا کمرہ ہے تو اصل بیڈ روم بیوی کا کمرہ ہے۔ مسٹر چو نے یہ دلیل پیش کی۔ لیکن مسز چو کا کچھ اور ہی خیال تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اصل بیڈ روم پورے خاندان کے لیے ہوتا ہے۔ یہ بات مسٹر چو کی سمجھ میں آ گئی۔ مسٹر چو نے اپنے گھر کے سب سے گرم حصے میں وہ دیوان رکھا تھا جو انہیں ان کی بیٹی نے تحفے میں دیا تھا۔ یہ دیوان انہیں بہت پسند تھا۔ وہ دن کا بیشتر حصہ اس پر ہی گذارتے تھے۔ اپنے کمرے میں وہ اتفاق سے ہی سوتے تھے۔ اصل کمرے میں سونے سے ان کی طبیعت بحال ہو جاتی تھی اور وہ صبح کو خوش خوش اٹھتے تھے۔ وہ اپنے کپڑے بھی بڑے کمرے میں ہی بدلتے تھے۔ جب انہوں نے اپنا باورچی خانہ بنایا تھا تو وہاں ناشتے کی میز بھی لگا دی تھی۔ لیکن انہیں اور ان کی بیوی کو اونچے اسٹول پر بیٹھ کر کھانے کی عادت نہیں تھی۔ وہ چھوٹی تپائی بڑے کمرے میں لے آئے جہاں وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔

کوئی بہت ہی ضروری کام ہوتا تو مسز چو اپنے شوہر کے کمرے میں جاتی تھیں۔ اگر وہ ان کے لیے جاپانی پھل یا جن سینگ بھی لے کر جاتیں تو پہلے سلائیڈنگ دروازے کے پاس کھڑے ہو کر اپنے آنے کی اطلاع دیتیں۔ لیکن مسٹر چو کی مرضی تھی وہ جب بھی چاہتے اور جہاں بھی چاہتے آزادی کے ساتھ آتے جاتے تھے۔ وہ بڑے کمرے کو صرف اپنی بیوی کے لیے مخصوص نہیں سمجھتے تھے۔ کوئی ان کا خیال تبدیل بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے ان کی بیوی نے فیصلہ کیا کہ انہیں بس اپنے لیے ایک کمرہ مخصوص کرنا چاہیے خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا سا کمرہ ہو، اس کمرے میں ان کے شوہر کو بھی داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوگی۔

دوسرا کمرہ کسی کا نہیں تھا۔ وہ دراصل مہمانوں کا کمرہ تھا۔ مگر ان کے ہاں اتفاق سے ہی کوئی مہمان آتا تھا۔ ان کے بچے اپنے گھر رہتے تھے۔ لیکن وہ کمرہ ہر وقت تیار رہتا تھا کہ شاید ان میں سے کوئی آ جائے۔ اب ان کے بچے ان کے معزز مہمان بن گئے تھے۔

مسز چو مہمانوں کا کمرہ ہر وقت صاف ستھرا رکھتیں۔ وہ اپنے بچوں کے لیے کلوزٹ میں ساٹن کی چادریں رکھتیں۔ شادی سے پہلے ان کے بچوں کو جو بھی چیزیں پسند تھیں، جیسے ان کی کتابیں اور کھیلوں کی چیزیں وہ سب حفاظت کے ساتھ رکھی گئی تھیں۔ حتیٰ کہ بچوں نے جو چیزیں پھینک دی تھیں وہ بھی سنبھال کر رکھ لی گئی تھیں۔ ہر چیز اپنی اپنی جگہ سنبھال کر رکھی گئی تھی۔ بچوں سے ان کی محبت کا ثبوت یہ تھا کہ وہ کمرہ اور اس کی تمام چیزیں ہر روز صاف کی جاتی تھیں۔

اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لیے مسٹر چو کو ایک اور کمرہ بنانا پڑا تھا۔ وہ صرف بیوی کے لیے تھا۔ خوش قسمتی سے باورچی خانہ ان کی ضرورت سے بھی بڑا تھا۔ یہ مکان اس وقت بنایا گیا تھا جب لوگ قریب کی پہاڑی سے ایندھن کے لیے لکڑیاں اکٹھی کرتے تھے۔ اس لیے باورچی خانے کا ایک حصہ لکڑیاں رکھنے کے لیے تھا۔ مسٹر چو نے اس جگہ کو بھی چھوٹے سے کمرے میں تبدیل کر دیا تھا۔ بیوی کے کہنے پر انہوں نے وہاں دروازہ بھی لگا دیا تھا کہ اندر آنے سے پہلے دستک دی جائے۔ اندھیرا دور کرنے کے لیے اس کمرے میں ایک کھڑکی بھی لگا دی گئی تھی جو پچھلے صحن کی طرف کھلتی تھی، یہ کمرہ واقعی بہت چھوٹا تھا۔

جب سے انہوں نے بیوی کے لیے یہ کمرہ بنایا تھا انہیں اس کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ انہیں بیوی سے کوئی کام ہوتا تو وہ اپنے کمرے میں ہی نہیں ہوتی

MashalBooks.com

تھیں۔مسٹر چو کو شبہ تھا کہ ان کی بیوی نے اپنے کمرے کے لیے اس لیے ضد کی تھی کہ مسٹر چو نے اپنے لیے الگ کمرہ بنایا تھا۔انہوں نے سوچا کہ بیوی کو اس کمرے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ایک دن بیوی گھر سے باہر تھیں تو مسٹر چو نے ان کے کمرے کا دروازہ سرکایا۔ان کا خیال اندر جھانکنے کا نہیں تھا۔وہ تو یہ دیکھ رہے تھے کہ دروازہ پر تالا پڑا ہوا ہے یا نہیں۔ان کی بیوی نے جب اپنے کمرے کا دروازہ لگانے کی فرمائش کی تھی تو انہوں نے دروازے پر ایسا قفل لگا دیا تھا جسے اندر اور باہر سے کھولا اور بند کیا جا سکے۔

دروازہ آرام سے کھل گیا۔کمرہ بہت ہی سادہ اور اجڑا اجڑا سا تھا۔دروازے کے ساتھ والی کھڑکی پر وہ بھی نہیں تھا۔کھڑکی سے ان کا پچھلا صحن اور ہمسائے کے گھر کی دیوار کا درمیانی حصہ اندھیرے میں گھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔

کمرے میں فرنیچر کے نام پر صرف کپڑوں کی ایک بدشکل چھوٹی سی الماری تھی۔الماری کے ساتھ دیوار پر صلیب لٹکی ہوئی تھی اور الماری کے اوپر بائبل اور حضرت مریم کا چھوٹا سا مجسمہ رکھا ہوا تھا ان کی بیوی کچھ زیادہ مذہبی نہیں تھیں۔کئی سال پہلے ان کے ایک دوست نے انہیں بپتسمہ دلایا تھا مگر وہ کبھی کبھی ہی چرچ جاتی تھیں۔مسٹر چو کو ان باتوں کا کوئی شوق نہیں تھا وہ اپنی بیوی کا مذاق اڑاتے کہ اگر چرچ نہ جانا تھا تو بپتسمہ ہی کیوں لیا۔

مسز چو کے بپتسمہ لینے پر ان کی گاڈ مدر نے تحفے میں حضرت مریم کا مجسمہ دیا تھا۔جو کمرے میں رکھ دیا گیا تھا۔مسٹر چو نے اپنی بیوی کو ان کی عبادت کرتے کبھی نہیں دیکھا۔انہوں نے سوچا کہ ان کی بیوی کو آرائش کے لیے کچھ چیزیں چاہیے تھیں اور انہوں نے یہ یہاں رکھ لیں۔یہ سوچ کر انہیں بیوی پر ترس آیا۔ان کا ارادہ کمرے میں جانے کا نہیں تھا۔لیکن ابھی وہ دروازہ بند ہی کر رہے تھے کہ ان کی نظر ایک عجیب سی چیز پر پڑی اور وہ چونک گئے۔صندوق پر دو موم بتیاں رکھی تھیں۔اور وہ ہولڈر پر نہیں تھیں۔

یہ موم بتیاں اس سال ایسٹر پر لگائی گئی تھیں۔طویل عرصے بعد ان کی بیوی چرچ گئی تھیں وہ وہاں سے لاتی تھیں۔اور اپنے ہینڈ بیگ سے عبادت کی شال نکالی تھی۔وہ اپنے ساتھ ایک بڑا سا بنڈل بھی لائی تھیں۔اس وقت مسٹر چو کو بھوک لگ رہی تھی۔وہ سمجھے ان کی بیوی کھانے کی کوئی چیز لائی ہیں اسی لیے انہوں نے وہ بنڈل کھول کر دیکھا تھا۔مگر اس میں سے دو اتنی موٹی موٹی

موم بتیاں نکلی تھیں جیسے کسی بچے کا بازو۔

''انہوں نے تمہیں موم بتیوں کی جگہ کھانے کی کوئی چیز کیوں نہیں دی؟''انہوں نے کہا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا یہ میں نے خریدی ہیں۔تمہارے کھانے کے لیے یہ ہے۔''ان کی بیوی نے کہا تھا۔

ان کی بیوی نے چاندی کی پنی میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ نکالا۔اس میں انڈے تھے۔

''تم نے موم بتیاں کیوں خریدیں؟اب تو پہلے کی طرح بجلی بھی نہیں جاتی۔کتنا خرچ کر دیا ان پر؟۔''

''ایک موم بتی کے ایک ہزار وان۔''ان کی بیوی نے کہا۔

''بہت مہنگی ہیں۔''

''چرچ فروخت کر رہا تھا۔مجھے یقین ہے اس سے جو منافع ہوگا وہ نیک کام پر ہی صرف ہوگا۔''

''یہ انڈے بھی تم نے ہی خریدے ہوں گے؟۔''

''ہاں میں نے ہی خریدے ہیں۔پاگل ہو گئے ہو۔آجکل مفت کیا ملتا ہے۔''

ان کی بیوی نے آہستہ آہستہ موم بتیاں نکالتے ہوئے کہا تھا۔

صندوق پر رکھی ہوئی موم بتیوں کی یہ تاریخ تھی۔

بیوی نے تو نہیں بتایا تھا لیکن مسٹر چو جانتے تھے کہ یہ موم بتیاں متبرک ہیں۔اس لیے انہیں یہ دیکھ کر کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ وہ صلیب کے نیچے حضرت مریم کے مجسمے کے سامنے رکھی ہوئی تھیں۔انہیں علم نہیں تھا کہ وہ موم بتیاں کب جلائی گئیں۔لیکن وہ انگوٹھے برابر رہ گئی تھیں۔وہ انہیں دیکھ کر گھبرا گئے جیسے وہ اپنی بیوی کی نجی زندگی میں مخل ہو رہے ہوں۔شرم سے ان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔لیکن وہ معلوم کرنے کو بے چین تھے کہ ان کی بیوی بند کمرے میں ان بتیوں کے ساتھ کیا کرتی ہے۔

اس کے بعد مسٹر چو اپنی بیوی کی ایک ایک حرکت کی نگرانی کرنے لگے۔ایک رات انہوں نے پچھلے صحن سے بیوی کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو ان کی بیوی فرش پر جھکی بیٹھی تھیں اور خضوع وخشوع کے ساتھ دعائیں مانگ رہی تھیں۔دونوں موم بتیاں جل رہی تھیں۔باہر اندھیرا

Mashal Books.com

تھا اس لیے انہیں چھپنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں اس لڑکی کی تصویر یاد آ گئی جو انہوں نے شہر میں چلنے والی بسوں پر دیکھی تھی اور جس پر لکھا ہوتا تھا۔

''سب کی حفاظت''۔ وہ لڑکی بھی عبادت کر رہی ہوتی تھی۔ انہوں نے مختلف زاویوں سے اپنی بیوی کو دیکھا اور سوچا کہ خواہ کسی انداز سے کوئی انسان عبادت کر رہا ہو وہ خوبصورت لگتا ہے۔

ان کی بیوی نہ تو مسکرا رہی تھیں اور نہ رو رہی تھیں۔ وہ بہت ہی اذیت میں نظر آ رہی تھیں۔ وہ نہایت بے رحمی کے ساتھ پھاڑی ہوئی تصویر کا حصہ معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ اس وقت حلم و انکسار کا مکمل نمونہ بنی ہوئی تھیں۔

آخر ان سے ایسا کونسا گناہ سرزد ہوا ہے جو وہ اتنی عقیدت کے ساتھ عبادت میں کھوئی ہوئی ہیں؟۔ انہیں مریم کا مجسمہ یا صلیب تو نظر نہیں آ رہی تھیں مگر انہیں یقین تھا کہ ان کی بیوی کا یہ انہماک دیکھ کر خدا نے بھی اپنی نظریں چرا لی ہوں گی۔

بیوی کا غمزہ چہرہ دیکھ کر انہیں خیال آیا کہ شاید وہ مالی پریشانیوں کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہو۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی نوجوان کے ساتھ پھنس گئی ہوں۔ اور اب وہ انہیں بلیک میل کر رہا ہو۔

اس رات مسٹر چو ایک منٹ کے لیے نہیں سوئے۔ صبح کو بھی ان کے دماغ پر اپنی بیوی کا غمزدہ چہرہ ہی چھایا رہا۔ اور وہ پریشان رہے۔ انہیں یہ بھی عجیب سا لگا کہ صبح کو ان کی بیوی کا چہرہ اپنی اصلی حالت میں آ گیا تھا۔

مسٹر چو اپنی بیوی کی یہ دوہری شخصیت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ آخر موقع پا کر انہوں نے یہ بات اپنی بیوی سے بھی کی۔ پہلے انہوں نے بیوی کے ساتھ ناشتے کے برتن صاف کرائے اس کے بعد انہوں نے سگریٹ سلگایا۔ ان کی بیوی ان کی سگریٹ نوشی بالکل پسند نہیں کرتی تھیں پہلے وہ ایک دن میں پورا پیکٹ پی جاتے تھے۔ اب بیوی کے اصرار پر انہوں نے دن میں صرف پانچ سگریٹ پینا شروع کر دیے تھے۔ وہ ڈرتے تھے کہ وہ ان کے سگریٹ بالکل ہی چھڑوا دیں گی۔ جب بھی وہ سگریٹ پیتے ان کی بیوی کھانسنا کھنکارنا شروع کر دیتیں۔

''تم اپنے الگ کمرہ کے لیے ضد کرتی تھیں۔ اب دیکھو وہ کمرہ تو استعمال ہی نہیں کرتیں۔ میں اگر اسے اپنے سگریٹ پینے کے لیے استعمال کر لوں تو تمہارا کیا خیال ہے؟ مسٹر چو نے اپنے

کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے شرارتاً کہا۔

''خبردار' میرا کمرہ سگریٹ پینے کے لیے استعمال نہ کرنا اور تم نے یہ کیسے سوچا کہ میں وہ کمرہ استعمال نہیں کرتی۔ وہ میرا عبادت کا کمرہ ہے۔ بیوی نے کہا۔

''عبادت کا کمرہ؟'' یعنی تم عبادت کرتی ہو؟ تم' جو مہینے میں ایک باری ہی چرچ جاتی ہو؟''

''تمہیں حیرت کیوں ہوئی میری عبادت پر؟''

مسٹر چو کو خیال نہیں تھا کہ ان کی بیوی اپنی عبادت چھپانے کے بجائے اس طرح کھلم کھلا اس کا اعلان کر رہی ہیں۔ بہرحال مسٹر چو چاہتے تھے کہ اپنی بیوی کی عبادت کے بارے میں اور بھی معلومات حاصل کریں۔ انہوں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ وہ ان موم بتیوں کا راز معلوم کریں گے جو اب انگوٹھے برابر رہ گئی تھیں۔

''وہ تم نے ایسٹر پر خریدی تھیں نا؟۔ اس کا مطلب ہے کہ تم انہیں جلاتی رہی ہو جس سے وہ اتنی سی رہ گئی ہیں۔''

''ہاں' ایسا ہی ہے۔''

مسٹر چو کو کچھ پریشانی سی ہوئی۔ بیوی کے چہرے پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔ ''تم کاہے کے لیے دعائیں مانگتی ہو؟۔ تمہیں تکلیف کیا ہے؟۔ کیا تم مجھے نہیں بتاؤ گی؟ میں تمہارا شوہر ہوں۔''

''موت اور زندگی انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔'' بیوی نے کہا۔

''کیا عجیب بات کی ہے۔ تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ ہم میں سے کسی کو ناقابل علاج بیماری ہے؟ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''نہیں' میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میری دعائیں صرف میری ایک خواہش کے لیے ہوتی ہیں۔ میں دعا کرتی ہوں کہ میرے خاندان کے لوگ اپنی عمر کے حساب سے مریں۔''

''عمر کے حساب سے؟'' مسٹر چو بولے

''ہاں' میں دعا کرتی ہوں اپنے بچوں کے لیے' اور ان کے بچوں کے لیے کہ انہیں اپنی عمر کے حساب سے موت آئے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں کتنا گڑگڑا کر دعائیں مانگتی ہوں۔ میں نے اور کچھ کبھی نہیں مانگا۔ میں یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی کہ میں بہت لالچی ہوں۔ میں دعا مانگتی ہوں۔ خدا کی خوشامد کرتی ہوں۔ اسے راضی کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

MashalBooks.com

اس کا مطلب ہے کہ مسٹر چو نے بیوی کے کمرے میں جو دیکھا وہ کوئی خفیہ چیز نہیں تھی۔ وہ ان سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی تھیں۔ بیوی کی زندگی میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو چھپی ہوئی ہو البتہ مسٹر چو جو آرام دہ زندگی گذار رہے تھے اس کی وجہ سے ان کی نظر ادھر نہیں گئی تھی۔ وہ اس عبادت کا مقصد نہیں سمجھ سکتے تھے۔

جب ان کی شادی ہوئی تو ان کی بیوی کے خاندانون میں سب بوڑھے بوڑھے ہی تھے۔ ان کے جوان بیٹے اور بیٹیاں مرچکی تھیں اس لیے جوان بہوئیں گھر بیٹھی تھیں۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ ان کے سسر کا انتقام جاپانی قبضے کے آخری دنوں میں ہوا تھا جب ان کے گاؤں پر بمباری ہوئی تھی۔ ان کا سالا جو فوج میں تھا کوریا کی جنگ میں مرگیا تھا۔ جو بوڑھے لوگ بچے تھے ان میں ان کی بیوی کے دادا دادی تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹوں اور پوتوں کو باہر بھیج دیا تھا۔ ان کی ساس اور سالے کی بیوی دونوں بیوہ تھے۔

سالے کی بیوی اپنی شادی کی پہلی سالگرہ منانے سے پہلے ہی بیوہ ہوگئی تھی۔ وہ مسٹر چو کی بیوی کی ہی عمر کی تھی۔ شوہر کی موت کے بعد اس کے بیٹا پیدا ہوا تھا۔ مسٹر چو کی بیوی جب بھی اپنی بھابی کی جوانی دیکھتیں تو انہیں بہت صدمہ ہوتا۔ جنگ کے دوران اکثر بوڑھے لوگ اپنے بیٹوں اور پوتوں سے محروم ہوگئے تھے۔ یہ اچانک ہوا تھا اور اس صورت حال کو سب نے قبول کرلیا تھا۔

البتہ مسز چو پر اس کا بہت برا اثر ہوا تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد بھی ان کے خاندان میں اچانک موتیں ہوتی رہیں۔ ان کی ساس کا اس وقت انتقال ہوا جب وہ ابھی پچاس سال کی بھی نہیں تھیں۔ دوسرے سال مسز چو کے دادا اپنی اسی سالگرہ پر انتقال کر گئے۔

مسز چو اپنی ماں کے اچانک انتقال پر ایسی خاموشی اور پرسکون تھیں کہ لوگ حیران رہ گئے تھے۔ ہاں، وہ اپنے نانا کے انتقال پر واخوب روئی تھیں۔ وہ رورہی تھیں اور کہہ رہی تھیں ''نانا، اگر آپ ایک سال پہلے انتقال کرتے تو اچھا ہوتا۔ اب آپ ہمیں کیوں چھوڑ کر جارہے ہیں؟''

یہ کیسے بیہودہ بین ہیں؟ مسٹر چو واقعی پریشان ہوگئے تھے اپنی بیوی کے اس طرح کے بین پر انہیں فکر بھی ہوگئی تھی۔ خاص طور سے انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ ان کی بیوی کی پریشانی یہ ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے انتقال کے بعد ایک سال زندہ رہے۔ اس وقت تو مسٹر چو بہت حیران ہوئے تھے لیکن اب انہیں خیال آیا کہ دراصل ان کی بیوی کی پریشانی یہ تھی کہ ان کے خاندان کے لوگ

اپنی عمر کے حساب سے نہیں مرے۔ اب انہیں اپنی بیوی سے ہمدردی ہوئی اور ان پر ترس آیا۔

اس کے بعد عمر کے حساب کے بغیر موت نے ان کی بیوی کے خاندان کے دروازے پر دستک نہیں دی۔ ان کا بھتیجا جو باپ کی موت کے بعد پیدا ہوا تھا، اب ایک بہت ہی کامیاب انسان تھا اور اس نے ہی سارے خاندان کو اکٹھا کر رکھا تھا۔ مسٹر چو کا خیال تھا کہ صرف ان کی بیوی ہی ہیں جو ابھی تک ماضی کے صدموں سے چور ہیں۔ کبھی کبھی وہ پرانا کپڑا یا بدھ کی وہ مورتی نکالتیں جو انہوں نے اپنے اسکولوں کے زمانے میں بنائی تھی۔ جب بھی وہ اپنے بچپن کی چیزیں دیکھتیں افسردہ ہوجاتیں۔ اور پرانی یادوں میں کھو جاتیں اور اپنے اردگرد سے بے نیاز ہوجاتیں۔ اس وقت مسٹر چو انہیں اکیلا چھوڑ دیتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی بیوی کی اس دلی تکلیف کے ذمہ دار نہیں ہیں اور نہ وہ اسے دور کرسکتے ہیں۔ وہ صرف ترس ہی کھا سکتے تھے۔

وہ اپنے خیالوں سے باہر آئے جب انہوں نے باہر پتھروں پر اپنی بیوی کے جوتوں کی کھٹ پٹ سنی بچے کی طرح خوش ہوکر انہوں نے اپنا دروازہ کھولا۔ وہ صحت مند نظر آرہی تھیں، اگرچہ وہ ظاہر یہ کررہی تیں کہ وہ بہت ہی تھکی ہوئی ہیں۔ یہ ان کی عادت تھی کہ جب بھی بازار سے آتیں تو تھکی تھکی دکھائی دیتیں۔

''مجھے کیا دیکھ رہے ہو۔ یہاں آکر تھیلا پکڑو'' انہوں نے کہا مسٹر چو فوراً کھڑے ہوگئے اور صحن میں جاکر کپڑے کا تھیلا اٹھالیا۔

اتنی بہت سی چیزیں خرید لائیں؟'' مسٹر چو نے کہا ''میری کچھ دوست مارکیٹ جارہی تھیں، میں بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ میں نے کچھ پھل، مچھلی اور تازہ جین سن خریدا ہے۔ بازار بہت ہی بڑا ہے۔ میں وہاں بیس ''لی'' تو پیدل چلی ہوں گی۔''

''تم اتنی دور گئی کیوں تھیں۔ تمہیں خود ہی سوچنا چاہیے تھا۔ میں کب سے تمہارا انتظار کررہا ہوں۔ مجھے تو فکر ہوگئی تھی۔ مسٹر چو نے بیوی کے آگے آگے چلتے ہوئے کہا۔

''اتنی ذرا سی بات پر تم کیوں پریشان ہوگئے؟ تم دیر سے گھر آتے ہو تو کیا تمہیں کبھی میری فکر ہوتی ہے؟''

''یہ تو سوچنے کی بات ہے۔ ایک شخص کمائی کرنے جاتا ہے۔ اور اسے دیر ہوجاتی ہے اور دوسرا بازار جاتا ہے اور پیسے خرچ کرتا ہے۔''

MashalBooks.com

''پیسے خرچ کرنا پیسے کمانے سے زیادہ مشکل کام ہے۔تم جانتے ہی نہیں کہ کیا کہہ رہے ہو۔''

تم نے کبھی سوچا کہ تم وہ پیسہ خرچ کرتی ہو جو میں کماتا ہوں۔''مسٹر چو نے کہا۔

''تم بھول گئے' کبھی میں بھی کام کرتی تھی۔میں اپنے تجربے کی وجہ سے کہہ سکتی ہوں کہ پیسے کمانے سے زیادہ پیسے خرچ کرنا مشکل کام ہے۔''

''اچھا چلو چھوڑو۔''مسٹر چو بولے۔

مسٹر چو کو اپنی بیوی سے بحث کرنے میں مزہ آتا تھا۔وہ انہیں چھیڑتے رہتے تھے۔انہوں نے تھیلا کھولا۔ان کی بیوی کپڑے بدلنے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔وہ جلد ہی واپس آ گئیں۔ انہوں نے مچھلی اور ترکاری الگ الگ کی۔انہیں دھویا اور جلدی سے نمک لگا کر رکھ دیا۔

''میں نے سنا ہے گرین بیلٹ کی زمین فروخت کی جا رہی ہے۔''ان کی بیوی نے کہا۔

''کیا حماقت ہے یہ۔اس سے وہ کتنی دولت کما لیں گے؟۔گاؤں کے لوگ اس امید پر زندہ ہیں کہ ان کی زمین کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں گی۔وہ خواب دیکھ رہے ہیں۔یہ ایسا ہی ہے جیسے غریب مگر پرامید اسکالر فوجی انقلاب کے خواب دیکھتا ہے۔مسٹر چو نے کہا۔

''یہ افواہ گاؤں کی طرف سے نہیں آئی ہے۔یہ بات مجھے میری ایک دوست نے بتائی ہے۔اس کا شوہر اس علاقے کا بہت بااثر آدمی ہے۔''

''الیکشن کے زمانے میں ایسی بے بنیاد افواہیں پھیلتی ہی رہتی ہیں۔''

''خیر' وہ کہتی ہے کہ تم تو سونے کی کان پر بیٹھی ہو۔اس نے تو تمہاری تعریف بھی کی ہے کہ بظاہر تو تم نے اپنی سادگی میں یہ مکان خریدا ہے لیکن تم جانتے تھے کہ یہاں قیمت بڑھے گی۔وہ تو تم سے جلتی ہے۔''

''میں اب اور کہیں نہیں جانا چاہتا۔''مسٹر چو بولے۔

''میں تو یہی سمجھتی ہوں۔ایک بار گرین بیلٹ عام جگہ بن گئی تو لوگ یہاں آنا شروع ہو جائیں گے۔میرا خیال ہے وہ ہم جیسے لوگوں کو یہاں سے نہیں نکالیں گے۔

''تم سمجھتی ہو میں خاموش بیٹھا دیکھتا رہوں گا کہ بلڈوزر سے جنگل اجاڑے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ مکان بنائے جا رہے ہیں؟۔میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ اپنے کمرے سے میں جنگل نہیں دیکھ سکوں گا۔''

''خیر میں تو جب یہ سوچتی ہوں کہ ہمارے مکان کی قیمت بڑھ جائے گی تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ساری زندگی ہم اپنے بڑے گھر بیچتے رہے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹے گھر میں منتقل ہوتے رہے ہیں۔اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے حالات بہتر بنائیں۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔اب تم اصل بات پر آتی ہو۔تم چاہتی ہو ہم یہ مکان بیچ کر سیول کے کسی فلیٹ میں چلے جائیں۔تم خواب دیکھتی رہو۔یہاں قیمتیں نہیں بڑھیں گی۔اور اگر قیمتیں بڑھیں بھی تو میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔''مسٹر چو غصے میں زور زور سے بولنے لگے۔ انہوں نے خیالوں ہی خیالوں میں درختوں سے پرندے اڑتے دیکھے جو آسمان میں غائب ہو رہے تھے۔لوگ کہتے ہیں کہ جانوروں کو آنے والی آفات کا پہلے سے علم ہو جاتا ہے۔انہوں نے سوچا کہ ان پرندوں نے آنے والے بلڈوزروں کی آواز سن لی ہے۔وہ کسی خوفناک جانور سے نہیں ڈرے۔

وہ مکان بیچ کر اس سے منافع کمانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔انہیں لگا جیسے ان سے ان کی کوئی قیمتی چیز چھین لی جائے گی۔ان کی بیوی انہیں نہایت میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''میرا دماغ پڑھنے کی کوشش نہ کرو۔کیا کبھی میں نے کہا ہے کہ مجھے فلیٹ اچھے لگتے ہیں؟۔ چلو' اب ہم یہاں سے بھی کسی اور تنہا سی جگہ پر چلتے ہیں۔کہیں اور بھی ایسے درخت اور پہاڑ ملنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔کوئی گرین بیلٹ اور کوئی ایسا گاؤں جو ابھی آباد ہو رہا ہو اسی طرح کے ماحول میں گھرا ہوا ہوگا۔اس لیے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔''مسز چو نے کہا۔

''کیا تم سچ کہہ رہی ہو۔؟''مسٹر چو بولے۔

''تمہیں درخت' پہاڑ اور وادیاں اچھی لگتی ہیں اس لیے تم نے یہ گھر خریدا۔تم جانتے ہو مجھے یہاں کیا چیز اچھی لگتی ہے۔مجھے یہ اچھا لگتا ہے کہ یہاں ٹرانسپورٹ کی سہولت کم ہے۔میں تو درختوں اور پہاڑوں سے زیادہ اس بات سے خوش ہوں کہ یہاں گاڑیاں نہیں ہیں۔مجھے یقین ہے کہ ہمیں ایسا کوئی اور گاؤں بھی مل جائے گا جو ہم دونوں کو پسند آئے گا۔''

''اچھا'...؟ مجھے حیرت ہے کہ تمہیں یہ جگہ اس لیے پسند ہے کہ یہاں زیادہ ٹریفک نہیں ہے۔میرا خیال ہے تم طنز کر رہی ہو۔''مسٹر چو نے کہا۔

''ہم وہاں خوش رہتے ہیں جہاں آنے جانے کی سہولت کم ہو۔شہر سے دور۔تم سمجھے میری

MashalBooks.com

بات؟۔ جو بچے ہم سے دور رہتے ہیں ان کے ملنے کی امید کم ہی ہوتی ہے ان بچوں کے مقابلے میں جو گھر کے ساتھ ہی رہتے ہوں۔ اب رہے ہمارے بچے۔ میرا خیال ہے وہ ہم سے دور رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ ان کے پاس ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ ہوتا ہے ہمارے پاس نہ آنے کا۔ کیا یہ ہمارے لیے بے عزتی کی بات نہ ہوگی کہ ہم ان بچوں کا انتظار کریں۔ مجھے تو اب زیادہ سکون ہے کہ ہم ان کے آنے کا انتظار نہیں کرتے رہتے۔''

مسز چو نے پیار سے اپنے شوہر کو دیکھا اور مسکرائیں۔ مسٹر چو نے نظریں چرائیں اور اس تھیلے سے باقی چیزیں بھی نکالیں جو ان کی بیوی بازار سے خرید کر لائی تھیں۔ ان کے احساسات بھی وہی تھے جو ان کی بیوی کے تھے مگر وہ انہیں ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ تھیلا کھولا تو ان کے ہاتھوں پر ترکاریوں کی مٹی لگ گئی۔ تھیلے میں کچھ لالی پاپ بھی تھے۔

''لالی پاپ وہیں رہنے دو۔ یہ پول دو کے لیے ہیں۔'' پول دوان کے پڑوسی کے بچے کا نام تھا۔ اس پڑوسی نے برابر کے مکان میں ایک کمرہ کرایہ پر لیا ہوا تھا۔ وہ بچہ اتنا پیارا تھا کہ جب اس کی ماں مصروف ہوتی تو مسز چو اس بچے کو اپنی گود میں لیے بیٹھی رہتیں۔ بچے کا باپ ایک فرنیچر فیکٹری میں کام کرتا تھا اور اس کی ماں بہت ہی سگھڑ عورت تھی۔ اور باہر کا کام بھی کرتی تھی۔ اسے باہر سے کام بھی ملتا رہتا تھا۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ دونوں مل کر اتنا پیسہ کما لیں کہ شہر چلے جائیں اور وہاں مکان بنا لیں چاہے وہ ایک کمرہ ہی کیوں نہ ہو۔ وہ عورت آج کل انگوراوں کے سوئٹروں پر پھول پتے اور چڑیوں کے پر بنا رہی تھی۔

مسز چو اکثر اس نوجوان عورت کے پاس جاتی تھیں۔ ''ایک پھول بنانے کا تم کیا لیتی ہو؟۔ اچھا؟۔ بس اتنا ہی؟۔ یہ پھول بنانے کے بعد تو سوئیٹر بہت ہی قیمتی ہو جاتا ہے۔ دوگنی سے زیادہ قیمت ہو جاتی ہے۔ مسز چو بچے کے ساتھ کھیلتی جاتیں اور اس عورت سے باتیں کرتی جاتیں۔ وہ جب بھی کسی چیز پر گرد و غبار دیکھتیں تو بچے کو فوراً کمرے سے باہر لے جاتیں۔ وہ بچے کو اپنے ساتھ بھی لے جاتی تھیں مگر بچہ اجنبی لوگوں کو دیکھ کر ڈر جاتا تھا۔ اگر مسٹر چو بچے کو اپنی گود میں لیتے تو بچہ ایسے رونے لگتا جیسے کسی نے نوچ لیا ہو۔ وہ صرف اپنی بیوی کو ہی بچے کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھتے رہتے تھے۔ ان کی بیوی ان کا مذاق اڑاتیں۔

مسز چو بچے کو بسکٹ بھی دیتی تھیں۔ پھل دیتے وقت وہ اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے

کرتیں یا پھر اسے کچل کر بچے کو کھلاتیں ایک بار ایک دکان کے افتتاح پر انہیں مفت لالی پاپ ملے۔ بچہ ان سے بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد وہ جب بھی بازار جاتیں بچے کے لیے لالی پاپ ضرور لاتیں۔ پچھلی گرمیوں میں مسٹر چو نے بچے کے دو دانت دیکھے تو بولے کہ اس سے انہیں دو چاول کے دانے یاد آتے ہیں جو اس کے مسوڑھے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی بیوی نے ان کا مذاق اڑایا اور کہا کہ یہ گلابی پہاڑی پر چلنے والے بھیڑ کے دو بچے ہیں۔'' ان کا مشاہدہ زیادہ رومینٹک تھا۔

''مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ یہ چاول کے دانے ہیں یا بھیڑ کے بچے۔ یہ بتاؤ۔ اگر تمہارے اس چہیتے بچے کے دانت خراب ہو گئے تو تم کیا کرو گی تمہیں معلوم نہیں زیادہ میٹھا کھانے سے دانت خراب ہو جاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے لالی پاپ میز کی دراز میں رکھ دیئے۔

''یہ تو دودھ کے دانت ہیں۔''

''تم اس لیے تو غلط کام نہیں کر رہی ہو کہ یہ دوسروں کا بچہ ہے؟۔''

''میں اس بچے سے اس لیے پیار نہیں کرتی کہ کوئی مجھے اس کا صلہ دے گا۔ وہ پیارا ہی اتنا ہے کہ خود بخود اس سے پیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اس میں خرابی بھی کیا ہے؟۔''

میں مانتا ہوں کہ تمہیں بچے بہت اچھے لگتے ہیں مگر یہ بتاؤ' تم اپنے پوتوں پوتیوں سے اتنا پیار کیوں نہیں کرتیں۔ اپنے بچوں سے تو تم ہمیشہ دور دور ہی رہیں۔ میں جانتا ہوں اگر ہمارے بچوں نے تمہیں اس بچے سے لاڈ پیار کرتے دیکھ لیا تو انہیں بہت صدمہ ہوگا۔

''تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو۔ میرے بچوں کا تو مقابلہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر مجھے ان سے پیار کرتے ہوئے ہچکچاہٹ سی ہوتی ہے۔'' مسز چو نے کہا۔

''ہچکچاہٹ؟۔ حیرت کی بات ہے۔'' مسٹر چو نے کہا۔

''میں جانتی ہوں' تم بھی ایسا ہی محسوس کرتے ہو۔'' اب بنومت' دیکھتے نہیں ہمارے پوتوں نواسوں کے ماں باپ انہیں اپنے پروں میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی موجودگی میں ہمیں عجیب سا لگتا ہے۔ ہم چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ میں جب ان بچوں کو گود میں لیتی ہوں تو پریشان ہو جاتی ہوں جیسے میں بچوں کو گود میں لینا بھول گئی ہوں۔ تم نہیں سمجھتے کہ ہم ان کے لیے

MashalBooks.com

بے کار ہو گئے ہیں؟۔''

''تم مجھے اپنے ساتھ شامل نہ کرو۔ مگر مجھے تو اپنے پوتوں نواسوں کے ساتھ بھی عجیب سا ہی لگتا ہے۔ لیکن اس بچے کے ساتھ تم ایسا نہیں کرتیں۔''

''اچھا یہ بتاؤ' آج کسی کا فون آیا تھا؟۔'' مسز چو نے ان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں'' مسٹر چو نے کہا اور ٹیلی فون کی طرف دیکھا۔ وہاں ٹیلی فون کا ریسیور نیچے لٹک رہا تھا۔ یہ کام بچے کا تھا۔ صبح کے وقت ان کی بیوی بچے کو گھر لے آئی تھیں اور شادی میں جانے تک اس کے ساتھ کھیلتی رہی تھیں۔

مسز چو نے بھی ٹیلی فون کو دیکھا۔

''اگر دن بھر گھنٹی نہیں بجی تھی تو تمہیں ٹیلی فون دیکھنا چاہیے تھا۔ یہ تو چپک رہا ہے۔ پول دو نے پوری طرح اپنے نشان چھوڑے ہیں۔''

مسٹر چو نے ریسیور اٹھا کر اوپر رکھ دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ بچہ لالی پاپ کھاتے ہوئے ٹیلی فون سے کھیلتا رہا ہوگا۔ مسز چو ٹیلی فون صاف کرتے ہوئے شرارت سے مسکرائیں۔ پولی دو نے کھیلتے ہوئے اپنے گندے ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا ہوگا۔ پولی دو جب لالی پاپ کھاتا تھا اور اس کی انگلیاں چپکنے لگتی تھیں اور وہ اپنی دس کی دس انگلیاں مسز چو کی ناک کے پاس لے جاتا تھا مسز چو اس کی ایک ایک انگلی چاٹ لیتی تھیں۔ وہ یہ کام ایسے کرتیں جیسے کوئی بھوکا جن مٹھائی کھا رہا ہو۔

مسٹر چو سمجھتے تھے کہ ان کی بیوی اور وہ بچہ دونوں اس حرکت سے خوش ہوتے ہیں۔ ایک بوڑھی عورت اور ایک بچے کو اس طرح خوش دیکھ کر مسٹر چو افسردہ ہو جاتے تھے اس افسردگی کی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

انہوں نے جیسے ہی ریسیور اوپر رکھا تو گھنٹی بجی۔ وہ گھنٹی اتنی زور زور سے بج رہی تھی جیسے وہ تاخیر کی کسر نکال رہی ہو۔ ریسیور اٹھانے کے بجائے مسز چو گھبرا کے اپنی کرسی کی طرف لپکیں۔

''کیا ہوا ہے تمہیں؟ ٹیلی فون کی گھنٹی پہلے کبھی نہیں سنی؟''

مسٹر چو نے کہا۔ لیکن انہوں نے ریسیور اٹھایا تو جانے کیوں ان کا دل بھی بیٹھ رہا تھا۔

''ہیلو''۔

''یہ آپ بول رہے ہیں؟ اتنی دیر سے آپ لوگ کہاں تھے؟ بڑا حادثہ ہو گیا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے ہم کیا کریں ...'' جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی رونے کی آواز آنے لگی۔ مسز چو پیلی پڑ گئیں۔ مسٹر چو نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''کون بول رہا ہے؟ تم کون ہو؟'' مسٹر چو نے پوچھا مسٹر چو نے سوچا خدا کرے یہ رانگ نمبر ہو۔ رونے کی آواز اچانک بند ہو گئی۔

میں بورم کی ماں ہوں۔ آپ اس کے دادا بول رہے ہیں نا؟'' مسز چو نے اپنی تیز آواز میں کہا۔ بورم ان کا سب سے بڑا پوتا تھا۔

آپ لوگ اتنے آرام سے کیسے بیٹھے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں بورم کے خاندان کو کیا ہو گیا ہے۔ ان کی ٹرک کے ساتھ ٹکر ہو گئی۔ ہائے میری بیٹی۔ یہ کاریں تو ہماری دشمن ہیں۔''

''میرا خیال ہے آپ نے غلط نمبر پر فون کر لیا ہے۔ ہمارے کسی بچے کے پاس کار نہیں ہے۔'' مسٹر چو ریسیور رکھنے لگے تھے۔

''دو ہفتے پہلے انہوں نے کار خریدی تھی۔''

مسٹر چو کے ہاتھ سے ریسیور گر گیا۔ انہوں نے اپنی بیوی کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ وہ صدمے سے لرز رہی تھیں۔ لٹکتے ہوئے ریسیور سے اس آدمی کے رونے اور سسکیاں لینے کی آواز آ رہی تھی۔ یہ آواز ایسی تھی۔ جیسے کسی لاؤڈ سپیکر سے آ رہی ہو۔

وہ عورت ایسے رو رہی تھی کہ اس کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''صرف کار چلانے والا مرا ہے باقی شدید زخمی ہوئے ہیں۔ میرے شوہر فوراً ہسپتال پہنچ گئے ہیں۔ ابھی تک میری ان سے بات نہیں ہوئی ہے۔ میری بیٹی بھی کار چلاتی ہے۔ اسے تمہارے بیٹے سے پہلے لائسنس مل گیا تھا۔ میں آپ کو فون کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر آپ کا فون مستقل مصروف تھا۔ اب وہ ہسپتال میں ہیں۔ آپ سن رہے ہیں۔''

مسٹر چو اور ان کی بیوی صدمے سے سفید ہو گئے تھے۔ جیسے ٹیلی فون سے ڈر گئے ہوں۔ وہ ڈر سے ٹیلی فون کو گھورتے رہے۔ کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے ہاتھ لگاتا یا ریسیور اٹھا کر اوپر رکھتا۔

MashalBooks.com

ماما کی بازی

حصہ اول

مجھے بتایا گیا تھا کہ پہاڑی درہ پار کرتے ہی ہمیں سونگڈ و شہر نظر آنے لگے گا۔ وہ پہاڑی درہ چار دروں میں سے آخری تھا۔ یہ چاروں درے بک چوک کی وادی اور سونگڈ کے درمیان تھے۔ اب جیسا کہ توقع کی جاتی ہے آخری درہ پر سیدھی چڑھائی تھی۔ ایک ایسی آٹھ سال کی لڑکی کے لیے، جو پہلے ہی 20 ''لی'' (کوریا کا کلومیٹر) چل چکی ہو یہ چڑھائی بہت ہی مشکل تھی۔ لگتا تھا جیسے سر پر چڑھی چلی آ رہی ہو۔ مگر جیسے ہی وہ چڑھائی ختم ہوئی تو سامنے کھلا آسمان نظر آنے لگا۔ یوں لگا جیسے گھنے جنگل سے نکل کر کھلے میدان میں آ گئے ہوں۔ آسمان ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے چشمے کے شفاف پانی میں جھلک رہا ہو۔ ڈر کے مارے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

میں ماما اور نانی کے ساتھ چل رہی تھی۔ دونوں نے میرے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔ ان دونوں کے سروں پر بڑی بڑی گٹھریاں تھیں۔ جب میں تھک جاتی اور افسردہ نظروں سے ان کی طرف دیکھتی تو وہ دونوں میری بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مجھے اوپر اٹھا لیتیں اور میں جھونکے کھاتی ہوئی چلتی رہتی۔ مجھے اس طرح اٹھا کر وہ تیز تیز قدموں سے کچھ دور چلتیں اور پھر مجھے نیچے اتار دیتیں۔ میں جانتی تھی کہ سر پر بھاری گٹھریاں رکھے رکھے مجھے اس طرح اٹھانا ان کے لیے بہت مشکل تھا پھر بھی میں چاہتی تھی کہ وہ تھوڑی دور اور مجھے ایسے ہی اٹھا کر چلیں۔ میرا جھولا جھولنا بہت ہی مختصر ہوتا اور میں سوچتی ہی رہتی کہ یہ کچھ لمبا ہو جائے۔

مگر جیسے ہی ہم درے سے باہر آئے انہوں نے میری طرف توجہ دینا بند کر دی اب انہیں

میری تھکن یا میرے پیروں کے چھالوں کی کوئی پروا نہیں تھی بلکہ اب انہوں نے اتنی سختی سے میرے ہاتھ پکڑ رکھے تھے کہ مجھے درد ہونے لگا ان دونوں کے ہاتھوں کی جلد سخت تھی۔ مجھے ایک ان جانے شہر کی طرف گھسیٹ کر لے جایا جا رہا تھا۔ میرے دل میں عجیب عجیب خیال آ رہے تھے۔ میں چڑھائی چڑھ رہی تھی مگر میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

آخر ہم اوپر پہنچ گئے۔

''دیکھو وہ سونگڈ و ہے۔ یہ شہر ہے'' ماما نے ایسے فخر کے ساتھ کہا جیسے وہ شہر ان کی ملکیت ہو۔ آنکھوں کے سامنے نیچے پورا شہر یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا تھا۔

میں اپنی زندگی میں پہلی بار کوئی شہر دیکھ رہی تھی۔ اس شہر کی وسعت کے بجائے میں اس کی شان و شوکت سے زیادہ مرعوب ہو رہی تھی۔ سارا شہر دھوپ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میری آنکھیں تو صرف اتنی روشنی کی عادی تھیں جو مٹی گارے کی دیواروں اور گھاس پھوس کی چھت میں سما جاتی تھی اور وہ نرم نرم اور گرم گرم سی محسوس ہوتی تھی۔ اب دوپہر کی دھوپ دو منزلہ عمارتوں کی کھڑکیوں کے شیشے سے جھلک کر باہر آ رہی تھی۔ میرا سر چکرانے لگا جیسے سورج کی بے شمار کرنیں تیر کی طرح میری طرف آ رہی ہوں۔

میں نے شہر کے بارے میں اپنے دماغ میں جو تصویر بنائی تھی وہ اپنے ماموں کی وجہ سے تھی جو شہر سے آئے تھے۔ ان سے صرف ایک بار ملی تھی مگر انہیں دیکھ کر شہر کا نقشہ میرے دماغ میں آ گیا تھا۔ جب وہ آئے تھے تو میری ماں اور دادی پریشان ہو گئی تھیں وہ بار بار کہے جا رہی تھیں کہ ہمارے گاؤں میں ان کی خاطر مدارت کے لیے کچھ بھی تو نہیں ہے اور وہ شہر سے آئے ہیں اس طرح مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ شہر سے آئے ہیں مجھے وہ اچھے نہیں لگے تھے۔ انہوں نے کالا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ میرے لیے وہ پہلے آدمی نہیں تھے جنہیں میں نے کالا سوٹ پہنے دیکھا تھا۔ ان سے پہلے ایک آدمی سائیکل پر گاؤں کے قریب سے گذرا تھا اور بچوں نے شور مچا دیا تھا۔ ''پولیس والا، پولیس والا۔'' اور میں گھر سے نکل کر بھاگی تھیں میں نے پوری طرح تو اسے نہیں دیکھا تھا مگر اس کے سوٹ کی جو جھلک نظر آتی تھی وہ ماموں کے سوٹ کی طرح تھیں۔ مجھے ماموں کے سوٹ سے بھی زیادہ ان کی عینک بُری لگی تھی۔

ماما مجھ سے بھی پہلے میرے بڑے بھائی کو شہر لے گئی تھیں۔ جانے سے پہلے اس نے اپنی

MashalBooks.com

تمام چیزیں مجھے دے دی تھیں۔ میرے بھائی نے ہمارے گاؤں سے چار کلومیٹر دور ایک ایلیمنٹری اسکول میں پڑھا تھا۔ اس وقت وہ مڈل اسکول میں داخلے کے لیے شہر جا رہا تھا۔ اس کے پاس بہت اچھی اچھی چیزیں تھیں؛ جیسے غلیل، شٹل کاک، پتنگ، گولیاں، پھسلنے والی گاڑی، کریون، مقناطیس اور ٹوٹے شیشے کا ایک ٹکڑا ان سب میں مجھے جو چیز اچھی لگی وہ مقناطیس تھا۔ جب وہ کوئلوں کی انگیٹھی پر یہ مقناطیس گھماتا تھا تو ایک تماشہ سا لگتا تھا۔ دھات کی جو بھی چیز ہوتی وہ اس سے چپک جاتی سب سے زیادہ تو اسی وقت کہ جب دادی کی سوئی کھو گئی تھی۔ میں دن بھر اسے ڈھونڈتی رہی تھی۔ وہ سوئی میرے بھائی کی مقناطیس کے سرے پر چپکی تھی تو حیرت سے میرا برا حال ہو گیا۔ وہ سوئی مقناطیس کے سرے پر ایسے لرز رہی تھی جیسے کانٹے میں پھنسی مچھلی۔ اب وہ عجیب و غریب چیز میرے قبضے میں تھی۔

جانے سے پہلے میرے بھائی نے مجھے ایک اور حیرت ناک کھیل سکھایا تھا یہ کھیل شیشے کے موٹے ٹکڑے سے کھیلا جاتا تھا۔ اس نے بتایا کہ شیشے کا یہ گول ٹکڑا کاغذ اور دھوپ کے درمیان کیسے رکھا جائے کہ کاغذ میں آگ لگ جائے۔ دھوپ شیشے کے بیچ میں سے کاغذ پر ایسے پڑتی ہے جیسے ڈرل اور کاغذ کو جلا دیتی ہے۔ اس سے میرے اندر جو سنسنی پیدا ہوئی وہ ٹھنڈی بھی تھی اور گرم بھی۔ میں نے اسے دیکھنا شروع کیا تو دھوپ کی طرح میرا دل بھی دھڑک رہا تھا۔ اور جب کاغذ سے نیلا نیلا دھواں نکلنے لگا تو میرا دل جیسے گرمی سے تپ گیا۔ مگر میری ہڈیوں میں ٹھنڈسی اتر گئی۔ پھر مجھے زور سے پیشاب آنے لگا اس رات میں نے خواب میں اپنے آپ کو یہ کام خود کرتے دیکھا اور میرا بستر بھیگ گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن جب بھی مجھے وہ واقعہ یاد آتا ہے تو بزرگوں کی کہاوت یاد آجاتی ہے۔ ''دیا سلائی سے کھیلو گے تو رات کو سوتے میں پیشاب نکل جائے گا۔''

میرے بھائی نے وہ شیشہ مجھے دیا تو یہ نہیں کہا کہ اسے بڑوں کی نظروں سے دور رکھنا مگر میں نے اسے چھپا کر رکھا کیونکہ اس کے ساتھ میرا ایک جرم شامل ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے میں اس سے اس وقت کھیلتی تھی جب کوئی بڑا سامنے نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ایک دن وہ شیشہ میں نے سوکھی گھاس کے سامنے دیر تک رکھا تو اس میں آگ لگ گئی اور پورا گھر جلتے جلتے بچا۔ پورے گھر میں ہنگامہ ہو گیا اور میری ایسی پٹائی ہوئی کہ جسم پر نشان پڑ گئے۔

اور جب شہر والے ماموں آئے تو وہ آنکھوں پر وہی آگ جلانے والے شیشے لگائے ہوئے

تھے۔ وہ ایک شیشہ نہیں تھا بلکہ دو تھے ہر آنکھ پر ایک ان شیشوں سے جو چمک پڑ رہی تھی اس کی وجہ سے مجھے ان کی آنکھیں نظر نہیں آئیں۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور انہوں نے دونوں ہاتھ بھی میری طرف بڑھا رکھے تھے مگر میں ان کے پاس نہیں گئی میں دادی کے ''چی'' (کوریائی لہنگا) سے چمٹی کھڑی رہی۔ انہوں نے جیب سے ایک چمکتا ہوا سکہ نکالا اور مجھے دکھایا کہ شاید میں اس طرح مان جاؤں مگر مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ چمک دار چیز کیا ہے اس لیے میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھی۔ دادی کو میری یہ بات اچھی نہیں لگی۔ انہوں نے کھینچ کر مجھے ماموں کے پاس لے جانے کی کوشش کی۔ اس پر میں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اور پیر پٹخنے لگی۔

''رہنے دو بہنے دو، بہت شرمیلی معلوم ہوتی ہے'' ماموں نے کہا۔

''حیرت کی بات ہے یہ ایسی ہے تو نہیں۔''

دادی نے پھر مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

اس کے بعد سوائے عینک کے ماموں کی اور کوئی چیز یاد نہیں رہی۔

شہر کا چہرہ ایسا ہی تھا جیسے ان ماموں کا۔

چڑھائی والی سڑک کے مقابلے میں نیچے اترنے والی سڑک اتنی ڈھلواں نہیں تھی۔ میں نے چپکے سے اپنا ہاتھ ماما کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور دونوں ہاتھوں سے دادی کے ساتھ لپٹ گئی۔ گھر پر بھی میں ان سے لپٹا کرتی تھی۔ اب ان کا چیما پکڑنا آسان نہیں تھا۔ اور نہ اس سے مجھے ان کی وہ قربت محسوس ہو سکتی تھی جو گھر پر ہوتی تھی۔ ان کا چیا جس پر خوب کلف لگا ہوا تھا، ڈھل ڈھل کر نرم ہو گیا تھا اور اس کے کنارے تیز دھار کی طرح ہو گئے تھے۔ میں ماما کے ہاتھ چھوڑ کر اور دادی کے ساتھ لپٹ کر یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ مجھے زبردستی شہر لے جایا جا رہا ہے۔

دادی نے میری طرف داری کی تھی۔ ماما مجھے شہر لے جانا چاہتی تھیں مگر دادی نے اس کی مخالفت کی تھی۔ جب سے ماما مجھے لینے شہر سے گاؤں آئی تھیں تب سے دادی کے ساتھ ان کا جھگڑا چل رہا تھا۔ وہ دونوں آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ مگر مجھ سے کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ میں شہر تو کبھی نہیں گئی تھی مگر مجھے شہر اچھا نہیں لگتا تھا۔ بک جوک دادی ہی اپنا گھر مجھے جنت لگتا تھا۔ گھر کے پیچھے جو میدان تھا اس میں چھوٹی سی پہاڑی تھی جس پر اسٹرابیری کی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ موسم کے مطابق چیری، ناشپاتی، آڑو اور خوبانی کے پیڑوں پر خوب پھل

MashalBooks.com

لگتے تھے۔ ہمارا خاندانی قبرستان پہاڑی کے پیچھے تھا۔ وادی میں ٹھنڈا اور میٹھا پانی ملتا تھا اور وہاں دیودار اور اخروٹ کے بڑے بڑے پیڑ تھے۔ ہمارے ہاں کوئی دعوت ہوتی تو وہاں شامیانہ لگایا جاتا اور چٹائیاں بچھائی جاتیں تاکہ وہاں گاؤں بھر کے لوگوں کے لیے بیٹھنے کی جگہ ہو جائے۔ چٹائیوں کے اردگرد پھولوں کی کیاریاں ہوتی تھیں۔ میرے دادا کو گل داؤدی بہت پسند تھا اس لیے ان کی کیاریاں زیادہ تھیں۔ کوریا کے مقامی گل داؤدی اس وقت تک اپنی تازگی برقرار رکھتے ہیں جب تک خوب سردی نہ پڑنے لگے۔

جب گل داؤدی اپنی جوانی پر آتے تو دادا کی آواز میں اور بھی جان پڑ جاتی۔ لیکن اب کچھ عرصے سے ان کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کسی زمانے میں وہ ایک مشہور چینی نظم بہت پڑھا کرتے تھے' یہ نظم کوریا کے عالم فاضل لوگوں میں بہت پسند کی جاتی تھی۔ میرے دادا وہ نظم گایا کرتے تھے۔ اب صرف ان کے کھانسنے کی آواز آتی تھی یا جب وہ ایش ٹرے پر اپنا پائپ مارتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ گھر کے مردانہ حصے میں بھی کوئی رہتا ہے۔ اب تو ساون میں بھی ان کے کمرے کا دروازہ نہیں کھلتا تھا۔ بڑے بیٹے کے مرنے کے بعد دادا کو فالج ہو گیا تھا اور وہ گھر میں ہی بند ہو گئے تھے۔ میرے باپ کے مرنے سے ان پر بہت اثر ہوا تھا۔ اپنی اس جنت میں مجھے جو بھی بری بات یاد آتی وہ میرے باپ کے مرنے سے شروع ہوتی تھی۔

ایک دن میرے باپ کو انتہائی شدید درد اٹھا۔ وہ چوبی فرش پر گر گئے' پھر وہ پتھریلے صحن پر گرے اور وہاں سے لڑھکتے ہوئے برآمدے سے تین سیڑھیاں نیچے کچی زمین پر لیٹ گئے۔ انہوں نے مٹی میں ناخن گڑو رکھے تھے اور زمین پر لوٹ رہے تھے۔ فوراً مقامی ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے ان کے ہاتھوں اور پیروں میں چار مقام پر آکوپنکچر کی سلائیاں لگائیں کہ خون کی روانی معمول کے مطابق جاری رہے۔ ابھی جڑی بوٹیوں کی دوا تیار کی جا رہی تھی تو دادی نے انہیں جو کا پانی پلایا۔ دادا نے انہیں دل کی بیماری کی دوا دی اور ماما نے سینے کی جلن دور کرنے والی گولی ان کے منہ میں رکھی۔ اس کے باوجود کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ جڑی بوٹیوں سے جو دوا تیار کی گئی اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ماما اور دادی بھاگی بھاگی جھاڑ پھونک کرنے والے کے پاس پہنچیں اور اس سے مشورہ کیا۔ اس نے بتایا کہ اس گھر سے ارضی دیوتا ناراض ہو گئے ہیں۔ اس کے لیے کالا جادو کرنے کی ضرورت ہے۔ اس نے یقین دلایا کہ جیسے ہی بدروحیں اتارنے کے لیے تاریخ

مقرر کی جائے گی ان کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ انہوں نے فوراً تاریخ مقرر کی اور گھر آ گئیں۔ اس وقت تک میرے باپ ختم ہو چکے تھے۔

یہ ہمارے نئے مکان کی تعمیر کے تین سال سے بھی کم مدت میں ہوا۔ اس واقعے سے سارے گاؤں والے خوف زدہ ہو گئے۔ انہیں یقین آ گیا کہ ارضی دیوتا کتنے خطرناک ہیں۔ ماما کو اس پر بالکل اعتقاد نہیں تھا وہ تو صرف دادی کے لیے وہاں گئی تھیں۔ ماما کا خاندان شہر میں رہتا تھا اور شادی سے پہلے ہی وہ نئی دنیا سے خوب واقف ہو چکی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ میرے باپ کی بیماری کا علاج آپریشن کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا تھا کہ شہر سے کسی ڈاکٹر کو بلایا جاتا۔

میرے باپ کے مرنے کے بعد ماما نے شہر جانے کا سوچا۔ ان کا یہ خواب اس وقت پورا ہوا جب میرا بھائی بروقت ایلیمنٹری اسکول سے فارغ ہوا۔ میرے باپ کی تیسری برسی سے پہلے ہی میری ماں بھائی کے ساتھ شہر چلی گئیں۔ سب سے بڑی بہوں ہونے کی وجہ سے یہ میری ماں کا فرض تھا کہ وہ اپنے ساس سسر کے کھانے پینے کا انتظام کریں اور بزرگوں کی یاد میں مذہبی رسوم ادا کرتی رہیں۔ اس ذمہ داری سے انہوں نے اپنے آپ کو اسی طرح چھڑایا کہ اپنے شوہر کی جائیداد میں اپنے حصے سے دستبردار ہو گئیں۔ انہوں نے اس گھر کے ایک چمچ تک کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ کپڑے سینے کی ماہر تھیں۔ اپنی اس مہارت پر بھروسہ کرتے ہوئے وہ بیٹے کو ساتھ لے کر شہر چلی گئیں اگر وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتیں تو دادی سے ان کا ہمیشہ کے لیے جھگڑا ہو جاتا اس لیے وہ مجھے چھوڑ گئیں تھیں۔ ماما میرے بھائی کو لے کر چلی گئیں۔

گھر کے بزرگ جانتے تھے کہ وہ اپنی بہو کو اس کام سے نہیں روک سکتے۔ اگر وہ اس کی مخالفت کریں گے تو جھگڑا اور بھی بڑھ جائے گا اور خاندان کی بدنامی ہو گی انہوں نے اپنے خاندان کی عزت کی خاطر میری ماں کی بات مان لی تھی۔ انہیں امید تھی کہ میری ماں اپنے بیٹے کی اچھی پرورش کریں گی۔ اور اس کا کامیاب مستقبل بنائیں گی۔ اس لیے ماما کی پہلی روانگی نسبتاً زیادہ پرسکون تھی۔

البتہ ان کے اس فیصلے نے کہ ان کا بیٹا ہر قیمت پر کامیابی حاصل کرے لڑکے کے سر پر بہت بڑا بوجھ ڈال دیا تھا۔

MashalBooks.com

وہ ایلیمنٹری اسکول سے فارغ ہوا تھا۔ دادا دادی کی توقعات نے اس بوجھ کو اور بھی بھاری کر دیا تھا۔ میں اپنے بھائی سے بہت پیار کرتی تھی اور مجھے بھی اس کی ذمہ داریوں کا بہت احساس تھا نو عمر لڑکیوں کی طرح مجھے سونگڈ یا سیول جانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ مجھے تو شہر کے نام سے ہی ڈر لگتا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ شہر جانے سے ہی آپ کے ساتھ یہ توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں کہ وہاں جا کر آپ ضرور کامیاب ہوں گے۔

کسی نہ کسی وجہ سے میرے باپ کے دونوں بھائیوں کے کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اور پھر وہ کوئی خاص کام بھی نہیں کر رہے تھے۔ اس کے برعکس میرا بھائی' جو خاندان کا سب سے بڑا پوتا تھا' بہت ہی ذہین اور خوش شکل تھا۔ وہ ایک کلاس اوپر چڑھ گیا تھا اور دوسرے بچوں کے مقابلے میں وہ ایک سال پہلے ہی اسکول سے فارغ ہو گیا تھا۔ آس پاس کے تمام گاؤں میں اس کی ذہانت اور محنت کی شہرت تھی۔ میرا بھائی ابھی لڑکا ہی تھا کہ اس سے پورے خاندان کی حالت سدھارنے کی امید لگا لی گئی تھی۔

مجھے بھائی بہت یاد آتا' مگر اس سے ملنے شہر جانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ مجھے ماما اتنی یاد نہیں آتی تھیں۔ میں ابھی بہت چھوٹی تھی میں نہیں جانتی تھی کہ ذمہ داری کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ میں نے دو اور دو چار کر کے سوچا کہ شہر نے میرے بھائی کو اپنے پھندے میں پھانس لیا ہے۔ ماما کے جانے کے بعد میں دادی کی آنکھ کا تارہ بن گئی تھی۔ چچا اور چچیاں بھی مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ میں ان سے کچھ مانگتی بھی نہیں تھی۔ میں تو ایک آزاد گائے کی طرح تھی۔ جس چیز سے مجھے سب سے زیادہ ڈر لگتا تھا وہ یہ تھی کہ کہیں شہر مجھے بھی اپنے پھندے میں نہ پھنسا لے۔

لیکن ایک دن میری ماں مجھے لینے آ گئیں۔ میں دادی سے لپٹ گئی اور غصے سے ماما کو دیکھنے لگی۔ میں نے انہیں بہت دن سے نہیں دیکھا تھا۔ میں ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔

اس طرح دادی اور ماما میں تو تو میں میں شروع ہو گئی پہلے تو دادی نے ماما کو سمجھایا کہ وہ مجھے اس لیے نہیں چھوڑنا چاہیں کہ ماما پر بوجھ بڑھ جائے گا۔ انہوں نے کہا مجھے شہر لے جانے سے انہیں ایک اور بچے کو پالنا پڑے گا۔ ویسے بھی وہ ایک اجنبی جگہ پر مشکل سے ہی گذر بسر کر رہی ہیں۔ اس طرح بن باپ کی بچی کو پالنا بہت مشکل ہے۔

''اسی لیے تو میں اسے اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔ ہر حالت میں بچی کو اپنی ماں کے ساتھ

ہی رہنا چاہیے۔ میں نہیں چاہتی کہ بن باپ کی بچی اپنی ماں سے بھی دور رہے۔''

ماما کی یہ دلیل سن کر دادی نے اپنا انداز بدلا اور وہ رونے لگیں۔

''تمہارے تو سینے میں دل ہی نہیں ہے۔ تمہیں معلوم نہیں میرے لیے یہی تو ایک خوشی ہے۔ اس کے کھیل کود اور پیاری پیاری باتوں سے ہی تو ہماری زندگی میں خوشیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری دوسری بہو کے بچہ پیدا ہو جائے گا تو میں یہ ضد کبھی نہ کرتی۔ تیسری بہو کے جلدی بچہ ہونے والا ہے۔ اس کے بعد میں تمہاری بات مان لوں گی۔

''نہیں اماں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کے اسکول جانے کی یہی عمر ہے۔''

''اسکول؟ لڑکی کو اسکول بھیجو گی؟''

''جی' لڑکی کو بھی پڑھنے کی ضرورت ہے۔''

تم شہر میں کیا کرتی رہی ہو؟ کہیں سے خزانہ مل گیا ہے تمہیں؟ یا دماغ چل گیا ہے؟ بھلا لڑکی کو کیسے اسکول بھیج سکتی ہو؟ لڑکی کو اسکول بھیجو گی؟''

ان کا جھگڑا بڑھتا ہی گیا جیسے آگ پر تیل چھڑکا جا رہا ہو۔ جب بھی جھگڑا ہوتا میں دادی کی طرف داری کرتی۔ اس طرف دادی کا طریقہ یہ ہوتا کہ میں دادی کے ساتھ لپٹ جاتی اور ماما کو گھورتی رہتی۔

ایک دن ایک ایسا واقعہ ہوا کہ ماما کے ساتھ میرا جانا مجبوری بن گیا۔ جب سے وہ گاؤں آئی تھیں روزانہ وہ میرے بالوں میں کنگھی کرتی تھیں۔ میں انکار نہیں کر سکتی تھی۔ میرے بال اتنے لمبے اور گھنے نہیں تھے کہ ان کی ایک چوٹی بن جاتی اور اس پر خوبصورت ربن لگا دیا جاتا۔ میرے بالوں کی کئی چھوٹی چھوٹی چوٹیاں گوندھی جاتی تھیں۔ ان چوٹیوں کے سرے اکٹھے کیے جاتے اور ان پر ربن باندھ دیا جاتا۔ یہ میرا ہیئر اسٹائل تھا۔ کنگھی کرانے سے میری جان جاتی تھی۔ میرے بال کہیں سے سیدھے تھے اور کہیں سے گھنگھریالے۔ مجھے سب سے زیادہ وہی وقت یاد آتا ہے جب ماما میرے بال بناتی تھیں۔

یہ سلیقہ میری دادی یا میری چچیوں میں نہیں تھا۔ ماما ہی ماہر تھیں اس کام کی۔

ماما میرے سر کے بیچ میں سے بالوں کے برابر چھ حصے کرتیں پھر ان کی ایسی کس کر مینڈھیاں بناتیں کہ میں چاہے کتنی ہی اچھل کود کرتی ان میں سے ایک بال بھی باہر نہ نکلتا۔ جب سے ماما شہر

MashalBooks.com

گئی تھیں میرے بال ایسے خراب ہوئے تھے کہ میرا چہرہ ٹیڑھا ترچھا لگنے لگا تھا۔ میں چچی کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی تو مجھے اپنی ماں یاد آجاتیں۔ تھوڑی دیر کے لیے میں پریشان ہوجاتی لیکن پھر سب بھول بھال جاتی۔ میرے لیے لڑکی کے بجائے لڑکا ہونا آسان تھا اس لیے آئینے پر مجھے غصہ آتا تھا۔

اپنا غصہ دکھانے کے لیے میں ماما سے دور رہتی تھی۔ مگر ان سے بالوں میں کنگھی کرالیتی تھی۔ مجھے خوبصورت ہیئر اسٹائل بنوانے کا ایسا شوق نہیں تھا مجھے تو اپنے سر پر ماما کی ملائم ملائم انگلیاں پھرتی اچھی لگتی تھیں۔ اس وقت میں بھول جاتی تھی کہ وہ مجھے دادی سے چھین کر شہر لے جائیں گی۔

مگر ایک دن ماما کی چالاکی دیکھ کر میرا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ انہوں نے ظاہر تو یہ کیا کہ وہ میرے بال بنا رہی ہیں لیکن اچانک انہوں نے میرے بال کاٹ دیئے۔ انہوں نے گردن پر سے بال کاٹنے کے بجائے اوپر سے کاٹے۔ میری شکل عجیب سی ہوگئی تھی۔ میں نے بڑے آئینے میں اپنی گردن دیکھی اور حیران رہ گئی۔ مگر میں روئی نہیں۔ میرے سر کا پچھلا حصہ ایسے کھلا ہوا تھا جیسے بھٹی کا دہانہ اور اس کی سفیدی نمایاں ہوگئی تھی۔ مجھے ایسے لگا جیسے ماما نے میرے منہ پر مٹی مل دی ہو۔ پہلے انہوں نے میرے بال خراب کیے پھر میرا چہرہ بگاڑ دیا۔ اس کے بعد وہ میرے سر کے اس حصہ پر انگلیاں پھیرنے لگیں۔ مگر اب بہت دیر ہوچکی تھی۔ اب انہوں نے سر کے پیچھے بالوں کے حساب سے باقی بال بھی چھوٹے کرنا شروع کیے۔ سامنے کے بال بھی بہت چھوٹے ہوگئے اور میرے کان بڑے بڑے نظر آنے لگے۔

''پسند نہیں آئے؟۔ انہیں دھونا اور کنگھی کرنا آسان ہوگا۔ اور یہ اچھے بھی لگ رہے ہیں۔ سیول میں ہر لڑکی کے ایسے ہی بال ہیں اور وہ اسکول جاتی ہیں۔ سیول میں تم بھی اسکول جاؤ گی۔ تمہیں پڑھ لکھ کر نئے زمانے کی لڑکی بننا چاہیے۔ سمجھ رہی ہو نا؟'' ماما میرے کان پر کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ میں بالکل نہیں جانتی تھی کہ نئے زمانے کی لڑکی کیا ہوتی ہے۔ ہاں' یہ ضرور جانتی تھی کہ ماما مجھے شہر لے جانے کے لیے ایسے ہی پھنسا رہی ہیں جیسے میرے بھائی کو پھانسا تھا۔ جانے میں نے اس پر احتجاج کیوں نہیں کیا۔ بس میں تڑپ کر رہ گئی۔ میرے بال شہر کے لیے کاٹے گئے تھے۔ ایسے بدنما بالوں کے ساتھ میں گاؤں میں نہیں رہ سکتی۔

جیسے مجھے شہر کے لیے تیار کیا جارہا تھا۔ ویسے ہی دادی کو بھی منایا جارہا تھا۔ انہوں نے ماما کے لیے چیزیں اکٹھا کرنا شروع کردی تھیں۔ ماما جب میرے بھائی کو لے کر گئی تھیں اس وقت ان کے ساتھ اتنا اچھا سلوک نہیں کیا گیا تھا جتنا اب کیا جارہا تھا۔ جب ہم دادا کو الوداع کہنے گئے تو انہوں نے میرے بال دیکھ کر برا سا منہ بنایا اور ایسے منہ پھیر لیا جیسے وہ کوئی کیڑا کھا گئے ہوں۔ پھر بھی انہوں نے میرے لیے ماما کو چاندی کے سکے دیے۔ پھر انہوں نے تڑے مڑے نوٹ نکالے' احتیاط سے انہیں صاف کیا اور وہ بھی ماما کو دے دیے۔ پھر انہوں نے دادی کو ہدایت کی کہ ریلوے اسٹیشن تک وہ مجھے اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لے جائیں۔ دادی نے کہا' انہوں نے پہلے ہی یہ سوچ رکھا تھا۔

''یہ تو آدھے مر چکے ہیں۔'' انہوں نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کہا۔ دادی نے دادا کی بات نہیں مانی اور وہ مجھے پیدل ہی چلا کر لے گئیں۔ ان کے سر پر بڑی سی گٹھری تھی۔ انہوں نے ماما کے سر پر اس سے بھی بڑی گٹھری رکھ دی۔ وہ انہیں بہت سے تحفے دینا چاہتی تھیں۔ میرے بھائی کے جانے پر دادی اور ماما میں خوب جھگڑے ہوئے تھے لیکن اب دادی ان کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنا چاہتی تھیں۔ وہ اپنے پوتا پوتی کے شہر میں رہنے پر راضی ہوچکی تھیں۔ شاید انہیں میرے روشن مستقبل کی امید ہوگئی تھی۔

لیکن جب میں نے ماما کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور دادی کے ساتھ لپٹ گئی تو ان کے دل میں پھر میل آگیا۔ میں نے ان دونوں کی گھورتی آنکھیں دیکھیں تو محسوس ہوا کہ میں نے اپنے دل کی بات ان دونوں تک پہنچادی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر دادی نے زیادہ سختی کے ساتھ میری طرف داری کی تو میں ان کا چیما کبھی نہیں چھوڑوں گی۔

سونگڈو کا پہلا تاثر بہت ہی شاندار تھا۔ میں نے سوچا سیول اس سے بھی زیادہ عالی شان ہوگا۔ لیکن شہر کا اپنا ایک پھندا تھا۔ میں ڈرتی تھی کہ شہر مجھے کچھ اور ہی بنادے گا۔ میں نئے زمانے کی عورت نہیں بننا چاہتی تھی جو ماما سوچ رہی تھیں۔

''تھوڑا آرام کرلیں؟'' دادی نے کہا ان کی آواز ایسی تھی جیسے برفانی ہوا۔

''اچھا اماں'' ماما کی آواز بھی ایسی ہی تیز تھی جیسے دادی کی۔ مجھے ڈر لگا کہ وہ پھر میرے بارے میں جھگڑا شروع کردیں گی۔ درے سے اترتے ہوئے راستے میں بہت سے بڑے بڑے

MashalBooks.com

پتھر پڑے تھے۔ کچھ سیدھے کھڑے تھے اور کچھ یونہی پڑے تھے۔ ڈریسر واک درے کا نام ان پتھروں کی وجہ سے ہی پڑا تھا۔ ان پتھروں کے درمیان بہت ہی خوبصورت میدان تھا جس میں برفیلے ٹھنڈے پانی کا چشمہ تھا۔ یہ ان سوداگروں اور سیاحوں کے لیے نخلستان کی حیثیت رکھتا تھا جو سونگڈ وجا رہے ہوں۔ وہاں سے سارے شہر کا نظارہ بھی کیا جا سکتا تھا۔

دادی نے اپنی گٹھری ایک پتھر پر رکھ دی جو چاول کیک بنانے والی سل کی طرح تھا۔ ماما نے بھی اپنی گٹھری سر سے اتار دی۔ ان دونوں کے درمیان تلخی برقرار تھی۔ میں نے دادی کے چیا کا سرا اور بھی زور سے پکڑ رکھا تھا۔ اچانک ایک جھٹکے سے انہوں نے اپنا چیما میرے ہاتھ سے کھینچا۔ اس کے بعد ایک عجیب وغریب حرکت کی انہوں نے۔ انہوں نے مجھے اوپر اٹھایا اور پتھر پر اوندھا لٹا دیا۔ پھر میرا چیما اٹھا کر میرا انڈرویئر کھینچ لیا۔ اور میرے کولھوں پر تھپڑ مارنا شروع کر دیے۔ ایسے تھپڑ میں نے پہلے کبھی نہیں کھائے تھے میں چیخ رہی تھی اور وہ مارے جا رہی تھیں۔ مگر ماما بھی خاموشی سے کھڑی سونگڈو کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''تم دادی کو بہت تنگ کرتی ہو۔ تم بہت خراب لڑکی ہو۔'' وہ یہ کہتی جا رہی تھیں اور مارے جا رہی تھیں۔ ان کی چیخیں رونے میں بدل گئی تھیں۔

''بس بہت ہو گیا''۔ ماما نے بہت ہی سکون سے کہا۔ دادی کے تھپڑ بند ہو گئے۔ میں کھڑی ہو گئی اور اپنا انڈرویئر اوپر کیا دادی کی آنکھیں ایسی لال تھیں جیسے انار کی کلی۔

''دادی' آپ کی آنکھوں میں پھر تکلیف ہو گئی ہے؟'' میں نے روتے ہوئے ان کی لال لال آنکھوں کو دیکھا۔ مجھے اب بھی امید تھی کہ وہ میرا ساتھ دیں گی۔

''ہاں تکلیف ہے۔'' دادی نے رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

''میرے بعد تالاب سے جونکیں پکڑ کر کون لائے گا؟'' میں نے کہا۔ دادی کی آنکھیں کبھی کبھی دکھنے آجاتی تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ ان کے خون میں کوئی خرابی ہے کیونکہ آنکھیں سرخ تو ہو جاتی تھیں مگر ان میں پیپ نہیں پڑتی تھی۔ گاؤں میں مشہور تھا کہ اس کا آسان علاج یہ ہے کہ آنکھوں کے پاس جونکیں لگائی جائیں تاکہ وہ گندا خون چوس لیں۔ یہ میرا کام تھا کہ میں دھان کے کھیتوں یا جاپانی اجوائن کے کھیتوں سے جونکیں پکڑ کر لاتی اور ٹب میں ڈال دیتی۔ دادی اپنے پیوٹے اوپر کرتیں اور ایک ایک جونک ان پر لگا دیتیں جونکیں خوب جی بھر کر خون پی لیتیں تو وہ

پھول جاتیں اور خود ہی دادی کی آنکھوں سے نیچے گر جاتیں۔ وہ خوش ہو کر کہتیں کہ اب انہیں بہت آرام ہے اور پھر مجھے جونکیں لانے پر شاباش دیتیں۔

اس وقت بھی میں نے انہیں خوش کرنے کے لیے جونکیں یاد دلائی تھیں کہ وہ میرا ساتھ دیں۔ مگر یوں کوشش بیکار رہی گئی۔

''تم میری بہت اچھی پوتی ہو کہ تم نے مجھے اپنا جونکیں لانا یاد دلایا ہے۔ مگر اب تم اپنی دادی کے لیے سیول سے اچھی اچھی دوائیں لاؤ گی اس کے بعد مجھے جونکوں کی کیا ضرورت ہو گی۔'' دادی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا مجھے ایسا لگا جیسے وہ زبردستی مسکرا رہی ہوں۔

''جی اماں آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہاں آنکھوں کی بہت ہی اچھی دوائیں ملتی ہیں۔ چھٹیوں میں بچوں کو لے کر آؤں گی تو دوا بھی لیتی آؤں گی۔'' ماما نے جلدی جلدی کہا۔

ہم پھر چلنے لگے۔ اب دادی نے میرا ہاتھ نہیں پکڑا تھا۔ بلکہ وہ مجھ سے آگے چل رہی تھیں۔ ان کا سوتی چیما ہوا میں اڑ رہا تھا ہم شہر کے وسط میں داخل ہو رہے تھے۔ ہم تو قریب پہنچ تو شہر کی روشنیاں مدہم ہو گئیں۔ پورا شہر ایک ترتیب کے ساتھ بنا ہوا تھا۔ بڑی سڑک اس سے نکلتی ہوئی چھوٹی سڑکیں' دونوں طرف ایسی سیدھی عمارتیں جیسے انہیں رولر رکھ کر بنایا گیا ہو۔

''تیز تیز چلو ورنہ ریل گاڑی نکل جائے گی۔ اور لڑکی تم اتنی زیادہ حیرت نہ کرو۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ سیول دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔

ماما مجھے کھینچ رہی تھیں۔

''ارے اسے چلنے دو۔'' دادی نے میری حمایت کی' کیا سیول اس سے بھی اچھا شہر ہے' یہ تو سونگڈ بھی پہلی بار دیکھ رہی ہے۔

''یہ تو پاگلوں کی طرح چل رہی ہے۔''

''تم بھی تو اتنی جلدی کر رہی ہو۔ تمہارا خیال ہے یہ ابھی سے شہر کی لڑکی بن گئی ہے؟''

دادی نے ماما کو شرمندہ کیا۔ ماما خاموش رہیں لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے ایسا لگا جیسے میں دونوں سے لاتعلق ہو رہی ہوں۔ شاید اس کی وجہ میری پریشانی ہو۔ مجھے اس شہر میں کوئی بھی خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ وہاں ہر آدمی خوب بنا ٹھنا تھا۔ ہر ایک سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ چھتوں کی ٹائلیں

MashalBooks.com

چمک رہی تھیں۔ اونچے اونچے دو منزلہ مکان اور صاف ستھری سڑکیں ایسی چمک دمک تھی کہ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ دوکانوں میں عجیب وغریب رنگ برنگی چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ اور چاروں طرف سے بھانت بھانت کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہر طرف ایک گہما گہمی تھی جیسے کسی نے حکم دیا ہو یہ سب کام کرنے کا۔ میں ہکا بکا ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر شہر میں رہنا ہے تو ان تمام چیزوں کا عادی ہونا پڑے گا۔ وہاں مجھے ڈر لگنے لگا تھا۔ ماما نے کہا تھا کہ سیول کے مقابلے میں یہ بہت چھوٹا شہر ہے۔ میں نے اپنے پیروں میں درد کی شکایت کی تو انہوں نے پھر سیول کی تعریف شروع کر دی۔ اگر ہم سیول میں ہوتے تو آرام سے بس میں بیٹھ کر جہاں بھی چاہتے چلے جاتے۔''

میں نے سونگڈ و میں جتنے بھی گھر دیکھے تھے کیونگ کا ریلوے اسٹیشن ان سب سے بڑا تھا اس کی گول چھت' اونچی اونچی دیواریں' سرخ اینٹیں اور ریل کی پٹری جو دور دور کے شہروں تک چلی جاتی تھی۔ وہاں لوگ چلنے کے بجائے دوڑ رہے تھے۔ میرے بدن میں سنسنی سی ہو رہی تھی۔ اور ماما مجھے تسلی دینے کے بجائے میری طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔

کیونگ ریلوے اسٹیشن کی عمارت کیونگ سونگ کے اسٹیشن کی طرح ہی تھی۔ مگر میں جانتی تھی کہ اس کے مقابلے میں ہمارے گاؤں کا اسٹیشن بچوں کے کھلونے کے برابر ہے۔ دادی اور میں ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور ماما ٹکٹ لینے چلی گئیں۔ دادی نے پہاڑی درے کے پاس میرے تھپڑ مارے تھے اس لیے اب میں ان سے ناراض تھی۔ انہوں نے اپنی گٹھری میں ہاتھ ڈالا اور جوار کا کیک نکال کر میری طرف بڑھایا۔ مجھے یہ کیک بہت اچھا لگتا تھا۔ اور دکانوں میں رکھا ہوا یہ کیک دیکھ کر میرا دل بہت للچاتا تھا۔ اب بھی اسے دیکھ کر میری رال ٹپکنے لگی تھی اور مجھے بھوک بھی لگی ہوئی تھی مگر میں نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے زور زور سے انکار میں سر ہلایا۔ مجھے دادی کی لال لال آنکھیں دیکھ کر غصہ آرہا تھا۔ اور وہ کیک مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ کیک لمبی شکر قندی کی طرح تھا۔

''اوہو'' تم ابھی تک ناراض ہو؟ تمہیں معلوم نہیں تمہاری دادی نے تمہیں کیوں مارا تھا؟۔

دادی نے مجھے پکڑا اور کھینچ کر اپنی گود میں بٹھالیا۔

پھر انہوں نے جہاں تھپڑ مارے تھے وہاں سہلانا شروع کر دیا۔

''میری بچی' دیکھوں تو کیسی لال ہوگئی ہے وہ جگہ۔'' دادی بڑبڑائیں کچھ عورتوں کے ہاتھوں میں کانٹے ہوتے ہیں مگر تمہاری دادی کے ہاتھ ایسے نہیں ہیں۔ اچھا لاؤ میں سہلا دوں ...''

ماما دو ٹکٹ لائیں اور ایک دادی کو دے دیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پلیٹ فارم ٹکٹ تھا۔

''اچھا تو پلیٹ فارم پر جانے کے لیے بھی یہاں ٹکٹ ہوتا ہے؟ یہ شہر والے کتنے خراب ہیں۔'' دادی اس زور سے چیخیں کہ آس پاس کھڑے لوگ گھبرا کر ہمیں دیکھنے لگے۔

''یہ اتنا مہنگا نہیں ہے۔ بہت سستا ہے۔''

دادی اور ماما نے اپنی گٹھریاں سر پر رکھیں اور قطار میں کھڑی ہونے گئیں۔ ہم ٹکٹ دکھاتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور پل پر چڑھ کر ریل گاڑی تک پہنچے اور جلدی جلدی اپنی نشستیں تلاش کر لیں۔ یہ سب جیسے پلک جھپکتے ہو گیا۔ ماما نے اپنی گٹھری اوپر رکھی اور مجھے کھڑکی کے ساتھ بٹھا دیا۔ دادی باہر کھڑی تھیں۔ ہمارے درمیان ایک کھڑکی ہی تھی مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ہم سے بہت دور کھڑی ہیں۔ میں ہمیشہ دادی کے بہت قریب رہی تھی۔ یہ پہلی مرتبہ تھی کہ وہ مجھ سے اتنی دور کھڑی معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کی وجہ شاید یہ فاصلہ نہیں تھا بلکہ یہ احساس تھا کہ میں ان سے کہیں دور جا رہی ہوں۔ ریل گاڑی ابھی کھڑی تھی اور دادی بھی ویسے ہی باہر کھڑی تھیں۔ ان کے کھڑے ہونے کی وجہ سے یہ انتظار اور بھی کٹھن لگ رہا تھا۔

ریل گاڑی نے چلنا شروع کیا۔ دوسرے لوگ جو اپنے عزیزوں کو چھوڑنے آئے تھے وہ تو گاڑی کے ساتھ چلتے رہے مگر دادی وہیں کھڑی رہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نظروں سے دور ہو گئیں۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں نے اچھل کر سیٹ کی پشت سے اپنی پیٹھ لگائی اور دیکھا کہ وہ سیٹ کتنی نرم ہے۔ پھر اپنے نیچے کپڑے پر ہاتھ پھیرا۔ وہ کپڑا ایسا نرم تھا جیسے مرغی کے چوزے کے پر یا موسم بہار کے شروع میں جو کی ہری ہری بالیاں۔

جب بھی گاڑی کھڑی ہوتی تو ماما مجھ سے کہتیں۔ ''گنتی کرو اب سیول تک کتنے اسٹیشن رہ گئے ہیں۔ گیونگ چونکہ گھڑی دسواں سٹاپ تھا اس لیے میرے لیے انگلیوں پر گننا آسان تھا۔ گاڑی سیول کے قریب پہنچی تو میں نے ماما کو ایسے دیکھا جیسے وہ سیول کی ملکہ ہوں۔ ماما نے کہا تھا کہ سیول پہنچنے کے بعد تم ماڈرن لڑکی بنو گی''۔

MashalBooks.com

''یہ ماڈرن لڑکی کیسی ہوتی ہے ماما؟''

''صرف سیول میں رہنے سے کوئی ماڈرن لڑکی نہیں بن جاتی اس کے لیے تمہیں بہت کچھ سیکھنا پڑے گا۔ تمہارے بال بنائے جائیں گے۔ تم ایسا سیاہ اسکرٹ پہنو گی جس سے تمہاری پنڈلیاں نظر آئیں گی کہ اونچی ایڑی کے جوتے پہنو گی اور ہاتھ میں پرس رکھو گی۔''

میں نہیں جانتی تھی کہ ماما کیا کہہ رہی ہیں مگر ماما جانتی تھیں۔ انہوں نے گاڑی کے ڈبے میں چاروں طرف دیکھا اور ایک عورت کی طرف اشارہ کیا جس کے لہروں والے بال تھے اور اس کے سر پر بالوں کا گچھا سا بنا ہوا تھا۔ اس کی گود میں ایک پرس بھی رکھا تھا۔ ماما مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ ماڈرن عورت کیسی ہوتی ہے۔ اس ڈبے میں کوئی ایک عورت بھی ان کے معیار پر پوری نہیں اتر رہی تھی۔ ماما کے چہرے کے رنگ دیکھ دیکھ کر مجھے مایوسی ہو رہی تھی۔ میرا دل بالکل نہیں چاہتا تھا کہ میں ایسی عورت بنوں۔ میں تو چاہتی تھی کہ میرے لمبے لمبے بال ہوں اور چوٹی کے سرے پر قرمزی رنگ کا ربن لگا ہو۔ میں اسی رنگ کا کوریا کا خاص چیما اسکرٹ پہننا چاہتی تھی جو پیچھے سے تھوڑا سا کھلا ہوتا ہے۔ کوری چیما کے نیچے سے میرے بوسون (کوریا کی خاص جرابیں) میرے کوتشنی (کوریا کے خاص پھولدار جوتے) کے اوپر مشکل سے ہی نظر آتے ہوں میں چاہتی تھی کہ زرد رنگ کا چوکوری (کوریا کا خاص بلاؤز جو وہاں عورتیں پہنتی ہیں) پہنوں اور اس پر آلو بخارے کے رنگ کی ٹائی لگاؤں۔ اس زمانے میں مجھے شوخ رنگ بہت اچھے لگتے تھے۔ اس لیے مجھے سیاہ اسکرٹ، سیاہ جوتوں اور کالے پرس کی بات بالکل اچھی نہیں لگی۔ ماما کو ہی ایسی ماڈرن عورت پسند تھی۔

''اچھا ... ماڈرن عورت کیا کرتی ہے؟'' میں نے ماما سے پوچھا۔ میرے دماغ میں تو طرح طرح کے رنگ سمائے ہوئے تھے اور میں ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

ماما نے فوراً اس کا جواب نہیں دیا۔ جیسے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہیں۔ ان کے چہرے پر یہ تاثر میں نے اس وقت دیکھا تھا جب وہ اپنا کوئی غم چھپانا چاہتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ ماما یہ ظاہر کرنا چاہتی ہیں کہ انہیں سب کچھ معلوم ہے حالانکہ وہ بہت سی باتیں نہیں جانتیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا۔

''ماڈرن عورت وہ ہوتی ہے جو پڑھی لکھی ہو اور دنیا بھر کے معاملات کے بارے میں جانتی

ہو۔ اگر وہ ایک بار تہیہ کر لے تو ہر کام کر سکتی ہے۔'' ماما نے اٹک اٹک کر کہا۔

چونکہ میں ماما سے بہت زیادہ توقع کر رہی تھی اس لیے میں نے اپنے دماغ میں ماڈرن عورت کی جو تصویر بنائی ہوئی تھی۔ اس سے بھی زیادہ مجھے ماما کی باتوں سے مایوسی ہوئی۔ بہر حال مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہو رہا تھا کہ ماڈرن عورت کی واقعی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ پھر بھی میرے اندر یہ ہمت نہیں تھی کہ میں انہیں بتاتی میں ماڈرن عورت نہیں بننا چاہتی۔ ریل گاڑی سیول کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔

ہم کیونگ سونگ اسٹیشن پر اترے تو شام ہو رہی تھی۔ جیسا میں نے سوچا تھا یہ ریلوے اسٹیشن بہت ہی بڑا تھا۔ بلکہ وہ تو اتنا بڑا تھا کہ مجھے ایک نظر میں اسے دیکھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ میں زندگی میں پہلی بار لوگوں کے اتنے بڑے ہجوم میں پھنسی تھی۔ یہ ہجوم دھکے دے رہا تھا اور ہمیں آگے بڑھا رہا تھا۔ اتنے بہت سے لوگ دیکھ کر مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں میں ماما سے بچھڑ نہ جاؤں۔ انہوں نے تین گٹھریاں اٹھا رکھی تھیں۔ ایک گٹھری ان کے سر پر تھی اور باقی دو ایک ایک ہاتھ میں پل کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انہوں نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ مجھے اپنے چیما کا دامن بھی نہیں پکڑنے دے رہی تھیں۔

ہم جلدی جلدی ہجوم کو چیرتے ہوئے نکلے اور باہر آ گئے باہر ہمیں قلیوں نے گھیر لیا۔ ایک قلی نے ماما سے گٹھری چھیننے کی کوشش کی تو ماما نے اپنی ٹھوڑی سے اشارہ کیا کہ ہمارا گھر سڑک کے پار ہی ہے۔ انہوں نے جلدی سے اپنی گٹھری چھڑائی اور قلیوں کے نرغے سے نکلتی ہوئی بھاگیں۔ میں ان کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ مگر قلی بھی کہاں پیچھا چھوڑنے والے تھے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ ہی چلتے رہے۔

''ہیون جوڈونگ تک کے کتنے پیسے لو گے؟''

''واہ واہ' آپ تو کہہ رہی تھیں کہ آپ کا گھر قریب ہے۔ ہیون جوڈونگ تو اتنا قریب نہیں ہے۔'' میں نے ان کے چہروں پر حقارت دیکھی۔

شہر کے ہجوم میں ماما بہت چھوٹی اور میلی کچیلی لگ رہی تھیں۔ اس سفر میں انہوں نے اپنے سر سے کئی بار گٹھری اتاری تھی اور پھر رکھی تھی اس لیے ان کے بال بکھر گئے تھے اور بالوں میں لگی ہوئی کنگھی بھی ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ کچھ بال تو سر پر کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے رونا آنے لگا تھا

MashalBooks.com

مگر میں نے آنسوں پی لیے۔

ماما اور قلی کے درمیان تھوڑی دیر پیسوں پر بحث ہوتی رہی۔ قلی کہہ رہا تھا کہ گھر پہاڑی کے اوپر ہے اور ماما اس کی تردید کر رہی تھیں۔ حالانکہ وہ مان رہی تھیں کہ گھر واقعی اونچائی پر ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کس قسم کے گھر میں رہتی ہیں۔ وہ قلی جو ہمارا پیچھا کر رہے تھے ایک ایک کر کے خاموشی سے چلے گئے تھے۔ صرف ایک قلی رہ گیا تھا جو کافی بوڑھا تھا۔ آخر پیسے طے ہو گئے اور ماما نے تینوں گٹھریاں اسے دے دیں۔

''میں تمہیں اس لیے دے رہی ہوں کہ تم بوڑھے ہو اور مجھے تمہارے اوپر رحم آ گیا ہے۔'' ماما نے ایسے کہا۔ جیسے وہ بہت بڑا احسان کر رہی ہوں۔

''اگر مجھے کوئی اور مسافر مل گیا ہوتا تو میں کبھی آپ کا سامان لے کر اتنی اونچی پہاڑی پر نہ جاتا۔ چاہے آپ مجھے ہزار سکے بھی دیتیں۔'' بوڑھا قلی بولا۔

یہ بیوقوف جب بھی منہ کھولتا ہے اونچی پہاڑی ہی کہتا ہے۔ نالائق کہیں کا۔ ماما بڑبڑائیں۔ اس بوڑھے نے اپنی پیٹھ پر ہمارا سامان لاد رکھا تھا اس لیے ہمیں صرف اس کے پاؤں ہی نظر آ رہے تھے۔ مجھے خوشی تھی کہ کرایہ طے ہو گیا تھا۔ اب میں ماما کا ہاتھ پکڑ سکتی تھی۔ ہم اس قلی کے ساتھ بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ہم جتنا بھی دوڑتے وہ ہم سے آگے ہی ہوتا۔

''ماما۔ بجلی سے چلنے والی ٹرام کہاں ہے؟''

ماما نے خاموشی سے ایک بس کی طرف اشارہ کیا جو پٹری پر چل رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر گومٹرا سا نکلا ہوا تھا۔ ریل گاڑی کے مقابلے میں جس کا آگا پیچھا ہی نظر نہیں آتا یہ گاڑی بکس کی طرح تھی جسے آسانی سے چلایا جا سکتا ہے۔ اگر ریل گاڑی اژدہا تھی تو یہ گاڑی گوبھی کے پھول کا کیڑا تھی۔ اس میں بیٹھے ہوئے بچے ہنس رہے تھے۔ ماما مجھے بہلانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھیں تا کہ میری توجہ ٹرام کی طرف سے ہٹ جائے۔ انہوں نے مجھے ایسی گاڑی کے بارے میں بتایا جو پٹری کے بغیر چلتی ہے' اور رکشا بھی ہے جو آدمی کھینچتا ہے اور پھر فائر بریگیڈ کی سرخ گاڑیاں بھی ہوتی ہیں۔

''ماما' میں تھک گئی ہوں ہم ٹرام میں کیوں نہیں بیٹھتے؟'' میں نے کہا اور چلتے چلتے کھڑی ہو گئی۔

''نہیں نہیں۔ ہم بالکل گھر کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ اب تم وہ نخرے نہیں کرو گی جو دادی کے سامنے کرتی تھیں۔ ہمیشہ تمہاری مرضی نہیں چلے گی۔ اگر تم نے نخرے کیے تو میں تمہیں ماروں گی۔''

ماما نے غصے سے مجھے دیکھا۔ انہوں نے جیب سے ایک سکہ نکال کر ریہڑی والے کو دے دیا اور اس سے پول بانگ (سستے گول کیک) لیے۔ وہ ریہڑی والا انگیٹھی پر وہ کیک بنا رہا تھا۔ انہوں نے دو کیک لیے۔ میٹھا کیک میرے منہ میں گھل گیا۔ اس کا مزہ ٹافی یا شہد کی طرح تو نہیں تھا پھر بھی مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے کوشش کی کہ میں مزے لے لے کر کھاؤں مگر وہ فوراً ہی گھل گیا میرے لیے وہ بالکل ہی نئی چیز تھی۔ اور میرے منہ میں بہت دیر تک اس کا مزہ رہا۔

ماما اور میں بڑی سڑک پر چلتے رہے۔ پھر ٹرام کے آخری سٹاپ کے پاس ماما ایک گلی میں داخل ہو گئیں۔ یہاں تک آ کر قلی تھک گیا تھا اس لیے اب ہم اس سے آگے چل رہے تھے۔ گلی گندی بھی تھی اور پیچ دار بھی جیسے انتڑیاں۔ وہ ختم ہی ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ماما نے قلی کیوں لیا تھا۔ ہم تو ٹرام میں بیٹھ کر بھی آ سکتے تھے۔ مگر ٹرام گلیوں میں تو نہیں جا سکتی تھی۔

''اب آپ مکولی (چاول کی سستی شراب) خریدنے کے لیے مجھے ٹپ بھی دیں گی۔'' قلی نے کہا۔

ماما نے جیسے سنا ہی نہیں۔ اب اوپر چڑھنے کے لیے سڑک پر سیڑھیاں آ گئی تھیں۔ بالکل سیدھی سیڑھیاں۔

''مادام' آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ یہ اونچائی نہیں ہے۔'' قلی نے ہانپتے ہوئے شکایت کی۔

یہ عجیب سا علاقہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے گھر جیسے دیہات میں نوکروں کے ہوتے ہیں' ایک دوسرے سے چپٹے ہوئے کھڑے تھے جیسے کسی نے بہت سے صندوق وہاں پھینک دیے ہوں۔ سونگڈو میں جس چیز نے سب سے زیادہ مجھے پریشان کیا وہ لوگوں کا ہجوم اور اتنے بہت سے گھر تھے۔ اس ہجوم سے مجھے اتنی گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی جتنی اسے کنٹرول کرنے والی ترتیب سے ہو رہی تھی۔ یہ ترتیب ہی ہے جو گنجان آبادی میں خوبصورتی پیدا کرتی ہے۔ وہاں ایک ترتیب اور نظم وضبط تھا۔ مگر ایک ایسی لڑکی کے لیے یہ پریشان کن بھی تھا جو کھیتوں میں آزادی کے ساتھ چرنے والے جانوروں کی طرح تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ اچھا بھی لگ رہا تھا۔

لیکن ماما جہاں خاموشی کے ساتھ چڑھتی چلی جا رہی تھیں وہاں کہیں بھی مجھے نظم وضبط کی

MashalBooks.com

خوبصورتی نظر نہیں آ رہی تھی' وہ سارا علاقہ گندگی سے بھرا ہوا تھا اور ہر چیز الٹی سیدھی لگ رہی تھی۔ یہ گلی بھی ٹوٹی پھوٹی تھی اور گھر بھی ایسے تھے جیسے ڈبے ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیے گئے ہوں۔ گھروں کے باہر سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اندر سے بھی وہ گندے ہوں گے' ان گھروں کے اندر سے لڑنے جھگڑنے کی آواز آ رہی تھی۔ گندی گلی کا سرا ہی نظر نہیں آ رہا تھا۔

''یہ سیول ہے؟'' میں نے بیزاری سے پھر کہا۔

''نہیں۔'' ماما نے زور سے سر جھٹکا۔ ان کے اس جواب سے مجھے ایسا جھٹکا لگا جوان کے یہ کہنے سے نہ لگتا کہ ''ہاں' یہ سیول ہے''۔

''ہم سیول میں نہیں ہیں۔ یہ شہر کے باہر ہے جب تک تمہارا بھائی اچھی کمائی نہیں کرتا اس وقت تک ہمیں یہاں پر ہی وقت گذارنا پڑے گا۔ مگر ایک دن ہم سیول میں ضرور رہیں گے۔ تمہارا بھائی ضرور کامیاب ہوگا۔ سمجھ گئیں تم؟''

ماما نے یہ اس انداز سے کہا تھا کہ میں نے گھبرا کر سر ہلا دیا۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ جب وہ مجھے لینے سیول سے گاؤں آئی تھیں تو ان کے باوقار انداز سے بہت مرعوب ہوگئی تھیں۔ سیول جانے سے پہلے ان کا یہ انداز نہیں تھا۔ یہ غرور انہوں نے سیول میں سیکھا تھا۔ جب وہ میرے بھائی کے ساتھ سیول گئی تھیں تو ان کے سسرال کی طرف سے اس کی مخالفت نہیں کی گئی تھی۔ سب سمجھتے تھے کہ وہ وہاں اچھی زندگی گذار رہی رہیں۔ ماما نے اس انداز نے سب کو متاثر کیا تھا اسی لیے مجھے بھی ان کے ساتھ بھیجنے پر راضی ہو گئے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ماما تو سیول سے باہر رہتی ہیں۔ اگرچہ وہ علاقہ شہر کی حدود میں ہی کہلاتا تھا مگر اسے دروازے سے باہر مانا جاتا تھا۔ گویا وہ شہر کے چار دروازوں' یعنی شمالی' جنوبی مشرقی اور مغربی دروازوں سے باہر تھا۔ میں ان باتوں کو نہیں جانتی تھی اس لیے دروازے سے باہر کا مطلب یہ سمجھتی تھی کہ یہ شہر سے دور ہے۔ وہاں جا کر مجھے ایسا لگا جیسے میں بھکاری ہوگئی ہوں اور مجھے مایوسی نے گھیر لیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے لالچ دے کر اغوا کر لیا ہے۔ مجھے ماما پر غصہ آنے لگا۔ میری ساری محبت ختم ہوگئی۔ اور مجھے گاؤں یاد آنے لگا۔

سب سے زیادہ صدمہ مجھے اسی بات کا ہوا کہ وہ جس صندوق نما مکان میں رہتی تھیں وہ بھی ان کا اپنا نہیں تھا۔ وہ ہیون جو دونگ میں پہاڑی کے اوپر ایک پرانے مکان کے ایک کمرے میں

کرائے پر رہتی تھیں۔ وہ کمرہ بھی دروازے کے پاس تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی یہ سنا ہی نہیں تھا کہ کوئی کمرہ کرائے پر بھی لیا جا سکتا ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے اور بھی افسوس ہوا کہ ماما جو کسی اپنے سُسر کے سامنے بھی نہیں جھکتی تھیں وہ مالک مکان بلکہ اس کے بچوں کے سامنے بھی جھک جھک کر ان کی تعظیم کر رہی تھیں۔ وہ ان کی خوشامد کر رہی تھیں۔

قلی مسلسل کہے جا رہا تھا کہ اسے کرائے کے علاوہ شراب پینے کے لیے ٹپ بھی دی جائے۔ مجھے اس پر رحم آ رہا تھا۔ مگر ماما نے اس کی پیٹھ سے اپنا سامان اتارا اور اسے وہی کرایہ دیا جو طے ہوا تھا۔ انہوں نے نظریں اٹھا کر قلی کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ اچانک قلی نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ ماما کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کریں۔ وہ اسے خاموش رہنے کو کہہ رہی تھیں۔ انہیں ڈر تھا کہ مالک مکان کہیں ناراض نہ ہو جائے۔ قلی ماما کی کمزوری سمجھ گیا اور اس نے اور بھی شور مچانا شروع کر دیا۔ آخر ماما کو ٹپ دینا ہی پڑی۔

میرے اوپر اس واقعے کا بہت اثر ہوا

مکان کی چھت اور دیواروں کی کافی عرصے سے مرمت نہیں کی گئی تھی اس لیے کمرے میں کیڑے مکوڑے بہت نظر آتے تھے۔ مجھے کمرے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں زور سے ہنس بھی نہیں سکتی تھی اور نہ اونچی آواز میں بات کر سکتی تھی۔ تو شہر میں اس طرح میری زندگی شروع ہوئی۔

اس کے بعد ماما اپنے ماتھے پر بل ڈال کر بار بار مجھے لیکچر دیتی رہتی تھیں۔ کمرے سے باہر زیادہ دُور نہ جانے کی ہدایت کے علاوہ وہ مجھے سمجھاتی تھیں کہ کرائے داروں کو کیسے رہنا چاہیے۔ پہلا اصول یہ تھا کہ کرائے دار کو مالک مکان کے خاندان کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا چاہیے۔ میں نے دیکھا کہ اس محلے کے تمام آدمی شرافت کے ساتھ شام کو گھر واپس آ جاتے ہیں۔ میں نے ماما کی یہ بات غور سے سنی کہ کہیں کھو نہ جانا۔ ان دنوں مجھے اکثر ڈراؤنے خواب آتے تھے کہ میں کھو گئی ہوں۔ یہ خواب دیکھ کر میں ٹھنڈے پسینے میں بھیگ جاتی تھی۔ وہ مجھے یہ بھی سمجھاتی رہتی تھیں کہ مالک مکان کے بچوں کے ساتھ نہ کھیلنا۔ اگر وہ تمہیں کھیلنے کے لیے بلائیں تو چلی جانا اپنے آپ کبھی نہ جانا۔ ان کے کھلونوں کا لالچ نہ کرنا۔ بلکہ ان کے کھلونوں کی طرف دیکھنا بھی نہیں۔ اگر وہ کچھ کھاتے ہوں تو انہیں بالکل نہ دیکھنا۔ انہوں نے مجھے یہ اصول سکھائے مگر میں ان

MashalBooks.com

پر عمل نہ کر سکی۔

وقت گذارنے کے ساتھ میں نے ماما پیسے لینا سیکھ لیا۔ میں ان کی موجودگی میں مالک مکان کے بچوں کے ساتھ ایسی حرکت کرتی کہ ماما گھبرا جاتیں۔ مجھے وہ میٹھا کیک ابھی تک یاد تھا جو ماما نے پہلے دن راستے میں مجھے دلایا تھا۔ وہ بہت نرم اور میٹھا تھا کہ فوراً ہی میرے منہ میں گھل گیا تھا۔ شکر میں لپٹی ہوئی یہ چیز میرے لیے شہر کی نمائندہ تھی۔ ایک سکے سے کچھ بھی خریدا جا سکتا تھا' کیک نہیں تو بسکٹ ہی مل سکتے تھے۔ شہر کی اس مٹھاس نے مجھے اپنا بنا لیا تھا۔

دو کھانوں کے درمیان میٹھی چیز خریدنے اور نہ خریدنے کے جھگڑے نے مجھے اور ماما کو بہت پریشان کر دیا تھا۔ اور یہ پریشانی کافی عرصے برقرار رہی۔ ایک دن میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو وہ بہت ہی کمزور اور دبلا پتلا نظر آیا۔ آنکھوں کی چمک بھی غائب تھی مگر ان میں چالاکی دکھائی دے رہی تھی۔

ایک دن مجھ سے ایک بہت ہی غلط کام ہو گیا۔ جس دکان سے میں کیک وغیرہ خریدا کرتی تھی مجھ سے اس کی ایک چیز ٹوٹ گئی۔ دکان میں بائیں جانب لکڑی کے مرتبان رکھے تھے جن کے ڈھکن شیشے کے تھے۔ ان میں بسکٹ یا ٹافیاں رکھی ہوتی تھیں۔ دکاندار پیسے لیتا اور خریدار خود ہی جار میں سے اپنی پسند کی چیز نکال لیتا۔ میں کاؤنٹر پر دوسری قطار میں رکھے ایک مرتبان سے بسکٹ نکال رہی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو پہلی قطار میں رکھے مرتبان کا ڈھکن نیچے گرا اور کرچی کرچی ہو گیا۔ ڈر کے مارے میں رونے لگی۔ دکاندار بھاگا بھاگا آیا اور میرا ہاتھ دیکھنے لگا کہ کہیں وہ زخمی تو نہیں ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے ڈانٹا کہ میں خواہ مخواہ رو رہی ہوں جیسے میرے چوٹ لگ گئی ہو پھر اس نے وہ بسکٹ نکال کر مجھے دیا جو میں نکال رہی تھی مجھے اس کے بعد اس نے دکان سے نکال دیا۔ مجھے خوشی تھی کہ اس نے شیشہ ٹوٹنے پر میری خبر نہیں لی۔ میں گھر آئی اور آرام سے بسکٹ کھایا۔ مگر ابھی میرے منہ میں اس کا مزہ باقی تھا کہ باہر کچھ گڑبڑ کی آواز آئی۔ اس محلے میں اکثر ایسے ہنگامے ہوتے رہتے تھے۔ مٹھائی کھانے کے علاوہ مجھے یہ جھگڑے دیکھنے میں بھی بہت مزہ آتا تھا۔ میں نے شور سنا تو باہر بھاگی۔

اس وقت ماما کھانا پکا رہی تھیں۔ باہر نکل کر میں نے دیکھا کہ ماما کمر پر ایک ہاتھ رکھے کھڑی ہیں اور ان کے ہاتھ میں ڈنڈا ہے۔ وہ دکاندار کے سامنے کھڑی غصے میں کچھ کہہ رہی تھیں۔

دکاندار ان کی طرف انگلی اٹھا کر دھمکیاں دے رہا تھا۔ وہ ٹوٹے ہوئے شیشے کے پیسے مانگ رہا تھا اور ماما کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ کیا واقعہ ہو گیا ہے وہ کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے شیشہ کا ڈھکن نہیں توڑا' اور انہیں نہیں معلوم کہ وہ کیا بک رہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے ڈٹے ہوئے تھے۔ دکاندار جانتا تھا کہ ماما ہی میری ماں ہیں۔ مگر ماما کا خیال تھا کہ اگر مجھ سے یہ غلطی ہو گئی تھی تو میں انہیں ضرور بتاتی۔

اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور شرم آئی کہ میں ماما کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ میرا جی چاہا کہ میں وہاں سے بھاگ جاؤں۔ مگر دکاندار بھی بہت تیز تھا اس نے جلدی سے مجھے پکڑ لیا اور ماما کے سامنے پیش کر دیا۔

''یہ لڑکی کون ہے؟ تم اس سے تو انکار نہیں کرو گی کہ یہ تمہاری بیٹی ہے۔ اب تمہیں شیشے کے پیسے دینا ہی پڑیں گے۔ بہت معمولی رقم ہے وہ۔''

دکاندار نے میرا منہ ماما کے سامنے کر دیا۔ میں نے پہلی بار اپنی ماں کا چہرہ اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ سوائے اس کے مجھے اور کچھ نظر نہیں آیا کہ میں نے آئینے میں جو اپنی شکل دیکھی ہے وہ ماما سے بہت ملتی ہے۔ میرا دل بھر آیا۔

''چھوڑ دو اسے۔'' ماما کے لہجے میں اتنا رعب تھا کہ میں لرز گئی۔ ''میں تمہارا ڈھکن بدل دوں گی۔''

''یہ تم پہلے کہہ دیتیں تو اچھا ہوتا۔''

مجھے ڈر تھا کہ اب ماما میری خبر لیں گی۔ مگر میں بچ گئی۔

''ہم بھی کسی گھٹیا محلے میں آ گئے ہیں۔'' ماما اکثر یہ کہتی رہتی تھی۔ ''گندے لوگوں میں۔'' مالک مکان اپنے بوڑھے ماں باپ اور بہت سے بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی ایک داشتہ بھی تھی جو اس کی بیوی کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہتی تھی۔ ماما کو یہ بہت برا لگتا تھا۔ وہ کہتی تھیں۔ ''انسان آخر کتنا گر سکتا ہے۔ میں تو ان گھٹیا لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتی۔'' مالک مکان کے پیچھے وہ یہ بات اس غرور کے ساتھ کہتیں جیسے وہ سارے شہر کی مالک ہیں۔ لیکن جب مالک مکان کے سامنے جاتیں تو وہ کچھ اور ہی ہو جاتیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت اتنے غصے میں کیوں تھیں؟ کیا انہیں اپنے فالج زدہ سسر کی دولت کا غرور تھا' ان کے سسر کئی باغوں

MashalBooks.com

کے مالک تھے اور بہت پڑھے لکھے مانے جاتے تھے۔ان کا مکان بہت بڑا تھا جس کے کشادہ صحن میں گل داؤدی کے پودے لگے ہوئے تھے۔ایک پوری پہاڑی ان کی تھی جہاں ہمارے بزرگ دفن تھے۔پھران کے کھیت کھلیان تھے۔ماما کو اس کا غرور تھا۔مگرانہوں نے میرے بھائی اور مجھے شہر لا کران کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔اس لیے اگران کے سسران کے غرور کی وجہ تھے تو یہ غرور محض جھوٹا تکبر ہی تھا۔

میں سمجھتی تھی کہ میرے شیشہ توڑنے کا قصہ ختم ہوگیا۔مگر میرا خیال غلط تھا: چند دن بعد میرے بھائی نے کہا کہ وہ مجھے گھر کے پیچھے والی پہاڑی پر لے جارہا ہے۔یہ عجیب سی بات تھی۔ہم گاؤں میں رہتے تھے تو وہ بڑا نٹ کھٹ سا لڑکا تھا۔ہم دونوں بہت قریب تھے۔سیول میں دوسال رہنے کے بعد وہ بہت سنجیدہ اور کچھ تنہائی پسند سا بن گیا۔وہ ماما سے لمبا تھا اس کے چوڑے چوڑے کاندھے تھے۔اب اس پر سارے خاندان کا بوجھ پڑ گیا تھا۔اور اسے اس کا احساس بھی تھا کہ شہر میں رہ کر اسے کامیاب انسان بننا ہے۔

وہ مجھ سے آٹھ سال ہی بڑا تھا۔مگر اس کے اندر کافی پختگی آ گئی تھی اور وہ دوسروں پر حکم چلانے لگا تھا۔اور کسی کے کہے بغیر ہی خاندان کی ساری ذمہ داریاں بھی نبھانے لگا تھا۔اب میں اس کے ساتھ ہی رہنے کو آ گئی تھی اور مجھے اب اس کے اور بھی قریب ہو جانا چاہیے تھا۔مگر میں اس کا موڈ دیکھتی رہتی تھی اور اس سے دور رہنا ہی مناسب سمجھتی تھی۔

''اس پہاڑی کا کیا نام ہے؟۔''ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پہاڑی پر چڑھ رہے تھے تو اس نے نرم آواز میں مجھ سے پوچھا۔وہ اچھے موڈ میں تھا۔

میں نے سر ہلا دیا کہ میں نہیں جانتی۔

''اسے وانگ پہاڑی کہتے ہیں۔''میرے بھائی نے بڑی اداسی کے ساتھ کہا۔

''اچھا؟ ... پھر تو یہاں شیر بھی ہوتے ہوں گے۔''میں نے کہا۔ایک دن میں نے مالک مکان کے ریڈیو پر ایک گانا سنا تھا۔وہ گانا کچھ اس طرح تھا۔''وانگ پہاڑی پر شیر دہاڑا..''

''ہاں ... پہلے کبھی ہوتے ہوں گے۔''میرے بھائی نے صرف اتنا کہا مجھے اپنے بھائی پر فخر تھا اس کا قد لمبا تھا' چوڑا ماتھا اور گھنی بھنویں تھیں۔یہ سوچتے ہوئے کہ میرا بھائی اتنا خوبصورت ہے' میں خوب اچھلتی ہوئی چل رہی تھی۔ہم اوپر پہنچ گئے تھے۔اب پورا شہر ہمارے سامنے تھا۔

''یہاں سے ہم شہر میں داخل ہوتے ہیں؟''میں نے ''آزادی کی محراب'' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔وہ محراب ہمارے سامنے سڑک کے درمیان کھڑی تھی۔میں سوچ رہی تھی کہ شہر کے اندر اور باہر کا فرق ظاہر کرنے کے لیے کنکریٹ دروازہ ہونا چاہیے۔

''ہم شہر کے اندر جا کر کب رہیں گے؟''میں نے کہا میں اپنے آپ کو تسلی دینا چاہتی تھی اور وہ احساس کمتری مٹانا چاہتی تھی جو شہر سے باہر رہنے کی وجہ سے میرے اندر پیدا ہوا تھا۔مجھے اپنے بھائی پر اندھا اعتماد تھا۔مجھے امید تھی کہ وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپائے گا۔

''جب میں خوب کمانے لگوں گا تو ہم شہر کے اندر چلے جائیں گے''مجھے اس پر اتنا بھروسہ تھا کہ اس کے جواب دینے سے پہلے ہی میں نے چھلانگیں لگانا شروع کر دی تھیں ہم دونوں میں محبت کا رشتہ اور بھی مضبوط ہوگیا تھا۔لیکن میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک اس نے ایسی بات کہی جس سے میرا سارا اعتماد ختم ہوگیا۔

''کیا تم چھڑیاں کھانے کو تیار ہو؟''چلو اتنا پاجامہ نیچے کرو۔''میرے بھائی نے پلٹ کر ایک پیڑ کی شاخ توڑی۔میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا مذاق کر رہا ہے اب وہ پتلی سی چھڑی ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا وہ بہت افسردہ نظر آ رہا تھا۔

''تم بھیک مانگ کر پھر لسکٹ خریدو گی؟ تمہیں معلوم ہے ماما کتنی محنت سے پیسے کماتی ہیں؟ تم ماما کو تنگ کرتی ہو۔تم جانتی نہیں کہ ماما گھٹیا''کسائنگ''(طوائفیں) عورتوں کے کپڑے سی کر گذارہ کرتی ہیں۔وعدہ کرو کہ آئندہ تم ماما کو تنگ نہیں کرو گی۔''یہ کہہ کر اس نے میری ننگی ٹانگوں پر چھڑی مارنا شروع کر دی۔مگر میں بھی بہت ضدی تھی۔وہ چھڑی مار رہا تھا اور میں خاموش تھی۔میں نے بھی طے کر رکھا تھا کہ میں کچھ نہ بولوں گی۔

''اب تم کہنا مانو گی؟''میرا بھائی جس لہجے میں یہ کہہ رہا تھا وہ اتنا سخت نہیں تھا کہ میں اس کی بات مان لیتی۔اس کی ڈانٹ ڈپٹ کا لہجہ آہستہ آہستہ نرم ہوتا جا رہا تھا۔آخر اس نے چھڑی پھینک دی اور مجھے اپنی گود میں لپیٹ لیا۔

''اب تم ماما کو تنگ نہیں کرو گی۔سنا تم نے؟''وہ ایسے بول رہا تھا جیسے مجھ سے درخواست کر رہا ہو۔میرا سر اس کے سینے سے لگا ہوا تھا اور میں زور زور سے سر ہلا رہی تھی۔

اس کے بعد شہر میں مٹھائیاں تلاش کرنے کی میری عادت ختم ہوگئی۔اب ماما نے مجھے پیسے

MashalBooks.com

دینے کے بجائے خود ٹافیاں خریدنا شروع کر دیں۔ وہ ٹافیاں خرید کر چھپا دیتیں۔ اور جب میں کوئی اچھا کام کرتی تو انعام میں مجھے وہ ٹافی دیتیں۔ میرا بھائی چینی رسم الخط میں سلیٹ پر میرا نام' پتہ اور ماں باپ کا نام لکھتا اور مجھ سے کہتا کہ شام تک دس مرتبہ یہ لکھ کر دکھاؤ۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے بیس مرتبہ لکھواتا۔ اس طرح میں نے ہندسے اور جاپانی حروف بھی سیکھ لیے اور آہستہ آہستہ میں ان سے مانوس ہوگئی۔ مجھے اسکول میں داخل کرنے کی تیاریاں کی جارہی تھی۔ میں پڑھائی لکھائی میں اپنے بھائی کی توقع سے بھی زیادہ تیز تھی وہ چاہتا تھا کہ میں اپنا وقت چینی حروف سیکھنے میں لگاؤں۔ مگر میں تو گاؤں میں ہی ہزار حروف کا متن سیکھ چکی تھی۔

مالک مکان کے حصے میں نہ جاؤ گلی کے نکڑ پر نہ جاؤ' مالک مکان کے بچوں کے ساتھ نہ کھیلو۔ ہمسایوں کے بچوں کے ساتھ نہ کھیلو مجھے کوئی بچہ ایسا نہیں ملا جس کے ساتھ تم کھیل سکو۔

ماما دن رات مجھے یہ سبق پڑھاتی رہتی تھیں۔ اور میں ایک تنگ سی جگہ میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ ان کا یہی کام تھا کہ میرے کھیلنے کودنے پر پابندیاں لگاتی رہیں۔ وہ سوچتی ہی نہیں تھیں کہ آٹھ سال کی لڑکی کے لیے یہ کتنی بڑی سزا ہے۔ اگر میں ان کا حکم مانتی رہتی تو میں ہر وقت اس چھوٹے سے کمرے میں بند رہتی۔ اس کے علاوہ میری کوئی سہیلی بھی نہ ہوتی صرف ماما اور بھائی ہی سب کچھ ہوتے۔

صبح ہوتے ہی ماما کوئلوں کی انگیٹھی کے پاس بیٹھ جاتیں اور طوائفوں کے کپڑے سینے لگتیں۔ مجھے ذرا سا بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ ''کسائینگ'' (طوائف) کون ہوتی ہیں۔ ان کے بارے میں ماما اور بھائی کی باتیں سن کر میں نے سوچا تھا کہ وہ بہت ہی گھٹیا عورتیں ہوتی ہیں ہمیں ان کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ ماما جتنے بھی کپڑوں کی سلائی کرتیں وہ بہت ہی ملائم اور خوبصورت ہوتے تھے۔ میں سوچتی کہ اسے پہننے والیاں کیسی ہوتی ہوں گی۔ کیونگ سونگ ریلوے اسٹیشن سے ہیون جوڈونگ تک ہوتے ہوئے اور ہیون جوڈونگ میں رہتے ہوئے بھی میں نے ایسی کوئی عورت نہیں دیکھی جو اتنے شاندار کپڑے پہنتی ہو۔ میں نے سوچا کہ شہر کے دروازے کے باہر اور بھی ایسے محلے ہوں گے جو ہمارے محلے سے بھی زیادہ برے ہوں گے۔

ماما کو خبط تھا کہ اپنے آپ سے کمتر بچوں سے نہ ملا کرو ... ان کے اس خبط نے میرے اندر تجسس پیدا کر دیا۔ یہ تجسس' یہ جرم کا احساس اور دل کی کھد بد ٹافیوں کی مٹھاس سے زیادہ

مزیدار تھی۔

میرا بھائی اس دن کے لیے مجھے جو ہوم ورک دیتا میں جلدی جلدی اسے ختم کر لیتی۔ اس کے بعد دن بھر میں ماما سے ان کی سلائی اور رنگ برنگے کپڑوں کے بارے میں باتیں کرتی رہتی۔ اس طرح میں کپڑوں کی ماہر ہوگئی اب میں ریشمی' سوتی' ساٹن اور ٹفیٹا وغیرہ کا فرق جان گئی تھی۔ بلکہ میں نے تو ماما کی سلائی میں غلطیاں بھی نکالنا شروع کر دیں کہ کالر کا پچھلا حصہ تنگ ہے یا کمر زیادہ چوڑی ہوگئی ہے۔ میں کسی کپڑے کا لمبا ٹکڑا لے کر اسے تہہ کرتی اور اس کا خوبصورت پرس بنا لیتی۔ میں ان کپڑوں سے مختلف چیزیں بناتی رہتی۔ مجھے یقین تھا کہ ماما میرے اس کام سے بہت خوش ہوں گی اور میری تعریف کریں گی۔ لیکن ایک دن انہوں نے میرے ہاتھ سے سوئی دھاگہ اور کپڑا چھین لیا۔

اس دن سے میرے اوپر سوئی دھاگہ سے کھیلنے پر بھی پابندی لگا دی گئی۔

''تمہیں پڑھنے لکھنے پر توجہ دینا چاہیے۔ سینا پرونا تمہارا کام نہیں ہے۔ آئندہ اس کا کبھی سوچنا بھی نہیں۔ اگر تم ہاتھ سے کام کرنے میں ماہر ہوگی تو ہاتھ سے کام کرنا ہی تمہارا پیشہ بن جائے گا۔ تمہیں گانے کا شوق ہوگا تو وہی تمہارا پیشہ ہوگا۔ اگر تمہارا چہرہ تمہارا ٹریڈ مارک ہوگا تو اسی کے ذریعہ تم روزی کماؤ گی۔ اگر کسی انسان میں کسی کام کی بھی صلاحیت نہو تب بھی وہ اپنی حیثیت کے مطابق کوئی نہ کوئی کام کر ہی سکتا ہے۔ تمہاری ماما نا اہل لوگوں سے نفرت نہیں کرتیں۔ پھر بھی وہ یہ نہیں چاہتیں کہ تم ہاتھوں کی مزدوری کرو یا اپنی شکل صورت کی وجہ سے کمائی کرو یا گانے گاؤ۔ تم خوب پڑھائی کرو اور نئے زمانے کی عورت بنو۔

ماما نے یہ نہیں بتایا کہ آج کے زمانے کی ماڈرن عورت زندہ رہنے کے لیے کیا کرتی ہے۔ ان کے لیے ماڈرن عورت کا تصور یہ تھا کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرے اور دنیا بھر کے معاملات خوب سمجھتی ہو۔ ایک بار وہ جو کچھ بھی سوچ لیتی تھیں اسے کر کے رہتی تھیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنی مرضی کی مالک تھیں۔ اس لیے انہیں روزی کمانے کی کبھی فکر نہ ہوئی۔ خیر' اب ہوا یہ کہ میرے وقت کاٹنے کا یہ بہانہ بھی مجھ سے چھن گیا۔ ایک پنسل اور ایک کاپی دے کر مجھے ایک پیونگ (3.954 مربع گز) سے بھی کم جگہ میں بند کر دیا گیا۔ ماما نے میرے بھائی سے کہا کہ اسے اور بھی زیادہ کام دیا کرو۔

MashalBooks.com

زیادہ کام ملنے کے باوجود میں اسے پلک جھپکتے ختم کر لیتی تھی۔ جلدی جلدی لکھنے کی وجہ سے میری تحریر ایسی ہو گئی تھی جیسے مرغی کے بچوں کے پنجے' خاص طور سے جب میں جاپانی حروف لکھتی جو بالکل بے معنی نظر آتے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا بھائی اپنی پڑھائی میں اتنا مصروف ہے کہ وہ مجھے جاپانی حروف کی آوازوں سے زیادہ اور کچھ سکھا ہی نہیں رہا تھا۔ میں بری طرح اکتا گئی تھی کہ مجھے الگ الگ حرف تو سکھائے جا رہے تھے مگر ملانے سے جو معنی پیدا ہوتے ہیں وہ نہیں سکھایا جاتا۔

کوئی قانون بھی آٹھ برس کی لڑکی کو دبا کر نہیں رکھ سکتا۔ میں نے سلیٹ پر عورتوں کی شکلیں بنانا شروع کر دیں یہ نئے زمانے کی عورتیں تھیں جن کے سر پر پھولے ہوئے بال تھے' وہ سفید'' چوکوری'' کالا اسکرٹ اور اونچی ایڑی کے جوتے پہنے ہوتیں اور ان کے ہاتھ میں پرس ہوتا۔ اس وقت تک نئے زمانے کی عورتوں کی اس شکل صورت سے مجھے کوئی خاص دلچسپی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے اپنے محلے میں بھی' جسے ماما بالکل پسند نہیں کرتی تھیں' مجھے اس قسم کی عورتیں نظر آجاتی تھیں جو ماما کی ماڈرن عورتوں سے بھی زیادہ ماڈرن ہوتی تھیں میں نے ایسی عورتیں بھی دیکھیں جو مغربی لباس پہنتی تھیں' کسی کے چھوٹے کٹے ہوئے بال بھی تھے۔ اصل میں ماما کے دماغ میں جو نئی عورت تھی وہ پرانے زمانے کی تھی۔

بہرحال میرے لیے یہ ایک معمہ ہی رہا کہ ماما میرے دماغ میں جس نئی عورت کا نقش بٹھانے کی کوشش کرتی رہتی تھیں وہ عورت کرتی کیا ہے۔ ماما اتنی مشکل باتیں بھی نہیں کرتی تھیں۔ مگر میری سمجھ میں ان کی بات نہیں آتی تھی۔ نئی عورت کا یہ معمہ میرے لیے وہ ڈور بن گیا تھا جس نے مجھے بار بار اس عورت کی تصویر بنانے کے چکر میں پھنسا دیا تھا۔ میرے اس شوق کی وجہ سے میری کاپی جلدی ختم ہو جاتی تھی اور میرے غریب بھائی اور ماں کے لیے پریشانی کا باعث بن جاتی تھی۔ لیکن میری ماں یا بھائی اتنے سنگدل بھی نہیں تھے کہ میری یہ چھوٹی سی تفریح مجھ سے چھین لیتے۔

ایک دن میرا بھائی میرے لیے چاک خرید لایا۔ اس نے کہا کہ کاپی میں پنسل سے لکھو اور تصویریں بناؤ تو چاک سے بناؤ اور وہ بھی دیوار پر بناؤ۔ اس نے دروازے پر کچھ بنایا اور پھر اپنے جوتے سے اسے صاف کر دیا۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ ایسے کیا کرو۔ وہ ماما کا فرماں بردار بیٹا تھا۔ وہ

نہیں چاہتا تھا کہ اتنی محنت سے کمائے ہوئے ماما کے پیسے میری کاپیوں پر اس طرح خرچ ہوں۔ اس لیے اس نے یہ طریقہ نکالا۔

مجھے چاک ملنے سے بھی زیادہ خوشی اس بات پر ہوئی کہ اس طرح مجھے چھوٹے سے کمرے میں بند رہنے سے آزادی مل جائے گی۔ اور میں دوبارہ سکون سے سانس لے سکوں گی۔ گھر سے باہر ایک تنگ گلی تھی جو پہاڑ کی طرف جانے والی گلی سے مل جاتی تھی۔ یہ بند گلی بہت تنگ ڈھلوان تھی اور سیدھی پہاڑی کے ساتھ گذرتی تھی۔ البتہ وہاں سے سامنے کا نظارہ بہت شاندار تھا۔ پہاڑی کے اوپر سے نیچے سڑک پر نیلے رنگ کی ٹرام چلتی ہوئی نظر آتی تھی۔ بڑی سڑک کے پار سرخ اینٹوں والا ایک بہت ہی بڑا مکان نظر آتا تھا۔ اتنے بڑے مکان میں کوئی بادشاہ ہی رہتا ہوگا۔ میں نے سوچا کیونکہ وہاں چوبیس گھنٹے سنتری کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ ٹرام کو دیکھنا مجھے سب سے زیادہ اچھا لگتا تھا اس کا نیلا رنگ اور پٹڑی کے ساتھ گھسٹنے سے اس کے پہیوں سے جو نیلی نیلی چنگاریاں نکلتی تھیں وہ بہت ہی اچھی لگتی تھیں۔ شام کے وقت یہ نظارہ اور بھی اچھا لگتا تھا۔ میں جب بھی یہ دیکھتی تو ایسا لگتا جیسے کوئی انجانی سی چیز میرے اندر ٹکرا رہی ہے۔ اور اس سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ مجھے جھرجھری آجاتی۔ میرے اندر یہ انجانی سی چیز تھی میری اکتاہٹ جو میری ہڈیوں کے اندر تک اتر گئی تھی۔ میں ایک پرانی بیماری کا شکار تھی جسے اکتاہٹ اور تھکن کہا جا سکتا ہے۔ میرا بھائی یا ماما میری اس بیماری کی تہہ تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ بیماری اندر ہی اندر مجھے کھائے جا رہی تھی۔

ایک دن میں دروازے کے باہر ایک نئی عورت کی تصویر بنا رہی تھی اور مٹا رہی تھی۔

''میرے ساتھ کھیلو گی؟'' لمبے قد کی ایک لڑکی نے مجھ سے کہا وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا گھر پہاڑی کے نیچے تھا اور میں اوپر کھڑے ہو کر اس کے گھر کا صحن دیکھ لیتی تھی۔ صحن بہت چھوٹا سا اور کچا تھا۔ اور اس میں الٹا سیدھا سامان پڑا ہوا تھا۔ اس گھر کا ہر کمرہ کرائے پر چڑھا ہوا تھا اور ان کمروں میں رہنے والی عورتیں اکٹھی کھانا پکاتی نظر آتی تھیں۔ جگہ اتنی تنگ تھی کہ وہ ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی ان میں لڑائی بھی ہو جاتی تھی اور وہ آستینیں چڑھا کر ایک دوسرے کے مقابلے میں آجاتی تھیں۔ لمبی لڑکی کا باپ ٹھٹھیرا تھا۔ اس نے ایک کمرہ کرائے پر لیا ہوا تھا۔ ہر روز صبح ہی صبح اس کا باپ پہاڑی سے اتر کر نیچے جاتا تھا۔ اس نے پرانی سی ٹوپی اوڑھی

MashalBooks.com

ہوتی تھی' ہاتھ میں تاروں کے مُٹھ والی چھڑی ہوتی تھی اور کاندھے پر لٹکا ہوا ایک تھیلا۔ وہ پہاڑی سے نیچے اترتا تو ایک خاص لے میں آواز لگاتا جاتا۔ ''برتن بھانڈے ٹھیک کرالو۔'' اس کے پاس انگیٹھی اور لوہے کی سلاخ بھی ہوتی تھی۔ اپنے تھیلے میں وہ قلعی کا سامان بھی رکھتا تھا۔ اس تھیلے میں ایک لمبی سی قینچی۔ اور ہتھوڑا بھی ہوتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ شام کو وہ کب واپس آتا تھا۔ میں نے اسے واپس آتے کبھی نہیں دیکھا۔ لڑکی کے باپ کے مقابلے میں اس کی ماں بہت ہی کاہل عورت تھی۔ اسے سینے پرونے کا بھی کوئی شوق نہیں تھا۔ اس کے بچے پھٹے کپڑے پہنے پھرتے تھے۔

ایک دن وہ لڑکی ایسی چوگوری پہنے تھی جس کی کہنی پر سوراخ تھا۔ اس کا چیما کالر پر سے ادھڑا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ لمبی تھی۔

ابھی میں نے اس کے سوال کا جواب بھی نہیں دیا تھا کہ اس نے میرا چاک اٹھایا اور تصویر بنانا شروع کردی۔ وہ نئی عورت کی تصویر نہیں بنا رہی تھی بلکہ وہ لمبی لمبی پتلونیں پہنے ہوئے مردوں کی تصویریں بنا رہی تھی۔ کئی مردوں کی تصویریں بنا کر اس نے انہیں ایک رسی سے باندھ دیا۔

''تم انہیں باندھ کیوں رہی ہو؟'' میں نے پوچھا ''کیونکہ یہ قیدی ہیں۔'' وہ کیا ہوتا ہے؟''

وہ بہت بڑے مکان میں رہتے ہیں۔ یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔'' اس نے شاہی مکان کی اونچی اونچی دیواروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ صرف قیدیوں کی تصویریں ہی نہیں بنا سکتی تھی بلکہ ہوائی جہاز' ٹرام' رکشا اور پھلوں اور پرندوں کی تصویریں بھی بنا سکتی تھی۔ اس نے پری اور دیو کی تصویر بنائی تو میں حیران رہ گئی کیونکہ میں نے یہ مخلوق کبھی نہیں دیکھی تھی۔

''تم کس جماعت میں پڑھتی ہو؟'' میں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں اسکول نہیں جاتی''۔ میں کورمائی زبان کے تمام حروف جانتی ہوں۔ میں اسکول کیوں جاؤں؟ میرے باپ کہتے ہیں کہ لڑکی کے لیے بس اتنا ہی جاننا کافی ہے۔''

میں نے بھی اپنے دادا سے اتنا ہی پڑھا تھا لیکن کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ بس اتنا پڑھنا ہی کافی ہے۔ میں جب گاؤں میں تھی تو چینی حروف سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ سیول آنے کے بعد جاپانی حروف سب پر چھا گئے تھے جو چھپے چوری استعمال کیے جاتے تھے۔ مجھے لمبی لڑکی پر رشک آیا کہ صرف کورمائی حروف پڑھ کر ہی وہ خوش تھی' مگر اس کے ساتھ ہی مجھے اس پر ترس بھی آیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم بڑی ہو کر نئی عورت نہیں بنو گی؟''

میں پولیس والے سے شادی کروں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے پولیس والے کی تصویر بنائی۔ اس پولیس والے کے دونوں کولہوں پر خنجر بھی بندھے ہوئے تھے۔ مجھ سے پوچھے بغیر اچانک اس نے چاک کے دو ٹکڑے کیے اور ایک ٹکڑا میری طرف ایسے بڑھایا جیسے میرے اوپر احسان کر رہی ہو۔ پھر اس نے کہا' چلو' تم میری تصویر بناؤ اور میں تمہاری''۔ میں اس کی تصویر بنانے لگی تو میرے دماغ میں سب سے پہلے جو چیز آئی وہ عورت کے سر پر پھولے پھولے بال تھے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اس کا آدھا چہرہ بنایا۔ یوں بھی اگر کوئی ماڈل بھی میرے سامنے بیٹھی ہوتی تو میرے لیے سامنے سے کسی کا چہرہ بنانا مشکل ہوتا۔ لمبی لڑکی نے آسانی سے ایک دائرہ بنایا پھر اس میں میری آنکھیں' ناک' منہ اور میرے چھوٹے چھوٹے بال بنائے۔ وہ ہر چیز کی تصویر بنا سکتی تھی۔

''میں بور ہو گئی ہوں'' وہ بڑی جلدی اکتا جاتی تھی کیونکہ کوئی کام ایسا نہیں تھا جو وہ نہ کر سکتی ہو۔ اور جلدی نہ کر سکتی ہو۔ میں نے سوچا اس کی اکتاہٹ کی وجہ میں ہوں۔ اس خیال سے مجھے تکلیف ہوئی اور میں نے اس کی اکتاہٹ دور کرنے کا سوچا۔ اس نے بھی میری پریشانی سے فائدہ اٹھایا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ایسے پھیل گئی۔ جیسے ابلتے پانی کے نیچے سے آگ بجھا دی جائے تو پانی کا کھولنا آہستہ آہستہ کم ہوتا جاتا ہے۔

''چلو' ہم اپنا انڈر ویئر اتار دیں۔ تم بھی اتار دو' میں بھی اتارتی ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا میلا کچیلا انڈر ویئر گھٹنوں تک اتار لیا۔ پھر وہ بیٹھ گئی۔ اس کے گھٹنے ٹھوڑی کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ اس نے کہا اب ہمیں اس طرح اپنی تصویریں بنانا چاہئیں میں جانتی تھی کہ اگر ماما کو میری اس حرکت کا پتہ چل گیا تو وہ میرا برا حال کر دیں گی۔ مگر پھر بھی اس کی بات مان لی۔ اس احساس نے میری اکتاہٹ دور کر دی کہ میں غلط کام کر رہی ہوں۔ اور اس کھیل سے مجھے ایسا لگا جیسے میں تنی ہوئی رسی پر چل رہی ہوں۔ میں اور لمبی لڑکی نے زمین پر اپنے ننگے بند کا خاکہ کھینچا۔ مگر میں نے خاکہ بناتے ہی اپنے جوتوں سے اسے مٹا دیا۔ پھر جلدی سے انڈر ویئر اوپر کر لیا۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ لیکن اس کا کھیل یہاں پر ہی ختم نہیں ہوا۔ اس نے وہی خاکے کئی جگہ دیوار پر بنائے بلکہ ایک مکان کے دروازے پر بھی وہ بنا دیئے۔ اس کی ڈرائنگ بہت اچھی تھی وہ دیکھے بغیر بھی بنا سکتی

MashalBooks.com

تھی۔ مجھے شرم آنے لگی تھی۔ میں نے اسے دھکا دیا اور وہ تمام خاکے مٹانا شروع کر دیے۔ مگر وہ دیوار کے پلستر اور دروازے کی پرانی لکڑی پر ایسے جم گئے تھے کہ میری کوشش کے باوجود وہ صاف نہیں ہوئے۔ ہم نے ایک غلط کام کیا تھا اسے صاف کرنا ضروری تھا۔ مجھے رونا آنے لگا تھا۔ میرا چہرہ غصے اور شرم سے سرخ ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ اسے صاف کرو۔ وہ میری پریشانی کا مزہ لے رہی تھی اسے اس کی پرواہ نہیں تھی کہ وہ خاکے باقی رہتے ہیں یا نہیں۔

''بیوقوف' یہ خاکے تمہارے نہیں ہیں۔ یہ مالک مکان کے خاندان کے ہیں۔''

''مگر کسی کو یہ کیسے معلوم ہوگا۔''

''سب کو معلوم ہو جائے گا۔ میں ہر خاکے پر نام لکھ دوں گی۔

اور اس لمبی لڑکی نے ہر خاکے کے نیچے مالک مکان کے خاندان والوں کے نام لکھ دیے۔ اوک بون کی دادی' اوک بون کی ماں' وغیرہ وغیرہ۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ لڑکی میری بات نہیں مانے گی وہ اپنی مرضی ہی کرے گی۔ مجھے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی میرے اندر اتنی ہمت آ گئی تھی کہ میں نے اسے وہ سب کرنے دیا بلکہ انتقام کے جذبے سے میرے دل میں سنسنی سی بھی ہونے لگی۔ اوک بون مالک مکان کی لڑکی کا نام تھا۔

ان تصویروں نے میرے خاندان کے لیے مصیبت کھڑی کر دی۔ لمبی لڑکی تو اپنے گھر چلی گئی مگر مجھے مالک مکان کے پکڑ لیا۔ وہ کام سے واپس آ رہا تھا' اس نے زور سے آواز دے کر اپنی بیوی اور داشتہ کو بلایا۔ دونوں عورتوں نے آتے ہی چیخنا شروع کر دیا۔ ''کتنی شرم کی بات ہے کتنی گھٹیا حرکت ہے' ماما بھی آ گئیں اور معافی مانگنے لگیں۔ ان کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ میرا بھائی بھی آ گیا۔ صرف وہی ایسا تھا جو سکون سے کھڑا تھا وہ حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا بھائی بہت ہی مضبوط اعصاب والا تھا۔

''میری بہن نے یہ نہیں کیا ہے۔ اسے کوریا کا رسم الخط آتا ہی نہیں ہے۔ اصل بات معلوم کرنے سے پہلے آپ میری بہن کو الزام نہیں دے سکتے۔

میرا بھائی مالکن مکان کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اور مجھے بچانے لگا۔ مالک مکان میرا کالر پکڑے کھڑا تھا اور میں سوکھے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔

آخر میرے بھائی کی بات مان لی گئی اور مالک مکان کا غصہ کم ہونے لگا۔ اس کا اندازہ مجھے مالک مکان کے ہاتھ سے ہو گیا جو ابھی تک میرے کالر پر تھا اچانک مجھے ہنسی آ گئی اور یہ ہنسی بہت خطرناک ثابت ہوئی۔ مالک مکان کو پھر غصہ آ گیا اور اس نے پہلے مجھے تھپڑ مارے اور پھر میرے بھائی کا گلا پکڑ لیا اور اس کے تھپڑ مارنے لگا۔

''کتیا کے بچے' تو بڑوں کے بیچ میں کیوں بولتا ہے۔ شرم نہیں آتی تجھے۔'' وہ کہہ کر وہ غصے میں پیر پٹختا ہوا گھر کے اندر چلا گیا۔ لیکن جانے سے پہلے ماما سے کہہ گیا کہ یہ گندی تصویریں صاف کر دو۔ میرے بھائی نے عقل کی بات کی تھی لیکن اسے سننے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ صرف تھپڑ کی بات نہیں تھی بلکہ مالک مکان کی گالیوں سے ماما کی عزت مجروح ہوئی تھی۔ میرا بھائی ماما کا بہت چہیتا تھا۔ وہ جس طرف سر کر کے سوتا تھا ماما اوپر سے گذرتی بھی نہیں تھیں۔ میرے بھائی کی لکھی ہوئی کاپیاں الماری میں ایسے محفوظ کر کے رکھی جاتی تھیں جیسے بزرگوں کے تبرکات۔ ماما کے لیے یہ اہمیت تھی میرے بھائی کی۔ اور اس بھائی کو کتیا کا بچہ کہا گیا تھا جو انتہائی شرم ناک گالی ہے۔ مالک مکان کے سامنے تو ماں بہت ہی دبی ہوئی رہتی تھیں لیکن وہ اس سے سخت نفرت کرتی تھیں کیونکہ اس کا تعلق اچھے خاندان سے نہیں تھا وہ اس کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا چاہتی تھیں۔ ماما نے کپڑا بھگویا اور وہ غلیظ تصویریں صاف کر دیں' جب وہ صاف کر رہی تھیں تو ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے وہ اپنے آنسو نہیں روک پا رہی تھیں۔

اس رات ماما بستر پر لیٹی روتی رہیں اور انہوں نے اپنے سسرال کو خط لکھا اور انہیں بتایا کہ کسی کا کرایہ دار رہنے سے کتنی تکلیف اور بے عزتی برداشت کرنا پڑتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ ایک دوسرے محلے میں چھوٹا سا مکان خریدنے کے لیے ان کی مدد کی جائے۔ اس محلے میں مکان سستے تھے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ وہ کسی مالیاتی ادارے سے قرض بھی لے سکتی ہیں۔ اس سے پہلے ماما نے سیول میں مکان خریدنے کی بات کبھی نہیں کی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ مجبوراً ایسا کر رہی تھیں۔ اس وقت ان کا یہ خیال تھا کہ اپنی معمولی آمدنی سے وہ میرے بھائی کی پڑھائی مکمل کرائیں اور جب وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے تو پھر وہ شہر کے اندر مکان خریدیں۔

ماما جب مجھے سیول لے جانے کے لیے گاؤں سے آئی تھیں تو اس وقت وہ پوری سیول کی عورت معلوم ہوتی تھیں۔ مگر وہ سب دکھاوا تھا اب وہ شہر کے باہر رہتی تھیں۔ اور شدید احساس

MashalBooks.com

کمتری کا شکار رہتی تھیں کیونکہ وہ پوری طرح سیول کی شہری نہیں بنی تھیں۔ شہر سے باہر اور گندے لوگوں کے درمیان ہی زندگی گذارنے کی وجہ یہ تھی کہ انہیں گاؤں بالکل پسند نہیں تھا۔ اور یہ سوچ کر انہیں افسوس ہوتا تھا کہ ان کے بچے دیہات میں پرورش پا رہے ہیں۔ یہ عجیب وغریب صورت حال تھی۔ اس متضاد صورت حال کے پنجے سے نکلنے کے بجائے وہ تضادات کی دلدل مین دھنستی چلی جا رہی تھیں۔

ظاہر ہے اس واقعے سے ماما کو میرے اوپر پابندی لگانے کا ایک اور بہانہ مل گیا تھا۔ انہوں نے میرے لمبی لڑکی سے ملنے پر پابندی لگادی۔ ماما اور میرے بھائی نے مجھ سے وہ تمام چیزیں چھین لیں جو مجھے پسند تھیں۔ ان دنوں میری دلچسپی کھانے پینے سے نہیں تھی بلکہ دوستوں سے تھی۔ میری دوست لمبی لڑکی نے باہر سے مجھے آواز دی کہ آؤ میرے ساتھ کھیلو۔ میں نے ڈر کے مارے ماما کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔ میرا پورا جسم ڈر سے کانپ رہا تھا۔

ماما نے مجھے دیکھا تو انہیں رحم آ گیا اور تھوڑی دیر کے لیے مجھے کھیلنے کی اجازت دے دی۔ وہ جانتی تھیں کہ میں ان کی اجازت کے بغیر باہر جانے کی کوشش کروں گا۔ ان کا خیال صحیح تھا اس لیے انہوں نے مجھے اجازت دے دی۔ مجھے وہ لڑکی بہت اچھی لگنے لگی تھی۔ اور میں گھر سے نکل کر اس کے پاس جانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ تنگ گلی، پتھر کی سیڑھیاں اور وہ ڈھلان جس کے ساتھ مانوس ہونے کا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اب مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں نئی زبان سیکھ رہی ہوں اس گلی سے مانوس ہونا میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔

ہر روز میں گھر سے باہر دور سے دور کھیلنے جانے لگی تھی۔ آخر ایک دن میں بڑی سڑک پر چلی گئی جہاں ٹرام آ جا رہی تھی۔ لمبی لڑکی نے مجھ سے کہا کہ ماما کے پیسے چوری کر کے لاؤ ہم ٹرام پر بیٹھیں گے۔ ٹرام پر بیٹھنے کے خیال سے ہی میرا دل دھڑکنے لگا تھا۔ مگر خوب اچھی طرح سوچنے کے بعد میں نے انکار کر دیا۔ یہ پہلی مرتبہ تھی کہ میں نے اس لڑکی کی بات نہیں مانی تھی۔ اور یہ بھی پہلی بار تھی کہ مجھے اپنے فیصلے پر اطمینان ہوا تھا۔

لمبی لڑکی نے کہا مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ میں تو کئی بار ٹرام پر بیٹھ چکی ہوں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ وہ مجھ سے ناراض نہیں ہوئی تھی۔

پھر اس نے کہا کہ میں تمہیں ٹرام سے بھی زیادہ دلچسپ چیز دکھاؤں گی۔ سڑک کے ساتھ

چڑھائی پر ایک اور راستہ تھا اس کی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک لوہے کا دروازہ اور بڑی سڑک نظر آتی تھی۔ اس دروازے کے چاروں طرف آسمان سے باتیں کرتی دیواریں تھیں جو دور تک چلی گئی تھیں۔ یہ وہی محل نما عمارت تھی جو ہمارے گھر کے قریب والی پہاڑی سے نظر آتی تھی۔ اگر پہاڑی کے اوپر سے دیکھا جاتا تو دیواروں کے اندر بہت سے بڑے بڑے مکان نظر آتے تھے۔ لیکن جہاں ہم کھڑے تھے وہاں سے صرف دیوار ہی نظر آ رہی تھی۔ میری دوست ٹرام سے بھی زیادہ جسے دلچسپ کہہ رہی تھی وہ سلائیڈ تھی۔ سڑک کے ساتھ چڑھائی پر جو کشادہ راستہ جاتا تھا وہاں بڑے بڑے جنگلے تھے جن کے دونوں طرف پانی بہہ رہا تھا۔ جنگلے اتنے چوڑے تھے کہ ان پر بچے بیٹھ سکتے تھے اور ان کی سطح پھسلواں تھی وہاں اور بھی بچے تھے جو ان پر پھسل رہے تھے اور خوب قہقہے لگا رہے تھے۔ پھسلنا بہت ہی مزیدار کھیل ہے۔ میں اس کھیل میں ایسی مست ہوئی تھی کہ مجھے وقت کا احساس ہی نہیں رہا۔ کئی دن میں وہاں جا کر پھسلتی رہی اور مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ میرا انڈرویئر گھستا جا رہا ہے وہ اصل سلائیڈ نہیں تھی اور اس کی سطح ہموار بھی نہیں تھی۔

مجھے ڈر تھا کہ ماما کیا کہیں گی کہ میں نے اپنا انڈرویئر پھاڑ لیا ہے۔ مگر ماما نے مجھے زیادہ نہیں ڈانٹا۔

''تم کہاں گئی تھیں کہ تمہارا انڈرویئر پھٹ گیا؟''۔

''بڑی عمارت کے پاس جہاں سلائیڈ ہیں۔''

''اچھا؟ تو یہاں بچوں کا اسکول بھی ہے جہاں سلائیڈ ہیں؟''

تم صرف ایک ہی کھیل کھیلتی ہو؟ تم جھولا کیوں نہیں جھولتیں؟''۔

ماما مجھے نئی عورت بنانا چاہتی تھیں اس لیے انہوں نے گاؤں کے کھلے میدان مجھ سے چھین لیے تھے۔ انہوں نے مجھ سے وہ بے پناہ پیار بھی چھین لیا تھا جو ہم سب کو دادا دادی کے گھر میں ملتا تھا۔ اب انہوں نے مجھے کرائے کے ایک گندے اور تنگ کمرے میں بند کر دیا تھا۔ وہ میری اس حالت پر پشیمان تھیں اور انہیں اس کی تکلیف بھی تھی۔ اب وہ خوش تھیں کہ میں نے اپنے کھیلنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کر لی ہے۔

ماما نے میرے انڈرویئر کی پھٹی ہوئی جگہ پر ایک موٹا سا کپڑا سی دیا۔ اس کے بعد میں نے اسے باہر پہننا بند کر دیا۔ میں نے دوسرے بچوں سے یہ بھی سیکھ لیا کہ انڈرویئر پھاڑے بغیر

MashalBooks.com

سلائیڈ پر کیسے پھسلا جاتا ہے۔اب میں اپنی ایڑیوں پر زیادہ دباؤ ڈالتی تھی۔

ایک دن ہم کھیل رہے تھے تو کسی بچے نے پکارا ''قیدی' قیدی'' اور پھر سب بچے وہاں سے بھاگے اور عمارت کے پیچھے چھپ گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں بھاگنے والوں میں سب سے پیچھے تھی۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا اور میرا چیخنے کو جی چاہ رہا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ''قیدی'' کا کیا مطلب ہے لیکن اپنے ساتھ کھیلنے والے بچوں سے یہ لفظ کئی بار سن چکی تھی۔اب پہلی بار بھی انہیں دیکھ رہی تھی۔اس وقت مجھے ان کی ایک جھلک ہی دکھائی دی تھی پھر بھی وہ مجھے خطرناک سے زیادہ ڈراؤنے نظر آئے۔ میں نے جیسے اس عمارت میں انہیں پیچھے سے دیکھا تھا وہ ویسے ہی معلوم ہو رہے تھے۔

انہوں نے سوکھے ہوئے خون کے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ان کے پیروں میں بیڑیاں تھیں اور وہ سر جھکائے چل رہے تھے۔ وہ ایک ایک قدم چلتے ہوئے بہت ہی پریشان معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ ایسے آدمی بھی دیکھے جن کی کمر میں خنجر بندھے ہوئے تھے۔اور وہ قیدیوں کو عقاب کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پتھر کی سیڑھیوں کے پار سرخ اینٹوں والے جنگلے کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کی قطار ختم ہی ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ مجھے ان قیدیوں میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آ رہی تھی کہ وہ کسی کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہوں' خاص طور سے وہ اس وقت جس حالت میں تھے۔ پھر بھی ہمیں ان سے ڈر لگ رہا تھا اور ہمارے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔ظاہر ہے یہ ہمارا وہم تھا اور یہ وہم ہی خوف پیدا کرتا ہے۔ کچھ بچوں نے ان کی طرف تھوکا اور کچھ نے زور زور سے پیر پٹخے۔ان کی دیکھا دیکھی میں نے ایسا ہی کیا۔لیکن یہ مجھے اچھا نہیں لگا۔

بچے پھر سلائیڈ پر پھسلنے لگے مگر میرا کھیلنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے میں گھر آ گئی۔

''ماما' یہ قیدی کیا ہوتا ہے؟''

''یہ تم کیوں پوچھ رہی ہو۔؟'' ماما کپڑے سی رہی تھیں۔انہوں نے اپنی سلائی پر نگاہیں جمائے جمائے کہا جیسے وہ میرے سوال کا جواب نہ دینا چاہتی ہوں۔ اس لیے میں نے انہیں ساری بات بتا دی کہ آج میں نے کیا دیکھا۔

''کیا کہا تم نے؟ تم جہاں کھیلتی ہو وہ قید خانے کا میدان ہے؟'' وہ اتنی حیران ہوئیں کہ ان

کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔تھوڑی دیر کے بعد کہیں جا کر ان کے حواس بحال ہوئے۔

پھر وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ان کے اندر جو بڑائی کا احساس تھا وہ غائب ہو گیا۔اس کے بعد وہ ایسی ہو گئیں جسے طاقت ہی نہ رہی ہو۔ مجھے ان پر رحم آنے لگا۔ میں انہیں تسلی دینا چاہتی تھی۔عام طور پر ماما کو غصہ نہ بھی ہوتا تب بھی ان کے چہرے پر غصہ ہی ہوتا تھا۔اصل میں انہیں اپنے اوپر اس لیے غصہ آتا رہتا تھا۔کہ وہ غریبوں اور گندے لوگوں کے محلے میں رہتی ہیں۔ایسے لوگوں میں جن سے وہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔اور یہ خیال بھی انہیں ستاتا رہتا تھا کہ ان کے پڑوس میں قید خانہ بھی ہے یہ باتیں ان کے لیے اتنی اذیت ناک تھیں کہ وہ جذباتی طور پر مفلوج ہو گئی تھیں۔اگر کسی انسان کے خیالات ایسے ہوں کہ دوسرے تمام لوگوں کو وہ قابل نفرت سمجھتا رہے تو اسے اپنی زندگی کے لیے کم سے کم امید کی کوئی کرن تو نظر آنا چاہیے۔ماما کے پاس یہ امید بھی نہیں تھی۔اب ان کے لیے اس سے زیادہ تکلیف کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ ان کی بیٹی قید خانے کے میدان میں کھیلتی ہے۔اس کے پاس کھیلنے کو اور کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔

ماما اپنے محلے سے ''شہر کے اندر'' کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھتی رہتی تھی۔شہر کے اندر رہنے کی اس خواش نے انہیں میرے لیے ایک مختلف اسکول ڈھونڈنے پر مجبور کیا۔انہوں نے اچانک مورک جائے اسکول کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔اس محلے کا ہر بچہ اسی اسکول میں جاتا تھا۔ انہوں نے ضد کی کہ مجھے ہر حالت میں شہر کے اندر کسی اسکول میں داخل کیا جائے گا۔اس زمانے میں ایلیمنٹری اسکول میں داخلے کے لیے بھی ٹیسٹ ہوتا تھا۔ جو بچہ وہ ٹیسٹ پاس کر لیتا تھا اسے داخلہ ملتا تھا۔اور پھر یہ بھی پابندی تھی کہ ہر بچے کو اپنے علاقے کے اسکول میں ہی داخل ہونا چاہیے۔

ماما کے کئی رشتے دار سیول کے مختلف محلوں میں رہتے تھے۔مگر وہ کہتی تھیں کہ جب تک ان کے بچے اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو جاتے اس وقت تک وہ ان رشتے داروں کی طرف دیکھیں گی نہیں۔انہوں نے ہم سے یہ بھی کہا تھا کہ اس روشن دن کے لیے وہ ہر قسم کی تکلیف برداشت کرتی رہیں گی۔لیکن اب اچانک وہ ان شتے داروں کے پاس پہنچ گئیں جو شہر کے اندر رہتے تھے۔اور وہ جگہ ہمارے محلے سے زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ محلّہ ''جنوبی دروازے'' کے اندر تھا۔ماما کی اس حرکت پر میرا بھائی منہ پھیر کر مسکرا دیا تھا۔

آخر ماما کو ایک ایسا رشتہ دار مل گیا جو عارضی طور پر مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر رضامند ہو گیا۔وہ

MashalBooks.com

لوگ'' ساجک دونگ میں رہتے تھے۔ مجھے جس اسکول میں داخل کیا جارہا تھا۔ وہ تھامے ڈونگ ایلیمنٹری اسکول تھا۔ ماما اپنی اس خوش قسمتی پر بہت خوش تھیں۔ وہ رشتہ دار ہم سے زیادہ دور نہیں رہتے تھے۔ وہاں ہم پیدل بھی جاسکتے تھے۔ وہ بہت خوش تھیں کہ انہیں وہ رشتے دار مل گئے تھے۔ انہوں نے مجھے مبارک باد بھی دی تھی۔ مگر مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ اسکول جانے کے لیے مجھے ٹرام پر نہیں بیٹھنا پڑے گا۔ ٹرام پر بیٹھنے کے بجائے اگر میں پیدل بھی جاتی تب بھی مجھے اتنی خوشی تو ملنا چاہیے تھی کہ میں شہر کے اندر آزادی مینار کے قریب سے گذرتی۔

معلوم نہیں کیوں میرا اسکول پہاڑی کے نیچے تھا۔ یہ وانگ پہاڑی کی ڈھلان تھی۔ شہر سے باہر رہنے کی وجہ سے مجھے کمتری کا احساس رہتا تھا۔ اب یہ امید پیدا ہوئی کہ میں شہر کے اندر ایک اسکول میں جاؤں گی تو مجھے خوشی ہوئی کہ اب شہر دیکھوں گی۔ شہر کے دروازے سے جو راستہ جاتا تھا وہ پہاڑی کے اوپر تک چلا جاتا تھا جہاں سے لوگوں سے بھری ہوئی سڑکیں نظر آتی تھیں۔ شہر جانے کے بارے میں میرا جو خیال تھا وہ بہت اچھا بھی نہیں تھا۔

شہر کے اندر اسکول جانے کے لیے مجھے بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑ رہی تھی۔ داخلے کے ٹیسٹ کے لیے ماما نے جو میرے کپڑے خریدے ان پر کافی رقم خرچ ہوگئی۔ اس کے علاوہ جن رشتے داروں کے گھر کا پتہ ہم نے دیا تھا ماما نے ان کی بھی بہت خوشامد کی تھی حالانکہ وہ کبھی کسی کے آگے سر نہیں جھکاتی تھیں۔ میرے لیے بھی مسئلہ یہ تھا کہ مجھے ان رشتے داروں کے گھر کا پتہ یاد رکھنا پڑتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں اپنا پرانا پتہ بھول جاؤں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اگر میں راستہ بھول جاؤں تو پولیس کو اپنے گھر کا بتاؤں۔ آخر میں ٹیسٹ میں کامیابی ہوگی اور اسکول میں داخلہ مل گیا۔ اب مجھ سے کہا گیا کہ رشتے داروں کے گھر کا پتہ یاد رکھو۔ میں شدید جذباتی دباؤ میں چلی گئی تھی۔

یہ میرے لیے مشکل نہیں تھا کہ میں دونوں پتے یاد رکھوں۔ اور پھر میں یہ بھی جانتی تھی کہ کہیں بھی مجھے دونوں پتے بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ لیکن ماما اخلاق اور آداب کی بہت پابند تھیں۔ انہیں یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ میں کسی اور کے گھر کا پتہ استعمال کروں۔ کبھی کبھی وہ میرا امتحان لیا کرتی تھیں۔ تم کہاں رہتی ہو؟۔ فرض کرو تم کھوگئی ہو تو تم کیا پتہ بتاؤ گی۔ تم ٹیچر کے سامنے کھڑی ہو۔ بتاؤ تمہارے گھر کا پتہ کیا ہے؟ انہیں ڈر لگا رہتا تھا۔ کہ کہیں میں دونوں پتے خلط

ملط نہ کردوں۔ انہوں نے یہ امتحان اتنی مرتبہ لیا کہ میں خود ہی الجھن میں پڑ گئی۔ دوسرا مسئلہ وہ پہاڑی تھی جو ہیونگ جو ڈونگ کو ساجک پارک سے ملاتی تھی۔ اس پہاڑی پر وانگ پہاڑی سے زیادہ پیڑ تھے۔ راستہ بالکل سنسان ہوتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ پہاڑی کے غاروں میں کوڑھی رہتے ہیں۔ ماما نے اس افواہ کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور مجھے ان سے ہوشیار رہنے کو کہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس راستے پر جاتے میری جان جاتی تھی۔ وہ کوڑھی مجھے کہانی کے اس شیر سے بھی زیادہ خوف زدہ کرتے تھے جس نے بوڑھی عورت سے کہا تھا۔

''بڑھیا' بڑھیا' اگر تو مجھے چاول کے کیک کا ایک ٹکڑا دیدے تو میں تجھے چھوڑ دوں گا۔''

مجھے بتایا گیا تھا کہ کوڑھی ان بھکاریوں کے سے کپڑے پہنتے ہیں جو میں نے گاؤں میں دیکھے تھے' ان کے سر پر ٹیڑھی میڑھی ٹوپی ہوتی ہے جس سے وہ اپنا چہرہ چھپائے رکھتے ہیں تاکہ ان کی وہ آنکھیں نظر نہ آئیں جن کی پھنویں گر چکی ہیں۔ وہ پورے دانت نکال کر ہنستے ہیں اور ان کے ہونٹ نیلے ہوتے ہیں۔ وہ بچوں کو پھسلا کر اپنے غار میں لے جاتے ہیں اور ان کا جگر نکال کر کچا کھا جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنا منہ ایسے صاف کرتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ شروع میں مجھے ایسا ڈر لگا تھا کہ میں نے داخلے کا ٹیسٹ دینے سے ہی انکار کردیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ جب تک ماما میرے ساتھ نہیں جائیں گی میں اس راستے پر جاؤں گی ہی نہیں۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ میں کہہ دوں گی کہ بیمار ہوگئی ہوں۔

اپنی اس اسکیم پر عمل کرنے کے لیے میں نے یہ حرکت کی کہ جب بھی مجھ سے وہ پتہ پوچھتیں میں جان بوجھ کر غلط جواب دیتی۔ اس سے ماما کو جو تکلیف ہوتی وہ ان کے چہرے سے ظاہر ہونے لگتی اور مجھے افسوس ہوتا آخر مجھے ان پر اتنا رحم آیا کہ میں نے اپنی وہ اسکیم ختم کردی۔

''بیٹی ایک بات یاد رکھنا لڑکی کو اسکول بھیجنا لڑکے کو بھیجنے سے مختلف ہے۔ میں تم سے یہ توقع نہیں رکھتی کہ تم پڑھ لکھ کر میری مدد کروگی۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ تم اچھی زندگی بسر کرو۔ بس میں یہی چاہتی ہوں۔ اگر تمہارا بھائی کامیاب ہوگیا تو ہمارا پورا خاندان کامیاب زندگی گذارے گا۔ تم پڑھ لکھ کر نئی عورت بن گئیں تو تم اپنی زندگی خود گذاروگی۔ آیا سمجھ میں؟'' ماما نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

ماما جب ایسی باتیں کرتیں تو ان کی آنکھیں سرخ ہوجاتیں اور میں اپنی نگاہیں ان کی آنکھوں

MashalBooks.com

سے نہیں ہٹا سکتی تھی۔ میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا تھا کہ نئی عورت کیا ہوتی ہے۔ ماما مجھے جو عورت بنانا چاہتی ہیں وہ کرتی کیا ہے۔ ماما نے اپنے شوہر کو بچانے کی بہت کوشش کی تھی جنہیں پیٹ کی کوئی خطرناک بیماری تھی یا اپنڈکس تھی لیکن دادی کے مجبور کرنے پر وہ جھاڑ پھونک کرنے والے کے پاس چلی گئی تھیں اور اپنے شوہر کو کھو دیا تھا۔ انہوں نے اپنے شوہر کے ماں باپ اور دادادادی کو اس لیے چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ دیہات کی اس جہالت سے نکل بھاگیں جس میں صحیح دواؤں اور جونکوں سے آنکھ کی بیماری کا علاج کرنے میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی تھی۔ ماما کو دیہاتی زندگی سے جو نفرت تھی اور تعلیم اور آزادانہ زندگی گذارنے کا جو شوق تھا اس سے میرا دل بھر آتا تھا میں پوری طرح ان کے ساتھ تھی۔

میں نے داخلے کا امتحان پاس کرلیا۔ ماما نے اپنی سسرال والوں کو جو خط لکھا اس میں ایسی بڑھا چڑھا کر میری تعریفیں کیں جیسے میں نے سرکاری ملازمت کا امتحان پاس کرلیا ہو۔ اس سے میرے دادادادی کو خیال آیا کہ ان کے پوتا پوتی سیول میں بڑی کامیابی کے ساتھ ترقی کررہے ہیں تو انہیں بھی کنجوسی نہیں کرنا چاہیے۔ اور ماما کی کچھ نہ کچھ مدد کرنا چاہیے۔

آج کے حساب سے بھی اگر دیکھا جائے تو دیہات کے غریب خاندان اپنا پیٹ کاٹ کر کتنی ہی زیادہ رقم بھیجتے ہیں شہر پہنچ کر وہ رقم معمولی ہی ہوجاتی ہے۔ ماما نے ایک مالیاتی ادارے سے قرض لے کر اور اس میں دادادادی کی رقم ملا کر ایک گھر خریدنے کے لیے آدھی قیمت ادا کردی۔ اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس رقم سے ہمیں جو مکان ملا وہ ہیون جوڈونگ پہاڑی کے اوپر تھا۔ وہ مکان اس کمرے سے بھی بہت بلندی پر تھا جو ہم نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ وہ مکان پہاڑی پر ایسی جگہ تھا جہاں وہ محلہ ختم ہوجاتا تھا۔

یہ چھوٹا سا مکان تھا لیکن اس کی چھت خوبصورت ٹائلوں والی تھی۔ ماما اس سے بھی خوش نہیں تھیں کیونکہ وہ بھی شہر کے دروازے کے باہر تھا' وہاں کے لوگ بھی اپنی پہاڑی سے باہر کی دنیا کو بالکل نہیں جانتے تھے۔ وہ اس پہاڑی پر چڑھنے اترنے میں ہی مگن رہتے تھے۔ ماما کو وہاں کے ہمسائے تو پسند نہیں تھے لیکن مکان پسند تھا کہ وہ اپنا تھا۔ مکان کے اندر دیواروں کے کاغذ گل گئے تھے اور ان کا رنگ بھی خراب ہوگیا تھا اور دیواروں پر کھٹملوں کے خون کے نشان تھے۔

''توبہ توبہ۔ کتنی گھناؤنی بات ہے۔ وہ لوگ تو چلے گئے مگر کھٹملوں کے کاٹنے سے ان کا جو

خون نکلا تھا دیواروں پر اس کے نشان چھوڑ گئے ہیں۔''

ماما نے کھڑکی کے سرکنے والے کواڑ نکالے اور پھر انہوں نے کمروں کے سرکنے والے کواڑ بھی نکال دیے۔ پھر انہیں سوڈے سے خوب دھویا تو ان کی درزوں میں جو کھٹمل چھپے ہوئے تھے وہ نیچے گر گئے۔

''یہ نہ سمجھنا کہ یہ مر گئے ہیں۔ ابھی زندہ ہیں۔ اگر انہوں نے میرے بیٹے اور بیٹی کا خون چوسا تو وہ بھی ان کی طرح ڈھانچہ بن جائیں گے۔ ماما بولے جارہے تھیں۔

بہرحال انہیں فخر تھا کہ وہ گھر کی مالک بن گئی ہیں چاہے وہ گھر پہاڑی کی چوٹی پر ہی کیوں نہ ہو۔ انہوں نے چوکھٹوں کو بھی سوڈے سے دھویا اور سارے گھر میں کیڑے مارنے والی دوا چھڑکی انہوں نے دیواری کاغذ اور فرش بھی تبدیل کیا۔ شروع میں میں اور میرا بھائی دونوں پریشان تھے کہ ماما کو اپنے مکان کی خوشی تو ہے مگر اس گندے مکان میں ہم رہیں گے کیسے۔ لیکن ہر روز اس مکان میں جو تبدیلیاں آرہی تھیں اس کے ساتھ ہی ہم اپنی رائے بھی بدل رہے تھے۔ ہم اسکول سے آتے ہی ماما کے ساتھ کام کراتے بلکہ گھر کو صاف ستھرا کرنے میں ہمیں خوشی ہوتی تھی۔ جس دن ہم اس گھر میں آئے اسی دن ماما ایک بڑا سا برتن خرید کر لائیں۔ پھر انہوں نے خود ہی چولہا وغیرہ بنایا اور وہ برتن چولہے پر رکھ دیا۔ ان کے لیے کوئی کام بھی مشکل نہیں تھا۔ وہ دیواری کاغذ لگانے' پینٹ کرنے حتی کہ پلستر کرنے کی بھی ماہر تھیں۔

ہم نے اپنے مکان میں جو پہلی رات گذاری اس میں ہم تینوں ساتھ ساتھ لیٹ گئے۔ آخر یہاں ہمیں اپنا مکان مل گیا چاہے وہ سیول کے دروازے سے باہر ہی ہے۔'' ماما نے بہت ہی جذباتی لہجے میں کہا۔

ہمارے چھوٹے سے گھر میں ہر وہ چیز تھی جس کی ہمیں ضرورت تھی۔ اس میں الگ الگ برابر برابر چھ حصے تھے۔ ماسٹر بیڈروم' بیٹھنے کا کمرہ' دوسرا کمرہ' باورچی خانہ' پھر میرا کمرہ اس کے بعد دروازے کے اندر چھوٹی سی کھلی ہوئی جگہ۔ اس میں صحن بھی تھا۔ صحن میں ایک خرابی تھی وہ سیدھا ہونے کے بجائے ٹکونا تھا۔ ماما اسے زیبائشی صحن کہتی تھیں۔ اس گھر کا رخ پہاڑی کی طرف نہیں تھا۔ اس کا رخ گلی کی طرف تھا۔ صحن کے ساتھ جو لمبی سی دیوار تھی وہ دوسرے گھر کے دروازے سے ملی ہوئی تھی۔ یہ دیوار ایک مضبوط پٹشتے سے محفوظ کی گئی تھی۔

MashalBooks.com

رات کو جب بھی بارش ہوتی تو میرا بھائی جاگ جاتا اور اندر باہر چکر لگاتا رہتا۔ اسے ڈر لگا رہتا کہ کہیں وہ نازک سا اونچا پشتہ ہی نہ بہہ جائے۔

''بیٹے' تم یہ کیوں سوچتے ہو کہ اب یہ پشتہ بہہ جائے گا۔ اس سے پہلے تو وہ ٹوٹا نہیں۔'' ماما اس سے مذاق کرتیں۔ لگتا تھا کہ انہیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں بھی کوئی اور پریشانی نہیں تھی۔

میں نے صحن میں کئی قسم کے پھولوں کے پودے لگانے کا سوچا۔ اس گھر میں آنے کے بعد میں اور بھی اکیلی ہوگئی تھی۔ لمبی لڑکی کی دوستی ختم ہو چکی تھی۔ یہاں میں ہی اکیلی لڑکی تھی جو محلے سے باہر کے اسکول میں پڑھنے جاتی تھی۔ اس لیے محلے کے اسکول میں پڑھنے والے بچوں کے لیے میں بالکل ہی اجنبی تھی۔ وہ جان بوجھ کر مجھ سے دور رہتے تھے۔ ماما اس سے بہت خوش تھیں۔ وہ رہتی تو شہر کے دروازے سے باہر تھیں مگر خواب شہر کے اندر رہنے کے دیکھتی رہتی تھیں۔ وہ مجھ سے بھی توقع کرتی تھیں کہ میں محلے کے بچوں سے مختلف رہوں۔ دراصل میں شہر کے اندر کی رہنے والی ہوں۔ انہوں نے مجھے جھوٹ بولنے کے لیے کہا حالانکہ وہ خود کہا کرتی تھیں کہ جھوٹ بولنا بری بات ہے۔ صرف یہی نہیں انہوں نے مجھے اسکول بھیجنے کے لیے ایک رشتے دار کے گھر کا پتہ بھی قرض لینے میں عار نہیں سمجھا تھا۔ وہ میری وجہ سے یہ ساری بے عزتی برداشت کر رہی تھیں۔ وہ تو یہ بھی برداشت کر رہی تھیں کہ میں روزانہ اس راستے سے گھر جاؤں جہاں کوڑھی رہتے ہیں۔ وہ ہر حال میں مجھے اسکول بھیجنا چاہتی تھیں۔ اور میں خوب جانتی تھی کہ وہ مجھے شہر کے اندر اسکول کیوں بھیجتی تھیں۔ وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ حقیقت اور خواب کے درمیان پل کیسے بنایا جائے۔ وہ انجانے میں اپنے بچوں کو استعمال کر رہی تھیں۔ اصل میں انہیں علم ہی نہیں تھا کہ اس طرح ان کے اپنے بچے بھی ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کا شکار ہو رہے ہیں۔

اب نہ محلے میں میرا کوئی دوست تھا اور نہ اسکول میں میری ہم جماعت اس محلے میں رہتی تھیں اس وجہ سے وہ اپنے آپ کو مجھ سے الگ سمجھتی تھیں۔ وہ آپس میں ہی کھیلتی تھیں' آپس میں ہی لڑائی جھگڑا کرتی تھیں اور اپنی مرضی سے سہیلیاں بناتی بگاڑتی تھیں۔ ان کا اپنا ہی گروپ تھا۔ اس گروپ سے باہر کے بچوں کو وہ اپنا دشمن سمجھتی تھیں۔ میں اکثر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی کہ مجھے دور کیوں رکھا جاتا ہے۔ کیا میں ان سے مختلف نظر آتی ہوں۔ اور ''مختلف ہوں'' تو کیسے؟۔

ماما مجھے یقین دلانے کی کوشش کرتی رہتی تھیں کہ میں محلے کے بچوں سے مختلف ہوں۔ ان کے سامنے نئے زمانے کی عورت کا ایک معیار تھا۔ وہ میرے اندر احساس' برتری پیدا کرنا چاہتی تھیں۔

مگر ایک بار میں پہاڑی کے اوپر اپنی ہم جماعت لڑکیوں کے ساتھ کھڑی تھی تو مجھے کمتری کا شدید احساس ہوا۔ میں نے سوچا کہ کاش ماما کو میرے جذبات کا بھی خیال ہوتا۔ میرے لیے تو برتری اور کمتری کے احساس ایک ہی قسم کے پیڑوں جیسے تھے ان دونوں میں بیگانگی اور تنہائی کے ہی پھل لگتے تھے۔

میرے لیے نئے زمانے کی جو پہلی عورت تھی وہ میری پہلی جماعت کی استانی تھی۔ وہ نئی عورت کے ہر معیار پر پورا اترتی تھیں۔ وہ بیچ میں مانگ نکالتی تھیں اور سر کے پیچھے جوڑا باندھتی تھیں۔ وہ سفید ریشمی بلاؤز' کالا اسکرٹ اور اونچی ایڑی کے جوتے پہنتی تھیں۔ میں نے دیکھا تھا کہ اسکول آتے جاتے وہ کالا پرس ہاتھ میں رکھتی تھیں۔ ہم کتنا ہی مشکل سوال کرتے وہ سب کا جواب دیتی تھیں۔ وہ بہت پڑھی لکھی بھی تھیں اور اپنی طالبات سے پیار بھی بہت کرتی تھیں۔ ان کے چہرے پر سرخ دھبے تھے لیکن وہ کبھی میک اپ نہیں کرتی تھیں وہ ہر وقت مسکراتی رہتی تھیں اور بچے انہیں گھیرے رہتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ مرغی ہیں جس کے گرد اس کے بچے پھر رہے ہیں۔ میں انہیں دور سے دیکھتی تھی کہ وہ بچوں میں گھری کھڑی ہیں اور میں دانتوں سے ناخن کاٹتی رہتی تھی۔ دانتوں سے ناخن کاٹنا میری عادت بن گئی تھی۔ کلاس کے اندر بھی میں ناخن کاٹتی اور اسکول آتے جاتے بھی۔

ہر بچہ ان استانی کا ہاتھ پکڑنے کے لیے مرا جاتا تھا جب وہ ہاتھ پکڑ لیتا تو پھر چھوڑتا ہی نہیں تھا۔ اب چونکہ ان کے دو ہی ہاتھ تھے اس لیے وہ ہر بچے کو اس کا موقع دینا چاہتی تھی۔ میری استانی اپنے پیار کا اظہار اس طرح کرتیں۔ ''اچھا بچو' جس نے میرا ہاتھ نہیں پکڑا اور وہ اپنا ہاتھ کھڑا کردے۔'' اس پر بچوں کی آوازیں آتیں'' میں نے' میں نے'' پھر وہ ان بچوں کو بلاتیں جنہوں نے ہاتھ نہیں پکڑے تھے۔ وہ زور سے ہاتھ پکڑ لیتیں یا پھر پیار سے اسے تھپ تھپاتیں۔ میں نے کبھی اپنا ہاتھ نہیں اٹھایا۔ میں دور کھڑی دانتوں سے ناخن کاٹتی رہتی تھی۔

مجھے وہ استانی اچھی بھی نہیں لگتی تھیں۔ ہر وقت ان کے ہونٹوں پر چمکتی مسکراہٹ پھیلی رہتی

MashalBooks.com

تھی جیسے وہ ہر ایک سے برابر کا پیار کرتی ہیں۔ میں جانتی تھی کہ ان کی مسکراہٹ جعلی ہے کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے پیار نہیں کرتیں۔

گرمی بڑھی تو انوانگ پہاڑی کی طرف میری توجہ زیادہ ہوگئی۔ وانگ میں اکثر لوگ پانی کو ترستے تھے۔ کسی گھر میں بھی پانی کا نل نہیں تھا۔ اگر کسی گھر میں بالٹی میں پانی بھر کر لانے والا کوئی نہیں ہوتا تھا تو اسے پانی خریدنا پڑتا تھا۔ ماما باقی تو سارے کام کر لیتی تھیں مگر بالٹی میں پانی بھر کر نہیں لا سکتی تھیں۔ اگر وہ کام کر لیتی بھی تو سرکاری نل سے دو بالٹی پانی لانے میں انہیں آدھا دن لگ جاتا۔ سرکاری نل تک جانے کے لیے سیڑھیاں اترنا پڑتی تھیں۔ اس نل سے پانی لینے والوں کی لمبی قطار ہوتی تھی۔ یہاں سے وہاں تک بالٹیاں ہی بالٹیاں رکھی ہوتی تھیں۔ اور قطار دن بھر لگی رہتی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے ماما پانی خریدتی تھیں اس لیے وہ اس وقت گھر کا دروازہ کھلا رکھتی تھیں۔ پانی بیچنے والے کی گاڑی کی آواز عجیب وغریب تھی۔ اس کی چرخ چوں دور سے سنائی دے جاتی تھی۔ گاڑی قریب ہوتی تو چراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلتا۔ اور پھر بڑے برتنوں میں پانی ڈالا جاتا تو غٹ غٹ کی آواز آنے لگتی۔ اس سے میری آنکھ کھل جاتی اور جب صبح ہوتی تو میں گہری نیند میں ہوتی۔

جو پانی خریدا جاتا تھا وہ صرف پینے کے لیے ہوتا تھا۔ جب بھی بارش ہوتی تو ماما گھر کے تمام برتن بھر لیتیں وہ نہیں چاہتی تھیں کہ بارش کا ایک قطرہ بھی ضائع ہو۔ وہ بارش کے پانی سے برتن اور کپڑے دھوتی تھیں اور ہمیں بھی اسی پانی سے نہاتی تھیں۔ اگر ہمیں پانی میں کوئی کیڑا نظر آجاتا تو وہ کہتی تھیں کہ پہلے پانی چھان لو۔ ہم جس پانی سے ہاتھ منہ دھوتے تھے ماما اس پانی کو بھی ضائع نہیں کرتی تھیں۔ وہ اس سے ہمارے پیر دھلاتیں اور پرانے گندے کپڑے بھی اسی پانی سے دھوئے جاتے تھے۔ اس کے بعد وہ مجھ سے کہتیں کہ پھولوں کی کیاریوں میں بھی وہی پانی ڈالو۔ کفایت کے ساتھ پانی استعمال کرنے کا یہ ہمارا روزانہ کا معمول تھا۔ اور ہر صبح ماما اس کی نگرانی کرتی تھیں۔

یہ تو تھی پانی کی راشن بندی۔ اس عرصے میں برسات کا موسم آجاتا اور میری خوشی کی انتہا نہ رہتی جب میں انوانگ پہاڑی کی گھاٹی میں تازہ تازہ ٹھنڈا پانی بہتا دیکھتی۔ اسکول سے فارغ ہوتے ہی میں پہاڑی پر چلی جاتی۔ وہاں ٹھنڈے پانی سے خوب ہاتھ منہ اور پاؤں دھوتی۔ اس

کے بعد پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ جاتی۔ اور وہاں آرام سے بیٹھ کر سیول کا نظارہ کرتی۔ کبھی کبھی میں پرانے کپڑے بھی وہاں لے جاتی اور انہیں دھوتی۔ میں یہ کپڑے اتنی صفائی سے دھوتی کہ ماما خوش ہو جاتیں اور میں جتنی دیر بھی پہاڑی پر رہتی وہ ناراض نہ ہوتیں۔ وہ مجھے صابن دیتیں اور کہتی کہ اسے زیادہ نہ گھسنا۔

میں چشمے کے ٹھنڈے پانی میں کھڑے ہو کر کپڑے دھوتی تھی قریب کے مندر میں جب بھی ڈھول کی آواز سنائی دیتی تو میں سر اٹھا کر اوپر دیکھتی اور سوچتی ''اس زندگی کا مقصد کیا ہے؟'' اور پھر بڑی عمر کے لوگوں کی طرح میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ جاتی۔

ایک دن میں چشمے میں کھڑی کپڑے دھو رہی تھی تو گاڑھا گاڑھا خون بہتا ہوا نظر آیا۔ میں گھبرا کر وہیں جم گئی اور اس وقت تک اسی طرح کھڑی رہی جب تک خون ملا ہوا پانی بہہ نہ گیا۔ خون ملا ہوا پانی بہنے کے بعد بھی کافی دیر میری آنکھوں سے وہ منظر نہیں ہٹا میرا دل زور زور سے دھڑکتا رہا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کوڑھی لوگ کسی بچے کا جگر نکال کر اسے دھو رہے ہیں۔ میرے اندر تجسس کی آگ بھڑک اٹھی اور میں کنارے سے بچتی ہوئی چشمے کے بالائی حصے کی چل پڑی۔ میں ایسے چل رہی تھی کہ پیروں کی چاپ نہ سنائی دے جائے۔

ابھی میں زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ سامنے ایک لڑکی نظر آئی وہ مجھ سے بڑی تھی اور ایک چٹان پر چت لیٹی ہوئی تھی۔ وہ گا رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی آدمی نے کسی لڑکی کا جگر نہیں نکالا میں نہیں جانتی کہ وہ کیا گا رہی ہے مگر اس کی آواز میں سوز تھا جیسے وہ رو رہی ہو۔ جس چوڑی چٹان پر وہ لیٹی تھی اس پر کپڑے سوکھ رہے تھے۔ لیکن وہ عام کپڑے نہیں تھے بلکہ چیتھڑے سے تھے ان چیتھڑوں پر خون کے دھبے تھے۔ وہ دھبے دیکھنے کے لیے میں ان کے اور قریب چلی گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ لڑکی مسکرائی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا

''بیوقوف۔ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں یہ عورتوں کے کپڑے ہیں میری ماما کے ...''

اس رات میں نے اپنی ماما کو وہ ساری بات بتائی اور پوچھا کہ یہ عورتوں کے کپڑے کیا ہوتے ہیں؟''

''اوہ خدایا' دن میں وہ کپڑے دھونا کتنی گندی بات ہے اور پھر اس عورت نے اپنی بیٹی کو ان

MashalBooks.com

کپڑوں کے پاس بٹھادیا ہے۔ وہ بہت ہی گنوار لوگ ہوں گے۔ بس' آج سے تم پہاڑی پر نہیں جاؤ گی۔ دیکھو تو' یہ ہمارے پڑوسی کیسے گندے ہیں۔ میں تو اپنی بچی کو ان کے قریب بھی نہیں جانے دوں گی۔'' ماما نے مجھے یہ تو نہیں بتایا کہ عورتوں کے کپڑے کیا ہوتے ہیں الٹا پڑوسیوں کے خلاف تقریر کر ڈالی۔

ماما جب بھی گنوار اور گندے کے الفاظ استعمال کرتیں تو مجھے متلی ہونے لگتی۔ وہ لڑکی جو چٹان پر لیٹی گانا گا رہی تھی اور آسمان پر اڑتے بادل دیکھ رہی تھی اس نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے نظر نہیں آتی تھی ماما جن سے میل جول رکھنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ میں اپنے اندر ایک بے چینی سی محسوس کرتی تھی۔ مجھے اس لڑکی کی آزادی پر رشک آتا تھا۔

ماما کو اب اپنا گھر مل گیا تھا پھر بھی وہ اپنے ہمسایوں کو اسی طرح اپنے آپ سے کمتر اور گنوار کہتی تھیں جیسے کرائے کے کمرے میں رہتے ہوئے وہاں کے لوگوں کو کہتی تھیں۔ انہوں نے مجھے پڑوسیوں سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اب مجھے کپڑے دھونے کے لیے چشمے پر جانے کی اجازت نہیں تھی ایک دن ماما نے میرے ہاتھ میں چاولوں کا وہ کیک دیکھ لیا جو جن بھوت اتارنے والے مندر میں بانٹا جاتا ہے تو میرے ٹہلنے پر بھی پابندی لگ گئی اب میرے کھیلنے کے لیے صرف وہی جگہ رہ گئی تھی جو افوانگ پہاڑی اور قید خانے کے درمیان تھی۔ پہاڑی ہمارے گھر کے پیچھے تھی اور قید خانہ سامنے۔

ماما نے پڑوسیوں کو تین قسموں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ غیر ملنسار' نفرت کے قابل اور اچھوت۔ ہر قسم کی کوئی وضاحت نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کا تعلق خاندان' رہن سہن' بول چال کے انداز یا پیشے سے نہیں تھا۔ وہ ماما کی اپنی مرضی تھی کہ جسے جو چاہیں نام دے دیں ان کا اپنا مزاج ڈھلمل سا ہی رہتا تھا۔

ہمارا ہر ہمسایہ' چاہے وہ ماما کا اچھوت ہی کیوں نہ ہو' پانی لانے والے کو ''بوڑھا کم'' کہتا تھا۔ کوئی بھی اس کا نام عزت سے نہیں لیتا تھا۔ لیکن ماما اسے ''کم صاحب'' کہتی تھیں اور اس کی بہت عزت کرتی تھیں اس سے پانی خریدنے والے باری باری اپنے گھر میں اسے کھانا کھلاتے تھے۔ ماما کی باری مہینے میں ایک بار آتی تھی۔ باقی لوگ تو اسے گوبھی کی چٹنی اور ایک ساتھ سوپ دیتے تھے۔ اور اسے باورچی خانہ کے قریب بٹھا کر کھلاتے تھے۔ اکثر لوگ تو اس کی اتنی

خاطر مدارت بھی نہیں کرتے تھے۔

لیکن ماما کا رویہ بالکل ہی مختلف تھا۔ وہ اس دن کا بے چینی سے انتظار کرتیں جب اس کی دعوت ہوتی وہ بڑی محبت سے کھانا تیار کرتیں۔ طرح طرح کے اتنے بہت سے کھانے ہوتے کہ ڈر لگتا تھا کہ کہیں پلیٹ نہ ٹوٹ جائے۔ وہ اسے بڑی عزت کے ساتھ دوسرے کمرے میں کھانے کی میز پر بٹھاتیں۔ اس کے لیے تلا ہوا گوشت اور مچھلی کا اسٹیو پکایا جاتا۔ سبزی اور نمک لگی مچھلی بھی اسے کھلائی جاتی۔ چاولوں کا پیالہ اوپر تک خوب بھرا ہوتا جیسے دیہات میں مزدوروں کو پیالہ بھر کے چاول دیے جاتے ہیں۔ وہ بوڑھا خوب پیٹ بھر کے کھاتا اور سر جھکا جھکا کر شکریہ ادا کرنے کے ساتھ پیٹ پر بھی ہاتھ پھیرتا جاتا۔ وہ یہ بھی کہتا کہ ماما نے اس کی ایسی خاطر کی ہے جیسے اس کی سالگرہ ہو۔ ماما کی خاطر مدارت کا بدلہ وہ اسی طرح دیتا کہ ہر تقریب کے موقع پر ایک بالٹی پانی زیادہ دے دیتا۔ وہ ہمیں بتائے بغیر ہی کسی برتن میں پانی بھر دیتا۔

ان باتوں سے میری پریشانی اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ماما اس بوڑھے کا اتنا خیال کیوں کرتی ہیں۔ ہمسائے کے تو بچے بھی اس بوڑھے کے ساتھ اچھی طرح پیش نہیں آتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ بات کرتے تو ان کا لہجہ بھی اچھا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے برعکس ماما جو پڑوسیوں سے غرور کے ساتھ بات کرتی تھیں اس بوڑھے سے عزت کے ساتھ پیش آتیں۔ وہ اس بوڑھے کو میرے بھائی سے بھی اچھا کھانا کھلاتی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ وہ بوڑھا رنڈوا ہے اور ماما بیوہ ہیں۔ جب مجھے یہ خیال آتا کہ ماما اس بوڑھے کو پسند کرتی ہیں تو میں کانپ اٹھتی۔ یہ بہت ہی بے عزتی کی بات تھی۔ پھر یہ خیال ''بھوت بن کر میرے دماغ پر چھا گیا۔ اس خیال کے بعد ایک صبح جب پانی بھرنے کی آواز سے میری آنکھ کھلی تو میں نے ماما کو ٹٹول کر دیکھا اور ان سے لپٹ گئی۔ میں ان کے پیار میں ان سے نہیں لپٹی تھی بلکہ میں نے تو انہیں صرف اس لیے پکڑا تھا کہ کہیں وہ اٹھ کر بوڑھے کے پاس نہ چلی جائیں۔

آخر اپنا خوف میں نے اپنے بھائی کو بھی بتا دیا۔

''ماما کم کی عزت کرتی ہیں پتہ ہے کیوں؟ مسٹر کم ویسے تو پانی بیچتے ہیں لیکن اس کے بچے کالج میں پڑھتے ہیں۔ تم جانتی ہو کالج کیا ہوتا ہے؟ وہاں لڑکے لڑکیاں چمڑے کا بیگ لے کر جاتے ہیں اور کالج کی چوکور ٹولی اوڑھتے ہیں۔ وہاں اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔'' میرے بھائی نے

MashalBooks.com

ہنستے ہوئے مجھے بتایا۔

اس طرح ماما کے بارے میں میرا شک ختم ہوا۔ مسٹر کم کے علاوہ ماما ڈسٹرکٹ سب ڈویژن کے بڑے افسر کی عزت بھی کرتی تھیں۔ وہ بجلی کے کھمبے کی طرح لمبا تھا۔ اس کا خاندانی نام بھی ماما کے ننھیال کے نام سے ملتا تھا۔ ننھیال کی طرف سے ان دونوں میں رشتے داری تھی لیکن وہ ایک دوسرے سے دور دور ہی رہتے تھے کیونکہ انہیں احساس تھا کہ وہ نچلے طبقے کے محلے میں رہتے ہیں۔ ایک بار ماما نے اسے محلے کے لوگوں سے ہنسی مذاق کرتے دیکھا تو اس کے بارے میں ان کا رویہ اور بھی بدل گیا۔

اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوگئیں۔ ماما نے رات والے بازار سے میرے لیے کپڑا خریدا۔ پھر وہ واشن ڈیپارٹمنٹ اسٹور گئیں اور وہاں ٹنگے ہوئے لباس اس طرح دیکھنے لگیں جیسے وہ خریدنا چاہتی ہوں۔ دراصل وہاں انہوں نے ان کپڑوں کے ڈیزائن دیکھے اور پھر اسی ڈیزائن کے میرے کپڑے سی دیے۔ وہ مجھے سیول کے بازار دکھانے لے گئیں اور ہم پہلی بار چڑیا گھر بھی گئے۔ اتنی جلدی ہی ان ساری چیزوں کو قبول کرنا میرے لیے مشکل تھا مگر ماما چاہتی تھیں کہ میں شہر کی ہر چیز دیکھ لوں۔

ماما چاہتی تھیں کہ میں میں ہیونجوڈونگ کی تہذیبی اور اخلاقی قدریں اپنے اندر محفوظ رکھوں کیونکہ ہمارا خاندان اسی علاقے سے تعلق رکھتا تھا لیکن جب ہم دوبارہ وہاں جانے لگ تو ماما نے مجھے زبردستی شہری لڑکی بنا کر وہاں پیش کرنے کی کوشش کی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ماما نے میرے لیے جو کپڑے بنائے ہیں انہیں میں پسند کروں یا نہ کروں انہوں نے کہا کہ میرے لیے جو لباس تیار کیا گیا ہے وہ بہترین ہے۔ انہوں نے سپر اسٹور کے لباس کی ہو بہو نقل کی تھی۔ آخر میں نے ان کی بات مان لی۔

دادا نے میرے کپڑے دیکھے تو بہت ناراض ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کپڑے پہن کر تم سرکس میں وائلن بجانے والی لڑکی لگتی ہو۔ اور وہ آخری دن تھا جب میں نے گاؤں میں وہ کپڑے پہنے پھر وہ کپڑے اس وقت پہنے جب ہم سیول واپس آ رہے تھے۔

سردیوں کی چھٹیوں میں ماما نے مجھے سیول کا اوربل فیشن ایبل علاقہ دکھایا۔ ان کے ایک رشتے دار نے انہیں اسکیٹ اور خرگوش کے بالوں کا مفلر دیا تھا۔ مجھے گلے میں مفلر ڈالنے پر کوئی

اعتراض نہیں تھا کیونکہ اس کے لیے کوئی محنت نہیں کرنا پڑتی تھی، بس اٹھایا اور گلے میں لپٹ لیا۔ لیکن پیروں میں اسکیٹ باندھنا دوسری بات تھی۔ ماما نے مجھ سے کہا کہ برف پر پھسلنے والی گاڑی کے بجائے پیروں میں اسکیٹ باندھو اور ان پر چلو۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی اسکیٹ نہیں پہنے تھے۔ ایک دو مرتبہ میں نے لوگوں کو اسکیٹ پر چلتے دیکھا تھا۔ وہ نظارہ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ میں سمجھتی کہ جوتوں میں لگے تیز دھار بلیڈ خود بخود ہی چلنے لگتے ہیں۔

دادا کے سامنے والے صحن کے پاس سبزیوں کا کھیت تھا۔ اس کھیت کے پار وہ سڑک تھی جو گاؤں سے باہر جاتی تھی۔ اس کے دوسری طرف دھان کے کھیت تھے۔ سردیوں میں دھان کے یہ کھیت برف میں جم جاتے اور وہ برف کا میدان بن جاتا۔ گاؤں کے بچے ان کھیتوں میں سلیڈ (برف پر پھسلنے والی گاڑی) پر پھسلتے پھرتے تھے۔ اور خوب شور مچاتے تھے۔ میں بھی چاہتی تھی کہ ان کے درمیان سراونچا کیے میں بھی اپنے اسکیٹس پر پھسلتی پھروں۔ لیکن میں بری طرح ناکام ہوگئی۔ کیونکہ میں ان اسکیٹس پر اپنا توازن ہی برقرار نہ رکھ سکی۔ اس سے بھی زیادہ تکلیف کی بات یہ ہوئی کہ میں گرنے لگی تو میری دونوں ٹانگیں چر گئیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ میں اس مضحکہ خیز حالت میں نیچے نہ گروں۔ تمام بچے میرا تماشہ دیکھنے میرے اردگرد جمع ہوگئے۔ آخر ایک آدمی نے مجھے بچایا۔ اس نے مجھے اپنی پیٹھ پر اٹھایا اور دادا کے گھر لے گیا۔

دادا نے میرے سر پر اپنا لمبا پائپ مارنا شروع کر دیا۔ اس کی چوٹ سے مجھے ایسا لگا جیسے میری آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے ہوں۔

''بیوقوف لڑکی۔ تجھے شہر اس لیے بھیجا تھا کہ تو وہاں کے طور طریقے سیکھے۔ تیری ماں نے بھی یہی وعدہ کیا تھا۔ مگر تو نے تو کچھ بھی نہیں سیکھا یہ تو دکمل کی پہاڑی پر چڑیلوں کا ناچ ہے۔ تجھے شہر اس لیے بھیجا تھا کہ خاندان کی بے عزتی کرائے؟''

میرا سر گھوم رہا تھا مگر جانے کیوں مجھے ہنسی آ گئی ہنسی اس لیے آئی تھی کہ دادا کی معلومات کتنی محدود ہیں۔ وہ میرے اسکیٹنگ کرنے کو چڑیلوں کا ناچ کہہ رہے تھے۔ دکمل پہاڑی پر جنرل یونگ چوائی کی یادگار ہے۔ اور وہاں چڑیلوں کا ناچ ایک مذاق بن گیا ہے۔

دادا کی پریشانی ٹھیک تھی۔ لیکن وہ تو کنویں کا مینڈک تھے انہیں بڑے سمندر کا کچھ بھی پتہ نہیں تھا۔ مجھے ان پر ترس آ گیا۔ میں نے تو شہر میں بہت کچھ سیکھ لیا تھا مگر دادا کے لیے باک جوک

MashalBooks.com

دادی ہی سب کچھ تھی۔ وہ ساری زندگی میں اسی جگہ رہے اور اسی قید میں وہ ختم ہو جائیں گے۔ مجھے اپنا یہ خیال اچھا نہیں لگا اور میں نے سوچا کہ شہر میں رہنے کی وجہ سے مجھے ایسے خیال آتے ہیں۔

سردیوں کی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ سیول جانے سے پہلے دادی نے تل لگی ہوئی جیلی تیار کی۔ یہ ان کی خاص پسندیدہ مٹھائی تھی۔ انہوں نے اسے اچھی طرح رنگین ڈبے میں رکھا اور مجھ سے کہا یہ اپنی استانی کو دے دینا۔ مگر میں نے استانی کو دینے کے بجائے وہ مٹھائی اپنی سہیلیوں کو کھلائی۔ یہ سہیلیاں میں نے ساج پارک آتے جاتے بنائی تھیں۔ ان کے ساتھ مل کر ہم نے بھی وہ مٹھائی کھائی۔

میں جانتی تھی کہ میری استانی تمام بچوں سے پیار کرتی ہیں۔ لیکن انہیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ ان کی جماعت میں ایک ایسی لڑکی بھی ہے جس نے کبھی ان کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ ان کی اس منافقت پر مجھے جو غصہ آتا تھا اس کا مزہ دادی کی مٹھائی سے زیادہ میٹھا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس غصے کا جو کڑوا مزہ میرے منہ میں آتا تھا وہ دادی کی مٹھائی سے زیادہ دیر تک رہتا تھا۔

جن دنوں ہم نے اپنی زندگی انوانگ پہاڑی تک محدود کر رکھی تھی ان دنوں ہمیں یہ یقین تھا کہ جیسے ہی میرا بھائی کامیابی حاصل کر لے گا ہم شہر کے اندر چلے جائیں گے۔ لیکن ہم دس سال اس پہاڑی کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکے۔ میرا بھائی اسکول سے فارغ ہو گیا اور اسے ایک بڑی فرم میں ملازمت مل گئی۔ وہ اب بھی ماما کا بہت ہی فرماں بردار بیٹا تھا۔ البتہ ابھی وہ اس قابل نہیں تھا کہ شہر کے اندر کوئی اچھا سا مکان خرید سکے اب ہماری زندگی میں اتنا فرق پڑ گیا تھا کہ ماما کو آمدنی کے لیے دوسروں کے کپڑے نہیں سینا پڑتے تھے۔

دوسری جنگ عظیم ختم ہو رہی تھی۔ ماما کو بار بار سونگلڈ وجانا پڑتا تھا تا کہ سیم کے بیجوں والے کیک کے علاوہ بھی ہمیں کچھ کھانے کو ملے۔ چاولوں کے لیے ریل گاڑیوں میں جانے والے مسافروں کے لوٹے جانے کی وارداتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ماما خالی ہاتھ گاؤں جاتیں اور اسی طرح واپس آتیں۔ لیکن گاؤں جاتے ہوئے وہ دبلی پتلی ہوتیں مگر وہاں سے لوٹ کر آتیں تو موٹی نظر آتیں۔ وہ عام طور پر رات کی گاڑی سے آتیں اور آدھی رات کو پہنچتیں۔ آتے ہی وہ بلیک آؤٹ والے آدھے سیاہ لیمپ کے پاس بیٹھ جاتیں اور اپنے جسم کے مختلف حصوں میں چھپے

ہوئے چاول کے کیک نکالنے لگتیں۔ یہ کیک ان کے پیٹ پر سینے پر اور کولہوں پر بندھے ہوتے تھے۔ میں نیند میں بھری آنکھوں سے انہیں بالٹی میں چاول ڈالتے دیکھتی تو اپنے دانت بھینچ لیتی۔ مجھے اتنا صدمہ ہوتا کہ دھڑکتا ہوا دل میرے حلق میں آ جاتا۔ ماما ہمارے لیے اسی طرح چاول لا کر بہت بڑا خطرہ مول لیتی تھیں۔ اس زمانے میں مجھے اس کہاوت کا پوری طرح احساس نہیں تھا کہ بھوک شریف سے شریف انسان کو بھی مجرم بنا دیتی ہے۔

یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ جاپانی پولیس موٹی عورت کے بھالا چبھو کر دیکھے گی۔ یہ افواہ بھی تھی کہ کسی پولیس والے نے ایک حاملہ عورت کے پیٹ میں چھرا مارا تھا۔ اور یہ سچی بات ہے کہ ہر ریلوے اسٹیشن پر پولیس والے ہوتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ایسے ڈنڈے ہوتے تھے جن کے سرے پر لوہے کی نوک ہوتی تھی۔ وہ اکثر ادھر ادھر دوڑ لگاتے جس سے مسافروں میں افراتفری پھیل جاتی۔ ان کے ڈنڈوں پر جو فولادی نوک ہوتی وہ اس سوئے کی طرح ہوتی جو چاول فروخت کرنے والے چاول کی بوری میں چبھو کر تھوڑے سے چاول نکالتے ہیں اور گاہک کو دکھاتے ہیں۔ یہ بہت ہی خطرناک چیز تھی اور اس کی وجہ سے طرح طرح کی افواہیں بھی پھیلتی تھیں۔

دادا کے گاؤں میں بھی سرکاری افسر اسی طرح کے ڈنڈے لے کر گھروں میں گھس جاتے تھے اور بوریوں میں چبھو کر دیکھتے تھے کہ کہیں کسی نے چاول چھپا کر تو نہیں رکھے ہیں۔ ماما ایسے کئی ہولناک واقعات بیان کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ کسی پولیس والے نے بھوسے کے ڈھیر میں اپنا بھالا مارا تو وہ خون میں بھیگ گیا ماما کہتی ہیں کہ اس بھوسے میں ایک آدمی چھپا ہوا تھا وہ آدمی فوج میں زبردستی بھرتی کیے جانے سے ڈرتا تھا۔ وہ بے چارہ اس طرح مارا گیا۔

جب جاپانیوں کو یہ احساس ہونے لگا کہ ان کی حکمرانی ختم ہونے والی ہے تو لوگوں میں اور بھی دہشت پھیل گئی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کل کیا ہوگا۔ بے یقینی کے ان دنوں میں مڈل اسکول میں تھی۔ اس وقت تک میں اس عمر سے گذر چکی تھی کہ کوڑھی بچوں کا جگر چیر کر کھا جاتے ہیں۔ اب یہ باتیں مجھے کہانی لگتی تھیں لیکن ہر وقت یہ خطرہ ضرور رہتا تھا کہ کہیں کوئی پولیس والا ماما کا پیٹ نہ پھاڑ دے۔

جنگ کے خاتمے کے زمانے میں جہاں مشکل حالات کا سامنا تھا وہاں ہر وقت یہ خطرہ بھی رہتا تھا کہ نوجوان لڑکیوں کو زبردستی جاپانی فوجیوں کی داشتائیں نہ بنا لیا جائے۔ اس زمانے میں

MashalBooks.com

نوجوان لڑکیاں پکڑ کر زبردستی انہیں جاپانی فوجیوں کی داشتہ بنایا جاتا تھا۔ میں نے اکثر راتوں کو اپنی ماما کو بھائی سے باتیں کرتے سنا کہ میری حفاظت کیسے کی جائے۔ میں یہ باتیں سنتی تو میرے اوپر مایوسی کے دورے پڑتے کہ آخر اس زندگی کا مقصد کیا ہے۔ ماما کی زندگی کی آخری خواہش یہ تھی کہ مجھے نئی عورت بنا کر الماری میں سجایا جائے۔ میرے بھائی کے ساتھ ان کی باتیں میری شادی کے بارے میں ہوتی تھیں۔ وہ روتی تھی کہ ابھی میری عمر شادی کی نہیں ہے مگر مجھے زبردستی فوجیوں کی داشتہ بنایا جاسکتا ہے۔ میرا کم گو بھائی انہیں تسلی دینے کی کوشش کرتا۔ نہیں ماما' ایسا نہیں ہوگا۔ ایسا نہیں ہوگا۔

ایک دن ہمیں ہیونجو دونگ چھوڑنا پڑا وہاں ماما نے اپنی ساری جمع پونجی لگا دی تھی۔ اس لیے نہیں کہ ہم ماما کی خواہش کے مطابق شہر کے اندر جا رہے تھے بلکہ اس لیے کہ جاپانیوں کو اپنی شکست کا یقین ہو گیا تھا اور گھبراہٹ میں انہوں نے سیول خالی کرنے کے لیے تمام لوگوں کو حکم دے دیا تھا۔ اب ہم گاؤں کی طرف بھاگ رہے تھے۔

گاؤں میں پناہ گزیں کی حیثیت سے رہتے ہوئے میں نے کوریا کو جاپان کی حکمرانی سے آزاد ہوتے دیکھا۔ اس کے بعد میرا بھائی ہم سے پہلے سیول واپس چلا گیا۔ اس عرصے میں اس نے کچھ رقم جمع کر لی تھی۔ اس نے شہر کے دروازے کے اندر ایک اچھا سا مکان خرید لیا۔ اس کے بعد ہمارے حالات اچھے ہو گئے اور ہم آرام کی زندگی گذارنے لگے۔ پھر ہم نے کئی مکان بدلے اور ہر بار پہلے سے اچھے مکان میں گئے۔

لیکن ہم ہیونجو دونگ والا مکان کبھی نہیں بھولے جس کے سامنے برائے نام ہی صحن تھا۔ ماما کے لیے خاص طور سے وہ مکان بہت ہی یادگار تھا۔ جوں جوں ان کی عمر بڑھتی جاتی وہ ہر چیز کا موازنہ ہیونجو دونگ سے ہی کرتیں۔

''بیٹے' تمہارا کیا خیال ہے۔ ہم ان دنوں سے زیادہ آرام سے نہیں ہیں جب ہم ہیونجو دونگ میں رہتے تھے؟'' وہ کہتیں انہیں اپنا پرانا محلّہ یاد آتا اور وہ بھائی کو سمجھاتیں۔'' اس زمانے کی غریبی یاد کر کے اب تم اپنی دولت نہ لٹاؤ۔'' لیکن اس کے ساتھ ہی کہتیں ''ہم نے اپنی زندگی کا بہترین زمانہ وہاں گذارا۔ وہ مجھے بہت یاد آتا ہے۔'' یا پھر کہتیں۔'' ہمارے پڑوسی اچھے نہیں تھے وہ بہت ہی غریب اور گنوار تھے۔'' وہ ان لوگوں کو بہت برا سمجھتی تھیں۔ لیکن اب ایک

زمانہ گذرنے کے بعد وہ ان کے بارے میں سوچتی تھیں۔

حیرت کی بات تھی کہ ماما ان دنوں کو یاد کرتی تھیں جب انہوں نے انتہائی مشکل حالات میں ہمیں پالا پوسا تھا اور اپنا جاگیردارانہ مزاج تک قربان کر دیا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے ہمسائیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھیں اور انہیں اپنے آپ سے کمتر ہی کہا کرتی تھیں۔ انہیں حقیر کہہ کر اپنی عزت بڑھاتی تھیں۔

ماما کو وہ پرانے دن تو بہت یاد آتے تھے لیکن عمر بڑھنے کے ساتھ انہیں بھول جانے کی عادت بھی پڑ گئی تھی۔ انہیں یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ اپنا پرس کہاں رکھ کے بھول گئی ہیں۔ مجھے اور میرے بھائی کو یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا۔ مجھے خیال آتا تھا کہ انہوں نے جو کھویا ہے وہ ان کی بنیاد ہے۔ ان کی جڑیں ہیونجو دونگ کے صحن میں گڑی ہوئی تھیں باک چوک وادی میں نہیں۔

ماما بار بار ہمیں یاد دلاتیں کہ پرانے زمانے کے مقابلے میں اب ہم کتنے خوش حال ہیں۔ میں جانتی تھی کہ ماما کے دل میں اس علاقے کی یادیں جو اتنی گہری ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں انہوں نے بہت کچھ داؤ پر لگا رکھا تھا۔ یادوں کی دوڑ نے انہیں اس گھر اور اس علاقے سے باندھ رکھا تھا۔ اگر انہوں نے وہ ڈور توڑ دی ہوتی تو کبھی نئے اور پرانے زمانے کا موازنہ کرتیں۔ نئے اور پرانے زمانے کا مقابلہ کرنا ایسا ہی تھا جیسے رسی کی لمبائی ناپی جائے اور کھونٹے سے بندھا ہوا اس کا سرا کھول دیا جائے۔

جاپانی قبضے سے آزادی کے بعد سیول مین جو تبدیلیاں ہوئیں انہیں زبردست اور حیرت انگیز ہی کہا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود ہیونجو دونگ' جہاں پہلے ہم رہتے تھے' اسی طرح رہا اور مجھے اس پر حیرت بھی نہیں ہوئی۔ وہاں ماما نے جس طرح اپنی زندگی شروع کی تھی اس کی وجہ سے وہ ہمارے لیے یادگار بن گیا تھا۔ اور کسی بھی یادگار کے لیے یہ قدرتی بات ہے کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہو بلکہ اس پر کائی لگ جائے اور وہ ٹوٹنے پھوٹنے لگے۔

چند مہینے پہلے میں ٹیکسی میں اپنے دوستوں کے ساتھ یونگ چن سے گذری۔ وہاں سے گذرتے ہوئے میں نے حسب معمول بڑے چاؤ کے ساتھ ہیونجو دونگ کی دیکھا۔ اور مجھے بہت کچھ یاد آ گیا۔ اس دن میں نے ادھر دیکھا تو میرا دل بیٹھنے لگا۔ وہاں کافی تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ جہاں میں رہتی تھی وہاں نئے مکان بن رہے تھے۔ یہاں سے وہاں تک نئے مکانوں کی قطار ہی

MashalBooks.com

قطار تھی۔ اصل میں یہ علاقہ کافی عرصے سے نہیں بدلا تھا گاؤں سے آنے والے کسی دیہاتی کے لیے بھی جو چالیس سال پہلے یہاں آیا ہو یہ علاقہ بہت ہی بری حالت میں تھا۔ یہاں بہت ہی گنجان آبادی تھی۔ اب وہاں تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ تبدیلیاں دیکھ کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میری آخری چیز مجھ سے چھن گئی ہو۔

اس دن اپنے گھر واپس آتے ہوئے میں نے یونگ چن کے پرانے دوستوں کو چھوڑا اور اپنے پرانے محلے کی طرف چل دی۔ سڑک کافی بدل گئی تھی۔ سرخ اینٹوں والی عمارت جیسے ''دھاسن اسکول'' کہا جاتا تھا ابھی تک موجود تھی۔ اس کی شکل صورت بھی ویسی ہی تھی۔ اس کی وجہ سے مجھے اپنا راستہ تلاش کرنے میں آسانی ہوگئی۔ جس مکان میں ہم رہتے تھے اس کے آس پاس اونچے اونچے مکان بن گئے تھے جن کی وجہ سے وانگ پہاڑی چھپ گئی تھی۔ پرانی یادوں سے میرا دل بھر آیا اور میں بلا مقصد گلیوں میں گھومنے لگی۔

آخر کار ماما نے یہاں جو کچھ داؤ پر لگایا تھا وہ سب ختم ہو گیا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کتنے ہی زمانے گذر گئے ہوں۔

جی چاہا کہ میں ان سڑکوں پر پھر چلوں جن پر چل کر بچپن میں اسکول جاتی تھی میرے لیے تو یہ اسکول جانے کا راستہ تھا مگر ماما اسے قلعے کی وہ دیوار سمجھتی تھیں جو بیرونی شہر اور اندرونی شہر کو تقسیم کرتی تھی۔ وہ پہاڑی ابھی تک شہر کے وسط میں ایک سرسبز جگہ تھی۔ کسی زمانے میں جب میں ہیونجو دونگ سے باہر نکلی تھی تو ایک دیوار نے میرا راستہ روک لیا تھا۔ اب جو نئی دیوار بنی تھی وہ وانگ پہاڑی سے ملتی تھی اور شہر کے مغربی دروازے تک جاتی تھی۔ دیوار میں ایک طرف دروازہ تھا۔

میں نے پہلی بار وہ چیز دیکھی جو ماما سوچتی تھیں' اور جس سے شہر کے اندر اور باہر کا فرق نظر آتا تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اسے دیکھوں گی۔ دروازے کے اندر جانے والی سمت میں خاردار تار کی باڑھ لگا دی گئی تھی اور پرانی سڑک غائب ہوگئی تھی۔ اس کے بجائے وہاں ہرے ہرے پیٹر لگا دیے گئے تھے تا کہ کوئی اندر نہ جا سکے۔ وہاں ''داخلہ منع ہے'' کا بورڈ تو نظر نہیں آ رہا تھا مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ ممنوعہ علاقہ ہے۔ کوڑھیوں کی جھونپڑیوں سے زیادہ الٹی سیدھی جھاڑیاں دیکھ کر میں نے سوچا کہ یہ ''غیر فوجی علاقہ'' ہوگا ایسا علاقہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

میں نے پہاڑی پر چڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور ساجک سرنگ کی طرف نیچے اترنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ نئی تعمیر کی ہوئی دیوار کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔

میرے جوتوں میں ریت بھر گئی تھی۔ میں نے جوتے اتار کر انہیں جھاڑا۔ ماما نے ایک ایسی بنجر اور سخت جگہ پر اپنے خوابوں کی بنیاد رکھی تھی جہاں ریت کا ایک ذرہ بھی نہیں سما سکتا تھا۔ انہوں نے کتنے چاؤ سے مجھے نئی عورت بنانے کی کوشش کی تھی۔ اور میں نہایت نستعلیق اور فیشن ایبل عورت بن گئی۔ لیکن میں وہ نئی عورت نہ بن سکی جو ماما چاہتی تھیں۔ پرانے زمانے میں ماما کا یہ خیال بہت ہی جرائت مندانہ تھا۔ آج بھی وہ اتنا آسان خیال نہیں ہے۔ یہ ان کی ضد تھی۔ وہ مجھ سے کہتی تھیں کہ شہر کی عام باتوں پر کبھی دھیان نہ دو۔ اور جب میں گاؤں جاتی تو مجھ سے کہتیں کہ وہاں تم شہر کی لڑکیوں کی نقل کرو۔

ایک طرف تو وہ چاہتی تھیں کہ میں قدیم خاندانی روایات پر چلوں دوسری طرف وہ مجھے نئے زمانے کی عورت بنانا چاہتی تھیں ان دونوں میں جو تضاد تھا وہ میری شخصیت کا حصہ بن گیا۔ اور یہ ہمیشہ میرے شعور پر چھایا رہا۔ آج بھی وہ میرے دماغ پر سوار ہے۔ اگر چہ محسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ بہت پرانے زمانے کی بات ہے لیکن لگتا یہ ہے کہ میں ابھی تک اس رسی سے بندھی ہوئی ہوں جو کھونٹے سے کھول دی گئی ہے۔

جس جگہ نئی بنائی ہوئی دیوار سڑک سے مل جاتی ہے وہاں میں اس سے الگ ہوگئی۔ سڑک کے پار جا کر دیوار پھر مل جاتی ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا ایسا لگا جیسے یہ کسی نو دولیتے کے گھر کے گرد بنائی ہوئی باڑھ ہے۔ ''وہ بڑا پتھر کہاں ہے جہاں الٹا کر میرے بھائی نے میرے چھڑی ماری تھی؟''

میں نے وہ واقعہ یاد کرتے ہوئے سوچا۔

میں آج بھی ''نئی عورت'' کے تصور کے ساتھ چمٹی ہوئی ہوں۔ آج کے زمانے میں یہ بالکل ہی بے معنی بات ہے دیوار اور نئی عورت کا تصور بیک وقت پرانا بھی ہے اور نیا بھی' مگر میں اس تصور کو نئی زندگی نہیں دینا چاہتی۔ اور نہ اسے کوئی معنی دینا چاہتی ہوں۔ لیکن یہ بھی چاہتی ہوں کہ گذرے دنوں سے انکار بھی نہیں کرنا چاہیے۔

Masha Books.com

ماما کی بازی

دوسرا حصہ

میرے گھر میں چھوٹا بڑا جو بھی حادثہ ہوا وہ میری غیر موجودگی میں ہوا۔ میں جب بھی کسی تفریحی سفر سے واپس آتی تو ایسا کوئی نہ کوئی واقعہ میرے انتظار میں ہوتا۔ جب میرا جسم اور میرا دماغ گھر سے باہر کہیں اور ہوتا' اور جب میں گھر کی فکر سے آزاد ہوتی تو کوئی نہ کوئی حادثہ ہو جاتا۔

ایسا ہی ایک حادثہ اس وقت ہوا جب میں نے اپنے پہلے بچے کا دودھ چھڑایا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں بچے کی پیدائش اور اسے دودھ پلانے سے آزاد ہوئی تھی۔ اس آزادی کے احساس کے ساتھ ہی اپنے دوستوں کے ساتھ وقت گذارنے لگی۔ اس وقت تک مجھے تفریح کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ میرا سارا وقت بچے کی دیکھ بھال اور شوہر کے ماں باپ کی خدمت میں گذرتا تھا۔

اب میں کرسی پر بیٹھ گئی اور ''ہوا تو'' کھیل میں مگن ہو گئی۔ مجھے اپنے اردگرد کا کوئی ہوش نہیں تھا' میں جیت رہی تھی اور میری ساری توجہ کھیل کی طرف ہی تھی۔ ''دیکھو تو ...'' مجھے کسی کی آواز آئی۔ ''اتنی رات ہو گئی ہے اب یہ گھر جائے گی تو اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔ کیا اس کی ساس اس کے ساتھ نہیں رہتی؟'' اس آواز نے مجھے چونکا دیا۔

لیکن میں اتنی احمق بھی نہیں تھی کہ ساس کی خفگی سے پریشان ہو جاتی۔ وہ اس بات پر ناک بھوں ضرور چڑھائیں گی کہ مجھے دوستوں میں وقت گذرنے کا خیال ہی نہیں رہا مگر مجھے اس کی فکر نہیں تھی۔ اپنی نئی آزادی کے احساس میں ایسی کھوئی ہوئی تھی کہ گھر کی فکر ہی نہیں تھی مجھے خود بھی اس پر حیرت تھی۔

پہلے بچے کی پیدائش زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ اس کے بعد آنے والے بچے آسانی سے پل جاتے ہیں۔ پہلی میری بیٹی تھی اس پر میں نے اپنی پوری توجہ صرف کی تھی۔ رات کو سوتے میں بھی اس کا خیال رہتا تھا۔

میں اپنی آزادی کی وجہ سے ''ہوا تو'' کے کھیل میں مگن نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ ہوا تو کھیل تھا جس نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ میں اپنا خاندان بھی بھول گئی تھی۔ اچانک میں خیالوں میں کھو گئی۔

''یہ کوئی پراسرار جال ہے جو مجھے تاش کے اس کھیل میں پھنساتا چلا جا رہا ہے۔ یہ کوئی خفیہ ہاتھ ہے جو جوئے کی طرف مجھے دھکیل رہا ہے؟''

میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ یہ فضول خیال ہے لیکن میرے دل پر بوجھ تھا۔ اس بوجھ کو دل پر سے ہٹانے کے لیے میں اپنی جیتی ہوئی رقم کا حساب لگانا شروع کیا۔ میں نے کافی رقم جیت لی تھی۔ میں نے حساب لگایا کہ اس سے میں کھانے پینے کی کافی چیزیں خرید سکتی ہوں۔ اس خیال سے مجھے تسلی ہو گئی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ اس وقت میرے دل میں جو بے اطمینانی کی کیفیت تھی وہ غلط نہیں تھی جس وقت میں تاش کھیل رہی تھی اس وقت گھٹنوں چلنے والی میری بچی کھولتے پانی سے بھری کیتلی کے پاس گئی تھی اور اس نے اپنے پاؤں پر وہ پانی گرا لیا تھا وہ بری طرح جل گئی تھی وہ اسے فوراً ہسپتال لے گئے تھے۔ میں بھاگی بھاگی ایمرجنسی وارڈ پہنچی۔ ڈاکٹر اسے دوائیں لگا رہے تھے۔ اس کی چیخیں سن کر میرا دل ٹوٹ گیا۔ میری سانس رک رہی تھیں۔ مجھے دیکھا تو انہوں نے اپنی صفائیاں پیش کرنا شروع کر دیں کہ انہوں نے دیکھا ہی نہیں کہ وہ بچی کب ادھر چلی گئی۔ میں تو ڈر رہی تھی کہ وہ میرے گھر سے غائب رہنے پر مجھے برا بھلا کہیں گی مگر وہ اپنی صفائیاں ہی دیتی رہیں۔

یہ تو اچانک ہی ہو گیا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی میں نے دو انڈے ابالنے رکھے تھے۔ ایک اپنے لیے اور ایک اس کے لیے۔ میں نے کیتلی میز پر رکھی اور نمک لینے کے لیے پیٹھ موڑی ہی تھی کہ یہ .... ''انہوں نے جملہ مکمل نہیں کیا اور ننھی لڑکی کی طرح ہونٹ سکیڑ کر رونا شروع کر دیا۔

''یہ میری غلطی ہے۔'' میں نے کانپتی آواز میں کہا۔

MashalBooks.com

''لوگ سچ کہتے ہیں۔ بچے کی دیکھ بھال بہت ہی مشکل کام ہے۔'' انہوں نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

میں نے کچھ نہیں کہا تو بولے ہی چلی گئیں۔

''ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اگر انفیکشن یہ ہوا تو زخم جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کی جلد میری طرح ہے اس لیے میرا خیال ہے انفیکشن نہیں ہوگا۔ میں چھوٹی تھی تو میں نے بھی کھولتے سوپ کا پیالہ اپنے بائیں پاؤں پر گرا لیا تھا۔ میں بری طرح جل گئی تھی۔ مجھے بتایا تھا کہ میرے موزے اتارے گئے تو اس کے ساتھ ہی میری کھال بھی اتر آئی تھی۔ اس زمانے میں جلنے کی کوئی دوا نہیں ملتی تھی۔ اس لیے سویا سوس لگائی گئی تھی۔ یہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ میرے پاؤں پر سویا سوس لگایا جاتا رہا اور میرا پاؤں ایسا ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ میں تمہیں بتاؤں میری طرح کی کھال ہونا بہت اچھی بات ہے آج تو ہر قسم کی دوائیں مل جاتی ہیں۔ نرس نے انجکشن لگا دیا ہے۔'' میری ساس ٹوٹے پھوٹے جملوں میں بول رہی تھیں۔ ان کی نظریں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ ان کی یہ چیڑ پیڑ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

میں نے اپنی بچی کو دیکھا تو ان کے الفاظ بے معنی معلوم ہوئے۔ میری بچی جو تکلیف سہہ رہی تھی ایسے وہ خود ہی جانتی تھی۔ ہمارے وہاں موجود ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں اس خیال سے پاگل ہوئی جا رہی تھی کہ وہ بچی جو اذیت برداشت کر رہی ہے اس کے ذرا سے حصے میں بھی میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتی حالانکہ وہ میری وجہ سے ہی اس دنیا میں آئی ہے۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ وہ اتنی شدید تکلیف برداشت کر رہی ہے۔ میں جو اس کے وجود کی ذمہ دار ہوں' کچھ بھی نہیں کر سکتی۔

میری بچی بہت چھوٹی ہے' وہ یہ نہیں سمجھ سکتی کہ ہم میں سے ہر شخص دوسروں کے لیے اجنبی ہے' اس لیے وہ تنہا ہے تاش کھیلتے ہوئے مجھے بے چینی کا جو احساس ہوا تھا اب اس کا مطلب میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ میں مزے سے بیٹھی جوا کھیل رہی تھی اور یہاں یہ حادثہ ہو گیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ بے چینی اور بے اطمینانی کا احساس ایک طرح سے میرے لیے انتباہ تھا جو کسی پراسرا طاقت کی طرف سے کیا گیا تھا۔ ایسی طاقت جو میرے اور میری بچی کے درمیان موجود تھی۔ اگر اس وقت مجھے اس کا احساس ہو جاتا تو میری بچی کو یہ وقت نہ دیکھنا پڑتا۔ میں اپنی غلطی پر بہت

شرمندہ تھی۔ اور میں نے عہد کیا کہ آئندہ ایسی حماقت نہیں کروں گی۔ میری بچی کے زخم اچھے ہونے لگے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ اس کی وجہ میری ساس کی طرح کی جلد تھی یا زود اثر دوائیں جلنے کے زخم ایسے ختم ہوئے کہ اس کے پاؤں پر کوئی نشان تک نہیں رہا۔ اس کے بعد میرے ہر سال بچہ ہوا۔ اور میرے پانچ بچے ہو گئے۔ اس عرصے میں میرے بچوں کو جلنے کے علاوہ اور بھی کئی بیماریاں ہوئیں۔ ہڈیاں ٹوٹیں' اوپر سے گرنے سے چوٹیں لگیں' ٹریفک کے حادثے ہوئے' دواؤں سے زہر پھیلا' اور اتنی بے شمار بیماریاں ہوئیں کہ میرا دماغ بھنا گیا۔ پہلے حادثے کی طرح دوسرے حادثے بھی اس وقت ہوئے جب میں گھر میں نہیں ہوتی تھی۔

اب چونکہ اتنے حادثے ہوتے تھے اس لیے میں نے اپنے دل کے انتباہ پر کان دھرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ میرے اندر جرم کا احساس بھی کمزور پڑ گیا تھا۔ البتہ بعد میں میں نے اندازہ لگایا کہ جب بھی کوئی حادثہ ہوتا تھا تو اس سے پہلے ہی میرے دل میں کھد بد شروع ہو جاتی تھی۔ جیسے مجھے انتباہ کیا جا رہا ہو۔ میں نے سوچا کہ یہ حادثے میرے دل میں بے چینی پیدا ہونے کے بعد ہی کیوں ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی میں نے سوچا کہ ہر ایسا حادثہ اس وقت ہی ہوتا ہے جب میں گھر میں نہیں ہوتی۔ لیکن ایسے حادثے جن کا تعلق میری ذات یا میرے بچوں سے نہیں ہوتا وہ بھی میرے پیچھے ہی ہوتے ہیں جیسے میری ساس کا گرنا' بوا مکر کا پھٹنا' چوری ہونا وغیرہ۔ اس کی وجہ ایسی پراسرار بھی نہیں تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ہر حادثہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ جب گھر کی نگرانی کرنے والا موجود نہیں ہوتا۔

یہ ہولناک احساس اس پراسرار شتے کے لیے بے معنی ہے جو خونی رشتوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اصل میں تو اس کا تعلق میری بے فکری سے تھا۔ میرے گھر سے بے نیاز ہو جانے کا مطلب یہ تھا کہ میں اپنے ذاتی عیش و آرام میں کھو گئی ہوں۔ جب میں اپنی خود غرضی کی کیفیت سے نکلتی ہوں تو مجھے جرم کا احساس ہوتا ہے اور اس نے مجھے بُرے برے خیال آتے ہیں جسے میں انتباہ سمجھتی ہوں۔ پھر میں نے سوچا کہ عورتوں کا ایک خاص مقام ہے جس کی وجہ سے وہ پرستش کے قابل ہوتی ہیں' سارے گھر کی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر ہوتی ہے۔ ان تمام حادثوں کی ذمہ داری میں اپنے اوپر نہیں ڈالتی کہ میرے احساس جرم میں اور اضافہ ہو۔ بلکہ میں نے سوچا کہ آنے والے واقعات کا احساس مجھے اس لیے ہو جاتا ہے کہ کسی آفاقی طاقت اور میرے اندرونی وجود

MashalBooks.com

کے درمیان کوئی تعلق ہے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا تو تمام خوفناک احساسات غائب ہو گئے۔

اصل میں ان احساسات کے ختم ہونے کی وجہ بہت سادہ سی تھی۔ کچھ دن پہلے میری ساس کا انتقال ہو گیا۔ میں اور میرے شوہر ایک ایسے فلیٹ میں چلے گئے جسے دیکھ کر خیال آتا تھا کہ یہ انسانوں کے رہنے کے لیے نہیں بنایا گیا ہے۔ اسی لیے میں اپنا فلیٹ یونہی چھوڑ کر چلی جاتی تھی۔ اور یہ میرا روزانہ کا معمول بن گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں کوئی حادثہ پیش نہیں آئے گا۔ میرے خاندان کے ساتھ پیش آنے والے حادثات کا زمانہ گذر چکا ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ جب میرے خوف ناک احساسات اور آنے والے حادثات کا ڈر ختم ہو گیا تو میرا جی چاہنے لگا کہ وہ احساسات پھر پیدا ہوں۔ بلکہ مسلسل مجھے ایسا محسوس ہوتا رہے۔ یہ احساس کوئی معمولی جذباتی ابال نہیں ہوتا تھا جو میرے گھر سے باہر رہنے پر پیدا ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ اس وقت پیدا ہوتا تھا جب میرا جسم اور میرا دل دونوں گھر سے باہر ہوتے تھے۔ یہ مسئلہ جسمانی طور پر گھر چھوڑنے کا نہیں تھا بلکہ ذہنی طور پر بھی چھوڑنے کا تھا۔ افسوس میں ایسی عورت تھی جو ماں اور بچوں دونوں کے فرائض ادا کر رہی تھی۔ ایسی عورت اپنے گھر اور اس کے اندر ہونے والے واقعات سے پوری طرح اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکتی۔

میں نے اپنا توہم خود پیدا کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان تمام حادثات کا سبب یہ ہے کہ میں گھر سے چلی جاتی ہوں۔ گھر کی پرواہ نہیں کرتی۔ اپنے اس جرم کا بوجھ دور کرنے کے لیے میں گھر کے لیے زیادہ پریشان رہنے لگی تھی۔ میں جان بوجھ کر گھر کے بارے میں بہت فکر کرتی تھی مگر کبھی کبھی اسے بالکل ہی بھول جاتی تھی۔ اور سیر و تفریح میں کھو جاتی تھی۔ پھر جب میں ہوش میں آتی تو جرم کا احساس ہوتا۔

میری گھریلو زندگی کا نیا انداز بالکل ہی الٹا سیدھا اور اکتا دینے والا تھا۔ اب میں گھر کی مالکن تھی اور وہ جو خوفناک احساس تھا اس کی وجہ سے مجھے اپنے خاندان کی پرانی زندگی خوبصورت لگنے لگی تھی۔ میرا دل زور زور سے ایسے دھڑکنے لگتا جیسے میں ایک خوفزدہ ایکٹریس ہوں اور لوگوں کے سامنے پہلی بار اسٹیج پر کھڑی ہوں۔ پھر میں ایک نئی توانائی کے ساتھ گھر کے کام کاج میں لگ جاتی۔ خوف کا احساس عارضی سا ہوتا۔ اور میرے اندر پھر نئی امیدیں جنم لینے لگتیں۔ یہ عجیب و غریب سی الجھن تھی۔

''تم میرے بغیر کیا کرو گے؟ گھر کا کون خیال رکھے گا؟'' تین چار دن بعد جب میں کہیں باہر سے گھر آتی تو شکایت کرتی۔ اور اسی غصے میں گھر کی صفائی کرتی اور زور زور سے جھاڑو دیتی۔ شاید اس وقت میں اپنی نوجوانی کے دنوں کے رومان میں پھنسی ہوتی تھی۔ گھر کا یہ حال ہوتا کہ ٹی وی پر گرد کی چادر کمرے کے کونے میں گندے موزے پڑے ہوئے اور اسی قسم کی چیزیں میرا استقبال کرتی تھیں۔ ان معمولی معمولی باتوں پر بھی میں پریشان ہو جاتی تھی۔

اپنے یہ جذبات چھپانے اور غصے کی شدت کم کرنے کے لیے میں ایسی باتیں کرتی تھی۔'' میرے بغیر یہ کیا کریں گے؟'' اس پر میرے بچے مجھے حیرت سے دیکھتے۔ ''تم بالکل ہی بے کار ہو ماما'' وہ خاموشی سے ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرتے رہے پھر کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

میں کہتی رہتی تھی کہ میں اس زندگی سے تنگ آ گئی ہوں اور عیش و آرام کی زندگی گذارنا چاہتی ہوں۔ اور یہ بھی کہتی رہتی تھی کہ ''میرے بغیر تم کیا کرو گے۔'' لیکن میرا دل ہی جانتا تھا کہ میں عمر بھر اپنے خاندان کی دیکھ بھال ہی کرنا چاہتی تھی۔

میں نے ایک دن ایک دوست کے فارم ہاؤس پر گذارا۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں برف پڑنا شروع ہو گئی تھی۔ اس گھر کے باہر جو اونچے اونچے پیڑ کھڑے تھے اور جہاں ہمارا تفریح کرنے کا ارادہ تھا' ان پیڑوں کا رنگ بدل چکا تھا۔ تیسرے پہر تک برف باری طوفان کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ برف نے پیڑوں کی قطاروں کی شکل کو مشرقی پینٹنگ میں بدل دیا۔ وہ نرم نرم اور گرم گرم معلوم ہو رہے تھے۔ پھولوں سے بھرے پیڑوں کی شاخیں برف کے بوجھ سے جھک گئی تھیں اور ایسے چرچرا رہی تھیں جیسے سانس لینے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کچھ شاخیں ٹوٹ بھی رہی تھیں۔

گھر کے اندر آتش دان میں چیڑ کی سوکھی لکڑیاں جل رہی تھیں جن سے پورا گھر گرم اور آرام دہ ہو گیا تھا۔ کھڑکی سے باہر لان میں چیر کے پیڑ برف کی چادر میں ڈھک گئے تھے۔ اور پورا منظر ایسا مسحور کن ہو گیا تھا کہ میں اس میں کھو گئی۔ حیرت انگیز منظر تھا۔

میری دوست سیول سے باہر رہتی تھی۔ لیکن یہ علاقہ شہر سے اتنا قریب تھا کہ اس کا شوہر روزانہ اپنی کار پر شہر جاتا تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ شہر سے اتنا نزدیک ایسا حسین منظر بھی

MashalBooks.com

ہوسکتا ہے۔

پچھلی بہار میں' جب چیری کے پھولوں کی میٹھی میٹھی خوشبو سے ساری فضا معطر ہورہی تھی تو میری دوست نے مجھے اور چند دوسری سہیلیوں کو اپنے فارم ہاؤس پر مدعو کیا۔ گھر کے سامنے کا حصہ اور پیٹروں کے ساتھ کھلی جگہ ہماری کاروں سے بھر گئی تھی۔ چیری کے پیڑ پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ ہر طرف بچوں کے ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ بچے اپنی ماؤں کے ساتھ آئے تھے۔ اس فارم ہاؤس میں تمام شہری سہولتیں موجود تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ فارم ہاؤس سیاحوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ مجھے لگا کہ میں اس فارم ہاؤس کے دو مختلف چہروں پر فریفتہ ہوگئی ہوں۔ ایک موسم بہار کا چہرہ اور دوسرا سردیوں کا حیرت انگیز چہرہ۔ ہر موسم نے مجھے اپنا الگ ہی رنگ دکھایا۔ چونکہ میری سہیلی کا فارم ہاؤس میرے لیے ایک فارم ہاؤس نہیں تھا اس لیے اس کے فاصلے بھی مختلف تھے۔ جیسے تاریخ کی کتابوں میں کسی بزرگ کا چیلا جنگ سے بھاگ کر' صعوبتیں اٹھاتا ہوا کیر دیونگ پہاڑی پر پہنچ گیا تھا اسی طرح میں بھی میٹھی اور پرسکون تھکن سے چور ہوگئی تھی۔

چیڑ کی جلتی ہوئی شاخوں کی چرچر سے مجھے خیال آیا کہ یہ شاخیں مسحور کن آواز کی موسیقی کے ذریعہ اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار کرنا جانتی ہیں۔ کھڑکیوں کے باریک پردے ہوا میں رقص کررہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے پورا کمرہ ہوا میں تیر رہا ہے۔ اگر کمرہ اڑ کر کہیں اور چلا جائے تو ہمیں حیرت نہیں ہوگی۔ میں خود بھی ہوا میں جھوم رہی تھی۔ برف نے صرف قدموں کے نشان ہی نہیں مٹائے تھے بلکہ اس نے انسان کا ہر نشان مٹا دیا تھا اور دنیا اپنی تخلیق کے آغاز میں پہنچ گئی تھی۔

میری دوست پورے چاند کی شکل کی صراحی لے کر آئی۔ شیشے کی یہ صراحی سرخ شراب سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے وہ شراب کے گلاسوں میں ڈالی۔

''چکھ کر دیکھو' اس نے کہا'' یہ چیری کی شراب ہے'' شراب بہت مزیدار تھی' سرخ شفاف یاقوت کی طرح۔

''تم جانتی ہو' مجھے کاشت کاری کا بہت شوق ہے۔'' میری دوست نے بتایا'' پہلے میں چیری کے پیڑ کو محض پیڑ ہی سمجھتی تھی۔ مگر یہ غلط تھا۔ وہ تو بہت ہی کام کی چیز ہیں۔ ان سے تو ٹوکریاں بھر بھر کے پھل ملتے ہیں۔ نوکروں کے بچے خوب کھاتے رہتے ہیں وہ پھل میں اپنے دوستوں اور شوہر کے رشتے داروں کو بھی بھیجتی رہتی ہوں۔ جو دوست یہاں آتے ہیں میں انہیں گھر لے جانے

کے لیے بھی کچھ پھل دے دیتی ہوں۔ اوہو' میں اپنے پھلوں کے بارے میں بہت بک بک کرتی ہوں۔ سیول میں میرے پاس چھوٹی بوتلیں تھیں' اب میں بڑے مرتبان استعمال کرتی ہوں اب میں بڑے مرتبانوں میں شراب تیار کرتی ہوں۔ ان مرتبانوں کو زمین میں گاڑ دیتی ہوں۔ میرے پاس بہت شراب ہے خوب جی بھر کر پیو۔''

''مجھے تم شراب کی دیوی نہ سمجھو۔'' میں نے چوٹ کی میں مزے لے لے کر چسکیاں لے رہی تھی۔

بہار سے سردیوں تک' چیری کے پھولوں سے برف کے پھولوں تک چیری کا پیڑ اتنے پھل دیتا ہے کہ تین سے پانچ تک بڑے بڑے ٹوکرے بھر جاتے ہیں اور آخر کار وہ پھل زبردست شراب کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ میرا ذہن پیٹر کے اس زمانے کی طرف چلا گیا جب وہ پھلوں کا بوجھ برداشت کرتا ہے' اس پر پھلوں کا کمبل سا چڑھ جاتا ہے۔ میں پیٹر کی اس خوبی کی تعریف کرنا چاہتی تھی۔

''یہ جو کاشت کاری ہے نا ... یہ بہت ہی آسان ... میری دوست ایک بار پھر اپنی کاشت کاری کے تجربے پر تقریر کررہی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اس نے ہمیں چیری کے پھولوں کے موسم میں اس لیے بلایا ہے تاکہ وہ اپنی عیاشی والی زندگی کے بارے میں شیخیاں مارے۔ یہ سوچ کر میرا جی خراب ہوگیا۔

''تم کیا کافی عرصے سے کاشت کاری کررہی ہوں جو اتنی شیخیاں ماررہی ہوں؟'' میں نے پوچھا'' مجھے تو تمہارے اوپر رشک آرہا ہے یہ باتیں تمہیں اس وقت کرنا چاہیے تھیں جب اچھے اور برے دونوں حالات سے گذر چکی ہوتیں۔ اس وقت تو تمہاری باتیں مجھے کچھ اچھی نہیں لگ رہی ہیں۔ تم جانتی ہو نا کہ میں جس گھر میں رہتی ہوں وہ مرغیوں کا ڈربہ ہے ...''

''ہمیں یہاں آئے ایک سال سے بھی کم ہوا ہے۔ لیکن تم یہ کیوں سوچتی ہو کہ اگر ہم یہاں زیادہ عرصے رہے تو ہمارے حالات اچھے نہیں رہیں گے؟'' میری دوست نے میری بات کاٹی۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میری دوست اور اس کا شوہر زمین کے مالک تھے۔ زمین پر کام کرنے والے لوگ کھیت مزدور تھے۔ ان مزدوروں کو زمین کی آمدنی سے کوئی غرض نہیں تھی اس نے بتایا کہ یہ مزدور ان کسانوں سے مختلف ہوتے ہیں جو ٹھیکے پر زمین لے کر کاشت کاری کرتے

MashalBooks.com

ہیں۔میری دوست اوراس کے شوہر کو یہ تسلی تھی کہ وہ جی بھر کے پھل کھاتے ہیں۔اس کے علاوہ وہ اپنی زمین کے سرسبز وشاداب حصّے سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔اور وہ سوچتے تھے کہ اس جائیداد کے مالک وہ ہیں۔یہی وہ جذبات تھے جن کی وجہ سے وہ وہاں رہتے تھے۔

میری دوست کے شوہر کا کاروبار شہر میں تھا۔اس کاروبار سے ان کو اچھی آمدنی تھی۔کچھ عرصے سے میری دوست کو ایسی بیماری ہوگئی تھی جس کی تشخیص ڈاکٹر بھی نہیں کر سکتے تھے۔یہ فارم خریدنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔یہاں تازہ اور شفاف ہوا تھی۔جب بھی وہ اپنی فصل کا ذکر کرتی اس کا مطلب باہر لان میں کھڑے چیری کے پیڑوں کے پھل ہی ہوتے تھے۔

میری دوست کو اعصابی بیماری تھی۔میرے خیال میں یہ ایسی کوئی خطرناک بیماری نہیں تھی۔ لیکن وہ اسی کے لیے بہت پریشان رہتی تھی حالانکہ میرے خیال میں محض اچھی صحت کے لیے شہر سے باہر رہنا خوامخواہ کی فضول خرچی تھی۔وہ فارم ہاؤس اس بیماری کی وجہ سے بھی خریدا گیا تھا۔یہ سوچ کر میرا دل خراب ہونے لگا تھا۔لیکن چیری کی شراب نے میری یہ اداسی ختم کردی۔

شراب کا اثر میری رگ رگ میں اترا تو میرے اوپر نشہ چڑھ گیا۔اس کے ساتھ ہی ایسا لگا جیسے میں کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئی ہوں۔میں نے ہنسنا شروع کردیا اور عجیب وغریب حرکتیں کرنے لگی نشے کی وجہ سے میرے اندرونی جذبات وخیالات میرے خوف اور اندیشے اور نفرتیں سب باہر آنا شروع ہوگئیں۔

چشمے کے صاف پانی کے شفاف قطروں کی طرح میرے منہ سے الفاظ کی بارش برسنے لگی۔ مجھے اس کی کی پرواہ نہیں تھی کہ سننے والے اسے چشمے کا صاف شفاف پانی سمجھ رہے ہیں یا نالی کا گندا پانی میں تو اس بے پناہ لذت سے سرشار تھی جو مجھے اس نشے نے دی تھی اور پہلی بار اپنے دل کی بات کھل کر کہنے کی آزادی کا جو احساس پیدا ہوا تھا اس نے میرا نشہ اور بھی بڑھا دیا تھا۔اب میں کسی خوف کے بغیر بولے چلی جارہی تھی۔الفاظ کی طاقت سے میں اپنے آپ کو ہر پابندی سے آزاد محسوس کررہی تھی۔شاید میں اپنے الفاظ کا مزا بھی لے رہی تھی۔

روزمرہ کی زندگی سے آزادی پیڑ کی شاخ پر لٹکا ہوا ستارہ بن گئی تھی۔وہ ستارہ اتنا قریب لگ رہا تھا جیسے مین ہاتھ بڑھا کر اسے چھولوں گی اور میں خیالوں ہی خیالوں میں پیڑ پر چڑھ رہی تھی۔ مگر میں جتنا اس کے قریب جاتی وہ اتنا ہی دور ہوجاتا۔اس کے ساتھ ہی زمین کا فاصلہ بھی بڑھتا

جاتا اب صرف خوف کا احساس ہی باقی رہ گیا تھا۔

میرا بولنا جاری تھا۔مگر مجھے اپنا بولنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔لیکن میں اپنے اس مکھوٹے سے آزاد ہوگئی تھی جو میری روزمرہ زندگی کا ایک حصہ بن گیا تھا۔خیر جو بھی تھا وہ خوب تھا۔

میں اپنی دوست کو الزام نہیں دیتی کہ وہ اپنے فارم کے بارے میں شیخیاں بگھار رہی تھی۔اس فارم میں بہترین شراب بنتی تھی اور میرے لیے یہی کافی تھا۔اس شراب نے میرے اوپر جادو کردیا تھا۔

میری دوست کا شوہر شام کو کام سے واپس آیا۔ اس وقت تک برفانی طوفان کم ہو چکا تھا۔ لیکن ہر چیز برف سے ڈھک چکی تھی۔کوئی چیز بھی پہنچانی نہیں جارہی تھی۔دھان کے کھیت' سبزیوں کی کیاریاں حتی کہ سڑکیں تک برف کی تہہ میں دب گئی تھیں۔سامنے برف کی سفید ساٹن جیسی جو چادر بچھی تھی اس میں سڑک ایک چھوٹا سا دھبہ نظر آرہی تھی۔آنکھیں چندھیانے والی کار کی روشنی اور ہر طرف کی آواز سے اس کے آنے کی اطلاع ملی۔

وہ بغیر سدھایا ہوا جانور نظر آتا تھا جو خطروں سے بچتا ہوا اپنی سرشت کی بنا پر ہی گھر واپس آ گیا تھا۔مجھے اس کی جرائت پسند آئی اور خوشی ہوئی کہ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔میری خوبی یہ ہے کہ میرے اوپر شراب کا نشہ تو چڑھتا ہے لیکن میں آپے سے باہر نہیں ہوتی۔

میں نے اپنی دوست کے شوہر کی تعریف کی تو وہ شرما گیا۔اس نے کہا وہ اپنی کار میں مجھے میرے گھر چھوڑ آئے گا کیونکہ سڑک پر بہت پھسلن ہے۔اس پر میری دوست بہت خوش ہوئی۔وہ میری گردن میں بانہیں ڈال کر اچھلنے لگی۔

''اچھا؟ تم اسے چھوڑنے جاؤ گے؟ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' اس نے کہا۔'' میں تو واقعی پریشان تھی۔اگر میں اپنی بہترین دوست کو تکلیف دہ بس پر جانے دیتی تو رات بھر مجھے نیند نہ آتی۔''

''اس وقت کوئی بس بھی نہیں ملے گی۔اس موسم میں تو بسیں بھی بند ہوجاتی ہیں۔اگر یہ یہاں رہنا چاہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میری گاڑی حاضر ہے۔ہوں ... تو کہاں جانا ہے؟''۔اس کے شوہر نے پوچھا۔

اگرچہ میں تھوڑے سے نشے میں تھی مگر میں ان کے خیالات جان گئی تھی۔وہ مجھ سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔میں فوراً کھڑی ہوگئی۔

MashalBooks.com

''تم نیند میں گاڑی چلاؤ گے۔ ذرا احتیاط رکھنا۔''

میری دوست نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ اپنے شوہر کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس سے مجھے متلی ہوئی اور میں پیچھے نشست میں دھنس گئی۔ معلوم نہیں میں کتنی دیر سوتی رہی۔ آنکھ اس وقت کھلی جب میری دوست اور اس کے شوہر نے مجھے لفٹ میں کھڑا کر دیا۔ پھر وہ چلے گئے۔ میں نے اپنا پرس کھولا اور چھوٹا بٹوہ تلاش کرنے لگی۔ میری نظر چیونگم کے پیکٹ پر پڑی۔ معلوم نہیں چیونگم وہاں کیسے آ گئی تھیں۔

''اسے چوسو' تمہاری سانس خوشبودار ہو جائے گی۔'' مجھے یاد آیا میری دوست نے مجھ سے کہا تھا۔ اسی وقت اس نے یہ پیکٹ میرے پرس میں رکھا ہوگا۔ مگر مجھے یاد نہیں۔ یہ اس کی مہربانی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بدبودار سانسوں کے ساتھ میں اپنے شوہر اور بچوں کے سامنے جاؤں۔ اس وقت تک مجھے اپنے گھر کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ میں اپنے خاندان سے بالکل ہی بے نیاز ہو گئی تھی۔

اب مجھے اس کا خیال آیا تو ایک بار پھر وہی تکلیف دہ احساس عود کر آیا۔ وہی جانا پہچانا احساس۔ لگ رہا تھا جیسے کوئی گھناؤنا کیڑا میری پیٹھ پر رینگ رہا ہے۔ اصل حقیقت کے سامنے دن بھر کا جو خوش گوار احساس تھا وہ یکدم غائب ہو گیا۔ میرے پاؤں لڑکھڑائے۔ نشے کی وجہ سے نہیں کیونکہ نشہ تو کب کا اتر چکا تھا۔ میں نے اپنی عمر کے بارے میں سوچا میری عمر اب زوال کی طرف چل رہی تھی جہاں حادثے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ اور میری عمر میں یہ پریشانی ٹھیک بھی تھی۔

کچھ عرصے سے خطرے کا احساس کچھ کم ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود مجھے ڈر لگا رہتا تھا کہ میرے خاندان میں کوئی حادثہ ہو سکتا ہے۔ میرا یہ ڈر بہت شدید تھا۔ مگر جب لفٹ رکی تو سامنے میرا پورا خاندان خاموش بُت بنا کھڑا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر بھی اسی طرح بت بنے کھڑے رہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے اجنبی سمجھ رہے ہوں۔ قصور میرا ہی تھا' صرف میرا۔ میں نے یہ نہیں سوچا کہ میری حرکتوں نے مجھے تنہا کر دیا ہے اور یہ تنہائی میں برداشت کر بھی سکوں گی۔

میری روزمرہ کی زندگی بس یونہی گزر رہی تھی۔ اپنی عارضی آزادی سے واپس آنے کے بعد

میں نے محسوس کیا کہ میرا خاندان میرے وجود کو نظر انداز بھی کر سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میرا موڈ بدل گیا۔ اور مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی اکتا دینے والی زندگی سے پیار کرتی ہوں۔

حسب معمول میں نے زبردستی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر انہیں خوش کرنے کی کوشش کی۔ میری یہ کوشش افسوس ناک حد تک بہت ہی عجیب و غریب تھی کیونکہ میں نے اپنے چہرے کے اعصاب کھینچ کھانچ کر اوپر کیے تھے جس سے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں پہلی بار ان سے مل رہی ہوں۔

''مجھے بہت دیر ہو گئی۔ افوہ کتنا ہولناک برفانی طوفان ہے دیکھو تو' میری دوست نے بہت کہا کہ رات کو اس کے گھر ہی ٹھہر جاؤں مگر میں تم سب کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ مجھے اپنی کار میں چھوڑ کر گئے ہیں۔ ان کے پاس ڈرائیور نہیں ہے مگر تم جانتے ہو وہ بہت ہی امیر لوگ ہیں۔ وہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر مجھے یہاں لائے ہیں۔ خدا کی پناہ کیا طوفان ہے۔'' میں گھر کی راہداری کی طرف دیکھتے ہوئے بولی چلی جا رہی تھی۔

''ماما آپ پریشان نہ ہوں۔'' میری بڑی بیٹی نے کہا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میرا شوہر بولا

''ایک حادثہ ہو گیا ہے۔'' میرا بیٹا بولا۔

''گھبراؤ نہیں ماما۔'' چھوٹے بیٹے نے کہا۔

ان الفاظ کا جو اثر ہوتا ہے وہ سب جانتے ہیں اور اگر ان کے ساتھ ''حادثہ'' بھی کہا جائے تو تشویش پیدا ہونا لازمی ہے۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا مگر میں دیکھ رہی تھی کہ میرے گھر کے لوگ تو سب ٹھیک ٹھاک میرے سامنے کھڑے ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ گھبرانا نہیں چاہیے۔ اگر میرے گھر والے ٹھیک ہیں تو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

''آپ کی ماما کے چوٹ لگ گئی ہے۔ میری بیٹی نے کہا وہ سیڑھیوں سے پھسل گئی ہیں۔ سیڑھیوں پر برف پڑی ہوئی تھی۔'' میرے بیٹے نے وضاحت کی۔

''بہت زیادہ چوٹ لگی ہے۔'' دوسری بیٹی بولی

''وہ بیہوش ہو گئی تھیں۔ اور ابھی تک ہوش نہیں آیا ہے۔''

سب سے چھوٹا بچہ بولا۔ وہ رو رہا تھا۔ ''ہم آپ کا انتظار ہی کر رہے تھے۔''

MashalBooks.com

''ہم ہسپتال ہی جارہے تھے۔تم بھی چلوگی؟'' میرے شوہر نے کہا۔

وہ بولے جارہے تھے اور میں سن رہی تھی وہ مجھ سے ناراض معلوم نہیں ہوتے تھے مگر میں اتنی شرمندہ تھی کہ جی چاہتا تھا کہیں جا کر چھپ جاؤں۔

''تم چلو' میں ابھی آتی ہوں۔میرا دل خراب ہورہا ہے۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔'' مجھ سے تو کھڑا بھی نہیں ہوا جارہا ہے'' میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا۔

''ہمیں ماما کو ایک دم یہ نہیں بتانا چاہیے تھا۔انہیں بہت صدمہ ہوا ہے۔'' بڑے بیٹے نے کہا۔

''کیوں نہیں بتانا چاہیے تھا۔کہیں نہ کہیں سے تو انہیں معلوم ہو ہی جاتا۔'' دوسرے بیٹے نے کہا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔تم صحیح کہتے ہو ... مگر میں نے ایک ایسا لڑکا بھی دیکھا ہے جس نے اپنا نقصان اپنے ماں باپ سے چھپایا البتہ میں نے ایسے ماں باپ نہیں دیکھے جو اپنے نقصان اور حادثے اپنے بچوں سے چھپاتے ہوں۔ماں باپ کے کتنے ہی برے حالات ہوں وہ بچوں سے نہیں چھپاتے۔''

میں اپنے بچوں کو آپس میں بحث کرتے سنتی رہی۔میرے شوہر چار بچوں کو لے کر ہسپتال چلے گئے۔ایک بچہ میرے ساتھ رہ گیا۔میں اس بچے کو باہر ہی چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کر کے فرش پر گر گئی۔ مجھے صدمے سے زیادہ شرمندگی تھی۔میں شرم سے مری جارہی تھی۔

اندر ہی اندر مجھے یہ اطمینان تھا کہ حادثہ میری ماں کو پیش آیا ہے۔میری غیر حاضری میں میرے اپنے گھر کے کسی فرد کو پیش نہیں آیا۔یہ اطمینان بھی تھا اور شرمندگی بھی تھی۔اب اچانک مجھے نیند آنا شروع ہوئی اور نیند کے مارے میرا برا حال ہوگیا۔اس نیند نے میرے جرم کے احساس کو چھپالیا۔جو بچی مجھے تسلی دینے کے لیے میرے ساتھ رہ گئی تھی وہ پریشان تھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔میں فرش پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازہ کھول دیا۔میری بیٹی پریشانی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے بھی اس پر یہی ظاہر کیا کہ میں صدمے سے حواس کھو بیٹھی ہوں۔اس کے بعد میں بستر پر گر گئی اور میٹھی نیند کے مزے لینے لگی۔

میں بہت ہی گہری نیند کے بعد جلد ہی اٹھ بیٹھی۔ جاگنے کے بعد جو بات سب سے پہلے

میرے دماغ میں آئی وہ یہ تھی کہ میرے بچوں کی طرح میرں ماں بھی میرا ہی خون ہیں۔یہ خیال اچانک ایسے آیا۔جیسے یہ ایک انکشاف ہو۔میری ماں اور میرے بچے میرا ہی حصہ ہیں۔

میرے جسم میں میری ماں کا خون ہے۔میرے بچے ہیں جو میری زندگی کا حصہ ہیں' میری خوشی اور میرا وقار ہیں۔مگر اپنی ماں کے لیے تو صرف میں ہی ہوں۔کسی ماں کے کتنے ہی بچے ہوں وہ سب سے برابر کا پیار کرتی ہے۔بچوں کے پیار کی وجہ سے کسی بچے کے لیے ماں کی محبت کم نہیں ہوتی۔وہ جو کہتے ہیں کہ'' آپ کسی بھی انگلی پر دانت گاڑیں تکلیف ایک سی ہی ہوگی چاہے وہ انگلی چھوٹی ہو یا بڑی۔میں اپنی ماں کی اکیلی انگلی باقی رہ گئی تھی۔میں نے سوچا کہ تنہا میرے لیے ان کے دل میں کتنی محبت اور کتنا پیار ہوگا۔

مجھے اپنا بھائی یاد آیا جو کوریا کی جنگ کی نذر ہوگیا تھا۔ہمارے عزیزوں اور رشتے داروں میں سب اسے بہت ہی فرماں بردار لڑکا کہتے تھے۔اس کے لڑکپن کی ناقابل فراموش باتیں میری آنکھوں کے سامنے آگئیں۔مجھے وہ دن یاد آئے جب میں ماما اور بھائی غربت کی زندگی گذارتے تھے اور میں ذرا ذرا سی چیز کے لیے ماما کی خوشامد کرتی تھی۔ایک دن مجھ سے ایک دکان کا شیشے کا مرتبان ٹوٹ گیا تھا۔اس کا خرچہ ماما کو دینا پڑا تھا۔اور مجھے وہ دن بھی یاد آیا جب میرا بھائی مجھے پہاڑی پر لے گیا تھا اور مجھے چھڑی سے مارا تھا پھر ہم دونوں خوب روئے تھے۔

چھڑی مارنے کی یاد سے میری نیند بھاگ گئی۔ایسا لگا جیسے میرا بھائی میرے ساتھ کھڑا ہے۔ کافی عرصے سے مجھے ایسا احساس نہیں ہوا تھا۔یہ سوچ کر میرے آنسو نکل آئے۔

چپ میرا بھائی گھر سے چلا گیا تھا تو ماما کی دیکھ بھال کی ذمہ داری میں نے سنبھال لی تھی۔ انہیں دیکھنے والی ایک میں ہی رہ گئی تھی۔یہ سوچتے ہوئے ایک نئے جذبے کے ساتھ میں ہسپتال روانہ ہوگئی۔

یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ماما کو ہوش آگیا تھا۔انہوں نے مجھے دیکھا تو مسکرانے کی کوشش کی۔ میرے دو بھتیجے' میرے بھائی کے بیٹے ان کے بستر کے ساتھ کھڑے تھے وہ اس عمر سے آگے نکل چکے تھے جو میرے بھائی کی تھی جب وہ مرا تھا۔ان کی شادیاں ہوچکی تھیں اور ان کے بچے بھی تھے۔ایمرجنسی روم جہاں میری ماں کو رکھا گیا تھا میرے خاندان سے بھرا ہوا تھا۔ان میں میرے بھتیجے بھی تھے۔ میں ہسپتال آرہی تھی تو اپنے بھائی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔اس خیال نے

MashalBooks.com

مجھے افسردہ کر دیا تھا کہ مرنے والوں کی عمر نہیں بڑھتی۔

میں ان سب سے بچتی بچاتی ماں کے بستر کے پاس پہنچ گئی اور ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بعد میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ اس وقت میری حالت ایسی تھی کہ وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ماں کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر گئی تھیں اور آنسوان کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ ماں کو یہ احساس تھا کہ ان کی اولاد میں اب تنہا میں ہی رہ گئی ہوں۔ وہ رو رہی تھیں اور میں بھی رو رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''میں نے کھڑکی سے سیوک کے باپ کو برف صاف کرتے دیکھا تھا میں ان کی مدد کرنا چاہتی تھی اس لیے جلدی سے باہر آئی تو صحن میں پھسل گئی۔ میرا دل تو جوان ہے مگر ...'' ماما نے کہا۔ سیوک کا باپ میرے مرحوم بھائی کا بڑا بیٹا اور میری ماں کا سب سے بڑا پوتا تھا وہ سب ماما کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

''مدد کرنے گئی تھیں... مجھے یقین ہے یہ اسے ڈانٹنے گئی ہوں گی۔'' سیوک کی ماں منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

''اچھا ...؟ تو تم دونوں وہاں تھے اور تم نے ماما کو گرنے دیا؟'' میں نے سوچے سمجھے بغیر اپنے بھتیجے اور اس کی بیوی پر الزام لگا دیا۔

''دادی ہر کام میں ٹانگ اڑاتی ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ وہ مجھے کچھ ہدایت دینے آ رہی ہیں۔'' میرے بھتیجے نے جلدی سے اپنی بیوی کا ساتھ دیا۔

ماما کی عمر اسی سال سے زیادہ ہو چکی تھی اور میرا بھتیجا اور اس کی بیوی ابھی تیس سال کے ہی ہوں گے۔ عمر کے اس فرق کے باوجود ان کے لیے میری ماں کا خیال رکھنا آسان کام نہیں تھا۔ بہر حال یہ پہلی مرتبہ تھی کہ انہوں نے میری ماں کے بارے میں ایسی سخت بات کی تھی۔

ایمرجنسی روم میں مریضوں کی آہوں اور کراہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''کہاں چوٹ لگی؟'' میں نے پوچھا

بھتیجے کی بیوی نے چادر ہٹا کر ماما کے پاؤں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ پاؤں ایسا سوجا ہوا تھا جیسے کسی اور کی ٹانگ لگا دی گئی ہو۔ اسے دیکھتے ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ حالت بہت ہی خراب ہے۔

ماں 86 سال کی تھیں۔

''انہیں اس پر پلستر چڑھا دینا چاہیے۔'' ماما نے آہستہ سے کہا جیسے وہ ہمیں تسلی دے رہی ہوں۔

''بہت درد ہو رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بہت درد ہو رہا ہے۔ اس سے تو اچھا ہے میں بیہوش ہی ہو جاؤں۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ ...'' میں چیخی۔

اسی وقت نرس آ گئی اس نے ہم سے باہر جانے کو کہا۔ ہم سب انچارج ڈاکٹر کے پاس چلے گئے۔ ڈاکٹر نوجوان تھا اور تھکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ سامنے گھڑی پر آدھی رات کے بھی بعد کا وقت تھا۔ ماں کے کولہے اور ران کے ایکسرے سامنے رکھے تھے۔ اس میں ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔

''پہلے تو انہیں ہسپتال میں داخل کرنا پڑے گا۔ پھر ان کا حال دیکھنے کے بعد آپریشن کا فیصلہ کیا جائے گا۔'' نوجوان ڈاکٹر نے کہا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔''

''ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ آپریشن برداشت کرنے کے قابل بھی ہیں یا نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کا پاؤں آپریشن کے بغیر ٹھیک نہیں ہو سکتا۔''

''وہ چھیاسی برس کی ہیں۔ وہ آپریشن کیسے برداشت کر سکتی ہیں۔ وہ تو کہہ رہی ہیں کہ آپ پلستر چڑھا دیں۔ اب یہ معلوم نہیں کہ وہ پلستر کب تک رہے گا مگر آپ مہربانی کیجیے اور پلستر چڑھا دیجیے۔'' میں نے کہا۔

''میں اپنی بات سمجھا نہیں سکا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔'' میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان کی ہڈیاں بہت کمزور ہیں پلستر سے وہ ٹھیک نہیں ہو سکتیں انہیں سرجری کی ہی ضرورت ہوگی۔ پلستر تو ایسا ہوتا ہے جیسے پاؤں تابوت میں رکھ دیا گیا ہو۔ خطرہ یہ ہے کہ پلستر میں وہ کسی نہ کسی اور بیماری سے ختم ہو جائیں گی۔''

''وہ کہتی ہیں کہ انہیں پلستر ہی چاہیے۔ آپ ایسا ہی کر دیجیے۔'' میں نے خوشامد کی۔

''مریض خود اپنے مرض کی تشخیص نہیں کر سکتا اور نہ اپنا علاج کر سکتا ہے۔'' اس نے سختی سے کہا۔

آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں کوئی اختیار نہیں ہے۔؟''

MashalBooks.com

''جی ہاں۔ ان کی مدد کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انہیں آپریشن کے لیے آمادہ کیا جائے۔''

''آپریشن کے بعد وہ چل پھر سکیں گی؟'' میں بولے چلی جارہی تھی۔

''یہ تو ان کی حالت پر ہے''۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ آپریشن کے نتیجے کا یقین نہیں دلا سکتے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔'' میں نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا جیسے میں اس سے لڑنا چاہتی ہوں۔ لیکن نوجوان ڈاکٹر میری طرح جوش میں نہیں تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کا یہ رویہ اس کے خشک مزاج کی وجہ سے نہیں بلکہ کام کی زیادتی کی وجہ سے تھا۔

''میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کل صبح بڑے ڈاکٹر سے تفصیل معلوم کرلیں۔ سب سے پہلے تو آپ کو چند کاغذوں پر دستخط کرنا ہوں گے تاکہ انہیں ہسپتال میں داخل کیا جاسکے۔''

''اگر آپ بڑے ڈاکٹر نہیں ہیں تو آپریشن جیسے خطرناک علاج کا مشورہ کیوں دے رہے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''میرا جو آج کل کا طبی علم ہے اس کی بنا پر میرے نزدیک ان کے علاج کا یہی ایک طریقہ ہے۔'' ڈاکٹر نے بیزار ہوکر کہا۔

''آپ ان کے ٹھیک ہونے کی ضمانت بھی نہیں دیتے۔'' میں نے بھی بیزاری سے کہا۔

''میں نے یہ نہیں کہا کہ یہ محفوظ طریقہ ہے۔ میں نے صرف یہ کہا ہے ان کا یہی ایک علاج ہے۔'' میں یہی سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں کہ یہی ایک علاج ہے۔ بلکہ یہ آخری طریقہ ہے۔'' ڈاکٹر کو آخر غصہ آگیا۔

''آنٹی آپ کیا کررہی ہیں۔ جب تک دادی ہسپتال میں ہیں ہمیں ڈاکٹر کی بات ہی ماننا پڑے گی۔'' میرے ایک بھتیجے نے کہا۔ اب تک وہ دونوں بھتیجے میرے پیچھے کھڑے تھے۔ ڈاکٹر کی بات کے بعد وہ میرے برابر آکر کھڑے ہوگئے تھے۔''

''تم نہیں جانتے۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔'' میں ان پر چیخی۔ میرے دل میں غصے اور مایوسی کا لاوا ابل رہا تھا۔

''آپ کیا کہہ رہی ہیں آنٹی؟ ہم کیا نہیں جانتے؟۔''

''تمہاری دادی چھیاسی سال کی ہیں تمہارا خیال ہے وہ آپریشن برداشت کرلیں گی۔'' میں نے کہا۔

''اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔ پہلے تو انہیں ہسپتال میں داخل کرانا پڑے گا۔ بڑے ڈاکٹر سے باقی تفصیل ہم کل معلوم کرلیں گے۔ آنٹی ابھی ہم ایمرجنسی میں ہیں۔'' میرے بھتیجے نے مجھے یاد دلایا۔

میرے دونوں بھانجے مجھے کھینچ کر ایمرجنسی سے باہر لے گئے جیسے میں وہاں ہنگامہ کھڑا کرنے والی تھی۔ اس وقت مجھے خیال ہی نہیں آرہا تھا کہ نوجوان ڈاکٹر سے اتنی لمبی چوڑی باتیں کرنا ہوں گی۔

دوسرے بڑے یونیورسٹی ہسپتالوں کی طرح اس ہسپتال میں بھی صبح کو چھوٹے ڈاکٹروں اور نرسوں کے ساتھ بڑے ڈاکٹر نے ایمرجنسی وارڈ کا راؤنڈ کیا۔ میں اس کے افسرانہ انداز سے ہی پہچان گئی تھی کہ یہ بڑا ڈاکٹر ہے۔ میں انکساری کے ساتھ ایک طرف کھڑی ہوگئی اور انتظار کرنے لگی کہ وہ کیا کہتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے ساتھیوں سے کسی غیر ملکی زبان میں کچھ کہا اور باہر چلا گیا۔ میں بھی جلدی سے باہر نکلی مگر وہ کہیں جاچکا تھا۔ لیکن میری خوش قسمتی تھی کہ کل رات والا نوجوان ڈاکٹر مجھے مل گیا۔ میرے منہ کھولنے سے پہلے ہی اس نے بتایا کہ پیر کے دن آپریشن ہوگا اور ہوسکتا ہے تین دن بعد ہو۔ یہ کہہ کر وہ کسی اور مریض کے کمرے میں چلا گیا۔

میں مسلسل تین دن انچارج ڈاکٹر کے پاس جاتی رہی۔ آخر مجھے چوٹ کی نوعیت کا پتہ چلا۔ ان کے کولہے میں جہاں ہڈی ٹوٹی تھی وہاں ٹھیک ہونا بہت مشکل تھا۔ مجھے اتنا ہی معلوم ہوا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ چونکہ ماں بہت بوڑھی ہیں اس لیے قدرتی طور پر ہڈی جوڑنے کے لیے جس سیال مادے کی ضرورت ہوتی ہے وہ ماں کے جسم میں اب پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے ہڈی جوڑنے کے لیے پاؤں میں فولادی راڈ ڈالنا لازمی ہے۔ آپریشن خاصہ پیچیدہ ہوگا۔ انچارج ڈاکٹر نے یہ تمام باتیں ایک دم نہیں بتائیں۔ وہ تو بتانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ہی تھوڑا تھوڑا کرکے معلوم کرلیا۔ جس طبی زبان میں اس نے باتیں کیں ان کا مطلب بھی میں نے خود ہی نکالا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میرے اوپر ڈاکٹر کا رعب تھا یا خاموشی نے مجھے مرعوب کررکھا تھا۔ اس رعب کی وجہ سے میں جو کہنا چاہتی تھی وہ نہیں کہہ سکی۔ میرے سوال میرے منہ میں رہ گئے تھے۔

MashalBooks.com

''بیٹی۔'' ماں نے کہا۔'' اصل میں تو مجھے محلے کے ہڈیوں کے ڈاکٹروں کے پاس لے جانا چاہیے تھا۔ وہ ایسی ہڈی ٹوٹنے کا بھی علاج کرسکتا ہے۔ تم خواہ مخواہ مجھے یہاں لائے۔ یہاں خرچہ بھی اتنا ہورہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ جلدی سے ٹانگ پر پلستر کیوں نہیں چڑھا دیتے۔ وہ بوڑھی عورت کا خون کیوں لے رہے ہیں۔ میری ہڈیوں میں جان ہی کہاں ہے۔ اور یہ روزانہ خون لے رہے ہیں۔ وہ کیسے ٹیسٹ کررہے ہیں۔ کتنے ٹیسٹ کریں گے یہ؟''۔

''مجھے اپنی تکلیف کی فکر نہیں ہے۔ مجھے تو خرچے کی پریشانی ہے یہاں تو کوئی چیز بھی مفت نہیں ہے۔ اگر وہ صرف پلستر لگا کر مجھے گھر بھیج دیں تو ان کا نقصان ہوگا۔ میں جانتی ہوں یہ میرا ایک ایک پیسہ نکلوا لیں گے۔ تم ان کے پاس جاؤ اور بتاؤ کہ تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میرا پاؤں اگر پلستر کے بعد بھی ایسا ہی رہا تو میں چاہوں گی کہ مرجاؤں۔ مجھے مرجانے دو۔ میں نے اپنے بیٹے کو مرتے دیکھا ہے اور اتنی لمبی زندگی گذار رہی ہوں۔ شرم آتی ہے مجھے۔ میں نے کیا گناہ کیا تھا جو مجھے یہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔''

ماما بہت تکلیف میں تھیں البتہ انہیں اتنی امید تھی کہ اگر ڈاکٹر پلستر چڑھا دیں تو وہ ٹھیک ہوجائیں گی انہیں خیال ہی نہیں تھا کہ پلستر سے ان کی چوٹ اور خراب ہوجائے گی میرے خاندان میں سے کسی نے بھی انہیں سچی بات نہیں بتائی تھی۔ بیٹی ہونے کی وجہ سے یہ میری ہی ذمہ داری تھی کہ میں ماما کو تسلی دوں۔

آخر آپریشن کا دن آگیا۔ ایک رات پہلے ڈاکٹر نے ان کے بستر پر لکھ کر لگا دیا۔ اور کہا کہ اب کچھ بھی کھانا پینا نہیں ہے۔ اور ہمارے لیے بھی ماما کو سچ بتانا ضروری ہوگیا تھا۔

''آپریشن؟ کس نے اجازت دی ہے انہیں اس کی؟ میں بالکل نہیں کراؤں گی۔ ان کی مجال ہے جو مجھے ہاتھ لگالیں۔ میں نے بہت زندگی گذاری ہے۔ اور بہت تکلیف کے ساتھ گذاری ہے۔ خدا کسی کو ایسی زندگی نہ دے۔ میں اپنے ہاتھ سے بھی اپنی زندگی ختم کرسکتی ہوں۔ مگر میں جانتی ہوں جس خدا نے یہ زندگی دی ہے وہ مجھے اس کی سزا دے گا۔ اس لیے اگر میں آپریشن کے بغیر مرجاؤں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ میں نوے سال کی ہونے والی ہوں۔ اگر تم مجھے مرنے دو گے تو مجھے یقین ہے کوئی بھی تمہیں برا نہیں کہے گا۔''

ماما کا آپریشن کرانے سے انکار کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ان کے بڑے پوتے نے کاغذات

پر دستخط کردیے تھے۔ دوسری صبح کو میڈیکل اسٹاف انہیں آپریشن تھیٹر لے جانے کی تیاری کرچکا تھا۔ اسے ان کے انکار کی پرواہ نہیں تھی۔ لیکن میں ماں کی بے عزتی نہیں کرانا چاہتی تھی۔ سوائے ان کے سوجے ہوئے پیر کے باقی سارا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ وہ سوکھی لکڑی نظر آتی تھی۔ اپنے ایسے منحنی جسم کے باوجود جب تک ان کے اندر عزت نفس موجود تھی انہیں یہ جاننے کا پورا حق تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ان کی اکیلی اولاد ہونے کی وجہ سے میرے دل میں ان کے لیے محبت اور نفرت کے ملے جلے جذبات تھے۔

اب میں نے جذبات کی پرواہ نہیں کی اور پوری یکسوئی کے ساتھ انہیں آپریشن کے بارے میں صاف صاف بتادیا۔

''ماما' آپ یہ خیال کیجیے کہ آپ کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی لکڑی ہے۔'' میں نے آرام سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی'' فرض کیجیے آپ کے پاس ٹوٹی ہوئی چھڑی ہے جسے آپ اس وقت تک استعمال نہیں کرسکیں گی جب تک اس کی مرمت نہ ہوجائے' تو آپ اسے گوند سے جوڑیں گی یا اس کے ساتھ لوہے کی سلاخ لگا کر اس میں پیچ لگائیں گی یا اسے یونہی چھوڑ دیں گی آپ ڈریں نہیں ڈاکٹر لوہے کی سلاخ سے آپ کی ہڈی کے دونوں ٹکڑے جوڑ دے گا۔ اگر آپ ٹوٹی ٹانگ کے ساتھ چند دن اور زندہ بھی رہ لیں تو وہ کوئی زندگی تو نہیں ہوگی۔''

حیرت کی بات ہے' اب ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ان کی کھوئی کھوئی آنکھیں کسی خواب دیکھنے والی لڑکی کی آنکھوں کی طرح ہوگئیں۔ ''سنگول'' آج بھی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے لیے بہترین دوا ہے۔؟''

''کیا؟...'' میری سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ وہ پہیلیوں میں باتیں کررہی تھیں۔ ان کے مزاج کی یہ تبدیلی مجھے اچھی نہیں لگی۔ مجھے غصہ آگیا اور میں چیخنے لگی مگر وہ پھر بولیں تو ایسا لگا جیسے وہ اپنی میٹھی آواز میں بچوں کی کہانیاں سنا رہی ہیں۔'' طب کے فن میں کتنی ہی ترقی ہوگئی ہو مگر ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے لیے سنگول آج بھی بہترین چیز ہے۔ میں کہہ رہی ہوں نا' اس سے اچھی اور کوئی چیز نہیں ہے۔''

''آپ کیا کہہ رہی ہیں ماما۔ آپ عقل سے کام لیجیے'' میں نے ان کا کمزور کاندھا ہلاتے ہوئے کہا۔

MashalBooks.com

''اگر ہڈی تھوڑی سی ٹوٹی ہو تو سنگول کھانے سے وہ ٹھیک ہو جاتی ہے۔ میری بڑی ہڈی ٹوٹی ہے اس لیے اندر سینگول رکھنے کے لیے آپریشن کی ضرورت ہوگی۔ میرے بچو' مجھے آپریشن سے ڈر نہیں لگتا بالکل ڈر نہیں لگتا میں تو یہ جانتی ہوں کہ چھوٹی ہڈی ٹوٹ جائے تو سنگول کھانے سے وہ جڑ بھی جاتی ہے اور پہلے سے زیادہ مضبوط بھی ہو جاتی ہے۔ ادھر آؤ' میری کلائی دیکھو۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا۔'' انہوں نے ہنستے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ان کا ہاتھ نارمل نظر آ رہا تھا۔ ہڈی تھوڑی سی باہر کو نکلی ہوئی تھی اور ٹیڑھی بھی تھی جس سے ان کا ہاتھ معمول سے زیادہ بڑا نظر آ رہا تھا۔ مجھے ان کی اس ٹیڑھی کلائی کی وجہ یاد آ گئی۔ اور سنگول کھانے کا واقعہ بھی یاد آ گیا۔

ماما' بھائی اور میں جب سیول میں ہیونجو دونگ کے علاقے میں اپنے گھر منتقل ہوئے تھے تو جاڑوں کا پہلا موسم بہت ہی شدید تھا۔ ہمارا گھر جس کا صحن تکونا تھا' پہاڑی کے اوپر تھا۔ اس بار جو جاڑا پڑا اس جیسا جاڑا پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ برسات کی بارش کی طرح مسلسل کئی دن برف پڑتی رہی تھی۔ ہمارے گھر پانی والے مسٹر کم شمالی کوریا سے آئے تھے وہ بھی ہار مان گئے وہ برفباری کے ساتھ مقابلہ نہ کر سکے اور کئی کئی دن پانی کا ناغہ کرنے لگے۔ ہم نے پینے کے پانی کے لیے یہ طریقہ نکالا کہ سویابین کے مرتبانوں میں برف جمع کرنا شروع کر دی۔ یہ برف صحن سے اور چھت سے اکٹھی کی جاتی۔ پھر اسے بڑے برتنوں میں بھر کر آگ پر رکھا جاتا۔ اس طرح ہمیں پینے کا پانی مل جاتا تھا۔ البتہ ہمیں ایندھن کے لیے روزانہ لکڑی خریدنا پڑتی تھی۔

ماما ہر روز سوکھی لکڑیاں خریدتیں۔ یہ لکڑیاں وہ قریب کی دکان سے نہیں خریدتی تھیں بلکہ اس کے لیے وہ گھر سے دور لکڑیوں کی منڈی جاتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ وہاں لکڑی سستی مل جاتی ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ منڈی کی لکڑی محلے کی دکان کے مقابلے میں زیادہ بھاری ہوتی تھی اس لیے وہ سستی لگتی تھی۔ اگر منڈی سے دس یا اس سے زیادہ گٹھے خریدے جاتے تو گھر تک مفت پہنچانے کی سہولت بھی موجود تھی۔ لیکن ماما کے پاس اتنے پیسے ہی نہیں ہوتے تھے کہ وہ اس سہولت سے فائدہ اٹھاتیں۔ وہ خود منڈی جاتیں اور ایک یا دو گٹھے خرید لاتیں۔

برف کا طوفان جاری تھا۔ برفباری میں پھسلنے والے راستے پیدل چلنے والوں کے لیے خطرناک بن گئے تھے۔ میرے بھائی نے کہا بھی کہ وہ ماما کے ساتھ منڈی چلا جائے گا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔

''تمہاری ماما کو یہ کیسے اچھا لگے گا کہ اس کا اتنا فرماں بردار بیٹا لکڑیاں اٹھا کر لائے۔ تم میرے اکلوتے بیٹے ہو۔ میں تو تم سے بڑے کاموں کی توقع رکھتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں تم اچھے نمبروں سے پاس ہو اور ایک کامیاب انسان بنو۔ خوب دولت کماؤ۔ پھر ہم چنگریانگی بازار سے جلانے کے لیے اچھی لکڑی خریدیں گے۔ پھر ہم لکڑی کے لٹھے خریدیں گے اور آری سے ان کے بڑے بڑے ٹکڑے کاٹیں گے اور گودام میں رکھیں گے۔ پھر ایسی برفباری میں بھی ہمیں سردی نہیں لگے گی۔''

''ماما اس وقت تو مجھے کام کرنے دیجیے۔ آئندہ کی آئندہ دیکھی جائے گی۔'' میرے بھائی نے کہا۔ میں بڑا ہو گیا ہوں آپ کو اس طرح منڈی جاتے دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔''

''اچھا بیٹے مجھے ایک بات بتاؤ۔ تمہاری ماں کو یہ اچھا لگے گا کہ معمولی سے کام کے لیے اپنے بیٹے کو بھیجے۔ تمہیں تو بڑے بڑے کام کرنا ہیں۔'' میری ماں نے اسے جواب دیا۔ اور اسے ان کی بات ماننا ہی پڑی۔

ایک دن بہت ہی شدید سردی پڑ رہی تھی تو ماما سڑک پر پھسل گئیں۔ وہ لکڑیوں کا گٹھا سر پر اٹھائے آ رہی تھیں۔ گھر آئیں تو ان کا برا حال تھا۔ بظاہر تو ان کے کہیں چوٹ نظر نہیں آ رہی تھی مگر ان کی کلائی سوج گئی تھی اور بہت درد ہو رہا تھا۔ ہم پریشان ہو گئے۔

رات بھر وہ کراہتی رہیں جس سے میں اور میرا بھائی سو ہی نہ سکے وہ اپنی آواز دبانے کی بہت کوشش کر رہی تھیں۔ مگر ان کے کراہنے کی آواز برابر آ رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے اچانک ایک مضبوط ستون میں شگاف پڑ رہے ہوں۔

لیکن صبح کو وہ پھر اپنے کاموں میں لگ گئیں۔ وہ خوش نظر آتی تھیں۔ مگر لگتا تھا کہ انہیں تکلیف ہے۔ جو بوڑھی عورت سلائی کے لیے کپڑے لا کر دیتی تھی اس سے انہوں نے کہا کہ جو کپڑے ابھی نہیں سلے ہیں وہ واپس لے جائے۔ اس عورت نے ماما کی سوجی ہوئی کلائی دیکھی تو پریشان ہو گئی۔ اس نے ماما کو اوپنکچر کرنے والے بہت سے لوگوں کے نام بتائے لیکن ماما نے اس کی کوئی بات نہیں سنی۔

''دیکھ لو' میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' ماما بولیں۔ ''میں اپنا ہاتھ پہلے سے زیادہ اچھی طرح

MashalBooks.com

استعمال کر سکتی ہوں۔''

وہ عورت چلی گئی' مگر وہ پھر آئی تو اس کے پاس چنبیلی کے پتے تھے۔

''تمہارے لیے یہ چیز لائی ہوں۔'' بوڑھی عورت نے کہا۔ ''اس کی پلٹس بنالو اور اسے کلائی پر باندھ لو۔ اس سے سوجن کم ہو جائے گی۔'' اس سے اچھی چیز اور کوئی نہیں ہے۔''

''صرف سوجن کم ہو جانے سے کیا ہوگا؟'' ماما بڑبڑا رہی تھی۔

''ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جڑ جائیں گی۔ اس کے لیے سنگول ضروری ہے۔ یہ عورت تو کوئی ایسا کام کام نہیں کرے گی جس میں پیسہ خرچ ہوتا ہو۔ ہاں' اپنے بچوں کے لیے خرچ کر لے گی۔ وہ یہ کیوں نہیں سمجھتی کہ اپنے بچوں کی خاطر ہی وہ اپنا علاج کرالے۔''

میرے بھائی نے بھی اس عورت کی یہ بڑبڑ سنی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ عورت کہاں رہتی ہے۔ ہم ماما کو بتائے بغیر اس عورت کے گھر چلے گئے۔ بھائی نے اس عورت سے پوچھا کہ سنگول کیا ہوتا ہے اور کہاں ملتا ہے؟۔

''تمہاری ماں نے تمہیں یہاں بھیجا ہے؟'' عورت نے پوچھا

میرے بھائی نے سر ہلا دیا۔

''میں جانتی تھی تم اچھے بچے ہو۔ تم اپنی ماں کے لیے صحیح کام کر رہے ہو۔ تم جیسے بچے ہی تو کسی گھر میں خوش قسمت ہوتے ہیں اگر کسی کے پاس سونے کی کانیں بھی ہوں اور بچہ کوئی نہ ہو تو ایسی زندگی کس کام کی۔'' اس عورت نے اس طرح اپنی داستان شروع کی۔

یوں تو اس کی کہانی ناقابل یقین معلوم ہوتی تھی مگر وہ تھی' بہت دلچسپ جیسے کوئی اساطیری کہانی ہو۔ بہرحال میں اور میرا بھائی اساطیری دنیا میں داخل ہو چکے تھے۔ جب تمام امیدیں ختم ہو جائیں اور انسان بالکل ہی اکیلا ہو اور نہیں جانتا ہو کہ اس کی منزل کہاں ہے تو وہ اساطیری داستانوں کی دنیا میں چلا جاتا ہے۔ وہ دنیا دونوں ہاتھ پھیلائے اس کا استقبال کرتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ اس دروازے میں داخل ہو اور طلسمی دنیا کا حصہ بن جاؤ۔

اس عورت نے بتایا کہ سنگول اس غار میں ملے گا جو ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس نے کہا پورے کوریا میں یہی ایک غار ہے جہاں سنگول ملتا ہے۔ وہ غار اور کچ پہاڑی میں تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ دوا لوہے کی رنگ کی ہوتی ہے اور باجرے کے دانے سے چھوٹی ہوتی ہے۔ خیال

رہے کہ اسے چوکور ہونا چاہیے اور اس پر کوئی دھبہ نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایسا ہوا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس نے کہا کہ دکاندار اچھے دانے ہی دکان پر رکھتے ہیں۔ پھر بھی خریداروں کو اچھی طرح دیکھ لینا چاہیے۔

اس عورت نے اصرار کیا کہ سنگول جادو کا اثر رکھتا ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک آدمی کی ہڈی سنگول سے جوڑی گئی تھی۔ وہ مرا تو اسے دفن کرتے وقت لوگوں نے دیکھا کہ اس کی ہڈیوں سے دھات کے ذرے نکل رہے ہیں۔ دھات کے یہ ٹکڑے ہڈیوں کے ساتھ ایسے جڑ گئے تھے کہ کوئی انسان انہیں علیحدہ نہیں کر سکتا تھا۔

چونکہ میں اور میرا بھائی دونوں اساطیری داستانوں پر اعتبار کرتے تھے اس لیے ہم نے اس عورت کی اس بات پر یقین کر لیا کہ دھات کے یہ ٹکڑے اگر کھا لیے جائیں تو وہ سیدھے ٹوٹی ہوئی ہڈی تک پہنچ جائیں گے اور وہ اسے جوڑ دیں گے۔

''یہ بہت مہنگی چیز ہے؟۔'' میرے بھائی نے پوچھا۔

''مہنگی؟ نہیں۔ اس پر زیادہ خرچ نہیں ہوگا۔ یہ تو مٹی یا ریت کی طرح قدرتی چیز ہے اسے صرف وہ لوگ ہی استعمال نہیں کرتے جو ہسپتال سے مایوس ہو جاتے ہیں بلکہ وہ لوگ بھی استعمال کرتے ہیں جن کے پاس دواؤں کے لیے پیسہ ہی نہیں ہوتا۔''

''چلو۔'' میرے بھائی نے کہا۔

میں اور میرا بھائی سنبھل سنبھل کر دوا چکے پہاڑی پر چڑھے۔ پہاڑی پر برف پڑی ہوئی تھی۔ جاڑوں کے موسم میں اوپر چڑھنا انتہائی مشکل تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ وہ پہاڑی ہمارے گھر کے قریب تھی۔ مگر اس پر چڑھنا ایسا تھا جیسے بارہ اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھنا۔ لیکن ہم تو جیسے جادو کا پہاڑ سر کرنے جا رہے تھے اس کی ہمیں پرواہ نہیں تھی۔

چلتے چلتے کئی بار ہمیں راستہ پوچھنا پڑا۔ آخر پہاڑی کے بیچ میں پہنچ گئے۔ دن کا وقت تھا مگر موم بتی کے بغیر اندر کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ غار کے اندر ہم نے دیکھا کہ چٹان کے ساتھ ایک پردہ سا ہے۔ اور وہ غار فوجی مورچے یا پہاڑی گپھا کی طرح نہیں تھا۔ پورا غار چمکتی ہوئی دھات تھا جیسے موزیک چمکتی دھات کے ذرے ہوا میں اڑ رہے تھے جس سے موم بتی کی لو جھلملانے لگی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں طلسمی دنیا میں پہنچ گئی ہوں۔

MashalBooks.com

غار کا مالک ایک نوجوان تھا جس نے سوتی ''دور کی'' (مردانہ کوٹ) پہنا ہوا تھا۔ اگر وہ بوڑھا آدمی ہوتا تو میں اور میرا بھائی اسی کے پیروں پر گر جاتے اور التجا کرتے کہ ہماری ماں کی ٹوٹی ہوئی کلائی کے لیے تھوڑی سی وہ جادوئی دوا دیدے۔ مگر وہ نوجوان تھا اس نوجوان نے ہمارے تخیل کو اور بھی پر لگا دیے اور ہم اسے ایسے دیکھنے لگے جیسے کسی داستانی کردار کو دیکھ رہے ہوں۔ ان عام انسانوں کے مقابلے میں جن سے ہمارا ہر روز واسطہ پڑتا ہے وہ نوجوان بہت ہی دبلا پتلا تھا۔ اپنے بے نیاز انداز سے وہ کوئی روحانی شخصیت معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اپنے بھائی کا اس سے مقابلہ کیا تو مجھے لگا کہ میرا بھائی اب بڑا ہو گیا ہے۔

میرے بھائی نے احترام میں سر جھکایا اور پھر اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ اس آدمی نے ایک ٹرے اٹھائی اور سنگول اکٹھے کرنا شروع کر دیے۔ بوڑھی عورت نے کہا تھا کہ غار سنگول کا خزانہ ہے مگر ہر سنگول کام کا نہیں ہوتا' کام کے سنگول کو مستطیل ہونا چاہیے اور اس کے کونے سیدھے ہوں اور اس پر کوئی داغ دھبہ نہو۔ اسی صورت میں وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے لیے کارآمد ہو سکتا ہے۔ البتہ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ سنگول سیدھا ٹوٹی ہوئی ہڈی تک جائے گا اور اسے جوڑ دے گا۔

وہ آدمی جس طرح سنگول اکٹھے کر رہا تھا وہ ایسا تھا جیسے کوئی متبرک چیز جمع کر رہا ہو۔ اس نے وہ چھوٹی سی ٹرے سامنے رکھی اور پھر پرستش کرنے کے انداز میں اس کے سامنے دوزانو ہو گیا۔ وہ آنکھیں بند کیے اس طرح جھکا جا رہا تھا جیسے اونگھ رہا ہو۔ اس کے بعد وہ اٹھا اور ایک پیالے میں سے چند سنگول اٹھائے اور انہیں سفید کاغذ میں لپیٹ دیا۔ ایک تو وہ بہت ہی دبلا پتلا تھا دوسرے وہ جیسے کھوئے کھوئے انداز میں کام کر رہا تھا اس سے وہ کچھ اور بھی پہنچا ہوا روحانی انسان نظر آ رہا تھا مجھے لگا کہ وہ اپنی جسمانی آنکھوں کے بجائے روحانی آنکھ سے دیکھ کر سنگول چن رہا ہے۔ وہ پوری توجہ کے ساتھ اپنا کام کر رہا تھا۔

میں نے اپنے بھائی کو دیکھا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے احتراماً سر جھکائے کھڑا تھا میں بھی اسی طرح کھڑی ہو گئی۔

''شروع میں آپ کو میں دس خوراک دوں گا۔'' اس نے الگ الگ دس کاغذوں میں ایک ایک دن کی خوراک کر کے انہیں لپیٹا۔

''بچو' ادھر آؤ۔'' آدمی نے کہا۔'' اور پہاڑی دیوتا کو ہدیہ تبریک پیش کرو۔ دیوتا سنگول کو آشیرواد دیں گے اور اسے علاج کی طاقت عطا کریں گے۔''

غار کے بہت اندر جا کر دو موم بتیاں جلائی گئیں۔ پتھر کی ایک بڑی سل پر ایک کاغذ پھیلایا گیا۔ اس کاغذ پر پہاڑی دیوتا کی مورتی بنی ہوئی تھی۔ اس سل پر مختلف سکے بکھرے پڑے تھے اور اس کے سامنے بدھ مت کی پوجا کا برتن اور پانی سے بھرا ایک پیالہ رکھا ہوا تھا۔

''آؤ بچو' اس آدمی نے کہا'' دیوتا کے آگے سر جھاؤ۔ اگر تم دوا کے لیے رقم لائے ہو تو وہ یہاں چڑھاؤ۔ یاد رکھو جو مانگنا ہے اس دیوتا سے مانگو۔ آؤ اس طرح کرو۔'' وہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

اس کی تقلید میں میرے بھائی نے کئی بار سر جھکایا۔ میں اپنے بھائی سے بہت پیار کرتی تھی مگر اس وقت اس کی اس حرکت میں شریک نہیں ہوئی۔ ہماری عمروں میں بہت فرق تھا اس لیے میں اس کا حترام کرتی تھی۔ وہ مجھ سے دس سال بڑا تھا۔ لیکن یہاں بڑا چھوٹا ہونے کی بات نہیں تھی میں تو اس کی ایمان داری سے بہت مرعوب تھی۔ وہ بہت ہی غیر معمولی انسان تھا۔ اس کی توہم پرستی کو اس کی ذہانت اور خود اعتمادی کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا جا سکتا۔ یہی اس کی خوبی تھی غریب آبادی میں عام آدمی کے ساتھ میل جول سے اس میں اور بھی پختگی آ گئی تھی۔ فخر سے میرا سینہ پھول جاتا تھا۔ جیسے میرے کپڑوں پر بیش قیمت جواہرات لگے ہوں۔

میرے لیے اس بھائی کی یہ قدر و قیمت تھی۔ اب میں اسے انکساری کے ساتھ بار بار دیوتا کی تصویر کے سامنے جھکتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میں تھی تو بچی مگر مجھے یہ حرکت بہت بری لگ رہی تھی۔ پھر بھی میں نے اس کے ساتھ جھک جھک کر دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔

اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ میرے بھائی نے کتنی رقم دیوتا کی بھینٹ چڑھائی البتہ اس کی عقیدت مندی سے وہ آدمی پوری طرح مطمئن ہو گیا تھا۔

''میں نے تمہیں بتایا کہ دس دن اپنی ماں کو یہ خوراک دینا۔'' اس آدمی نے کہا۔'' تم جس طرح ان کا خیال کر رہے ہو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جلدی صحت یاب ہو جائیں گی' دس دن سے زیادہ تمہیں انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ اس دوا میں روحانی طاقت بھی ہے۔''

اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہماری ماما سنگول دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئیں۔ وہ تو

MashalBooks.com

کلائی ٹوٹنے سے پہلے سے بھی زیادہ خوش تھیں۔ دسویں دن انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ ٹھیک ہو رہی ہیں۔ روز بروز سوجن کم ہو رہی تھی۔

لیکن ہمارے خیال میں ان کی کلائی کی شکل بگڑ چکی تھی۔ ماما ہمیں سمجھاتی تھیں کہ کلائی میں ہڈی کے جو ٹکڑے نظر آ رہے ہیں وہی اسے ٹھیک کر رہے ہیں اس لیے کلائی عجیب و غریب نظر آ رہی ہے۔ ہمیں یقین دلانے کے لیے انہوں نے اپنا کام بھی شروع کر دیا۔ وہ پھر کپڑے سینے لگیں۔ وہ کہتی تھیں کہ ان کی ہڈی اب پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے وہ ہمارے سامنے بھاری چیزیں اٹھا لیتی تھیں۔ وہ بازار سے ایندھن کی لکڑیاں بھی لا رہی تھیں۔ میرا بھائی ان کی خوشامد کرتا تھا کہ اگر یہاں آنے سے پہلے وہ یہ کام نہ کریں۔ مگر وہ اس کی نہیں سنتی تھیں۔

''بیٹے' میری فکر نہ کرو اب اگر میں پھسل کر گری تو دائیں ہاتھ پر زور دوں گی۔ وہ مجھے بچا لے گا۔ تم دیکھتے نہیں میرا دایاں ہاتھ تو فولاد کی طرح مضبوط ہے۔'' بدشکل کلائی کے باوجود وہ ایسی باتیں کرتی رہتی تھیں۔''

دوسرے دن ماما کو آپریشن کے لیے لے جایا جا رہا تھا تو ان سے کہا گیا کہ اپنی بتیسی منہ سے نکال دیں۔ دانتوں کے بغیر وہ نیا پیدا ہونے والا بچہ لگ رہی تھیں۔ وہ نوے سال کے قریب تھیں اور بہت ہی نازک آپریشن ہونے والا تھا۔ اس کے باوجود وہ معصوم بچے کی طرح مسکرا رہی تھیں۔ ان کے اس اعتماد نے مجھے اور بھی افسردہ کر دیا۔

فلموں اور ٹی وی ڈراموں میں دکھایا جاتا ہے کہ آپریشن سے پہلے ڈاکٹر مریض کے رشتے داروں سے بات کرتے ہیں۔ ایسے منظر بہت ہی دردناک ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر ڈاکٹر بہت ہی ہمدرد اور رحم دل نظر آتے ہیں۔

اور انسان کو یہ تسلی ہوتی ہے کہ مریض کسی بے حس مشین کے بجائے رحم دل انسان کے ہاتھ میں ہے۔ اس صورت میں بھی مریض کے رشتے دار اس کی صحت یابی کی ضمانت چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر ان کے جذبات کا خیال رکھتا ہے اور انہیں تسلی دیتا رہتا ہے۔

ٹی وی ڈراموں کے ان مناظر کے مطابق میں بھی ڈاکٹر ہانگ کے ساتھ اسی قسم کا تعلق رکھنے کی امید کر رہی تھی۔ ماما صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ ہی تھیں۔ زمانہ پہلے ان کی جوانی کے تمام آثار ختم

ہو چکے تھے۔ پھر بھی وہ عورت تھیں انہیں کسی ہاتھ میں تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اس لیے میرا ڈاکٹر سے بات کرنا ضروری تھا۔ مجھے اس کی مدد کی ضرورت تھی۔

اتنے بڑے ہسپتال کا آپریشن تھیٹر بھی پورا فوجی میدان تھا۔ اس فوجی میدان میں روزانہ بیس سے تیس آپریشن کیے جاتے تھے کارخانوں کی طرح یہاں ہر کام مشینی انداز میں کیا جاتا تھا۔ ایک مریض کو اسٹریچر پر ڈال کر اندر لایا جاتا اور آپریشن کے بعد اسے باہر نہیں دیا جاتا۔ ماما کو بھی اس کمرے میں پہنچایا گیا۔ اس سے پہلے کئی آدمیوں نے انہیں تیار کیا تھا۔ ان آدمیوں میں سے کوئی بھی ایسا با اختیار نہیں تھا جس سے میں ماما کے بارے میں بات کر سکتی۔ سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ آپریشن کے کمرے میں رشتے داروں کو بھی جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اب چونکہ اس کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی اس لیے میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس سے بات کروں۔ میں سوچ رہی تھی کہ آپریشن کرنے والا ڈاکٹر کمرے کے اندر ہی رہتا ہے یا کسی دوسرے دروازے سے اندر جاتا ہے۔ میں دروازے کے قریب ہی گھومتی رہی۔ ڈاکٹر ہانگ تو کیا مجھے تو وہاں کوئی ڈاکٹر ہی نظر نہیں آیا۔ میں بہت گھبرائی ہوئی تھی اور چاہتی تھی کہ آپریشن سے پہلے ڈاکٹر سے بات کر لوں۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ جب مریض آپریشن کے لیے چلا جائے تو پھر مریض اور ڈاکٹر کے درمیان باہمی اعتماد کا مسئلہ ہی ہوتا ہے۔ اور یہ اعتماد کسی کاغذ پر دستخط کرنے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

آپریشن کے کمرے میں جانے سے پہلے ماما بالکل پریشان نہیں تھیں بلکہ وہ خوش دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کے اس صحت مندانہ رویے سے مجھے بہت تسلی ہوئی حالانکہ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی مطمئن کیسے ہیں۔ شاید ان کے لیے یہ آپریشن بھی سنگول کھانے کی طرح ہی تھا۔ میری ماں خاصی مذہبی انسان تھیں۔

لمبا چوڑا آپریشن روم اُلٹے انگریزی حرف L'' کی طرح بنا ہوا تھا۔ کمرے کے آخر میں آنے جانے کا راستہ تھا۔ لیکن دروازے میں سے کوئی اندر نہیں جھانک سکتا تھا۔ باہر نکلنے کے دروازے کے ساتھ ہال میں مریضوں کے رشتہ دار بیٹھے ہوئے تھے۔ سب پریشان تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان ماں اپنے شوہر کے کاندھے پر سر رکھے رو رہی تھی۔ اس کا بچہ آپریشن روم میں لے جایا گیا تھا۔ ایک بوڑھی عورت ہاتھ میں مالا لیے بدھ مذہب کے شلوک پڑھ رہی

MashalBooks.com

تھی۔ اس کا جوان بیٹا آپریشن روم میں تھا۔ باہر بیٹھے ہوئے رشتہ داروں کو تسلی دینے کے لیے تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک نرس باہر آتی تھی۔ پھر وہ دیوار پر لگی فہرست پر کچھ نشان لگاتی یہ نشان ان مریضوں کے نام پر لگائے جاتے جو آپریشن کے بعد ریکوری روم میں چلے جاتے تھے۔ ایک گھنٹہ وہاں گذارنے کے بعد انہیں باہر لایا جاتا تھا۔ یعنی وہاں کا طریقہ تھا۔ جب بھی کوئی مریض باہر آتا تو اس کے رشتے دار ہی نہیں باقی تمام لوگ بھی اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے اور اس کی خیریت معلوم کرتے۔

آپریشن روم کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر باہر آیا۔ اس کے منہ پر ماسک تھا اس لیے صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے آہستہ سے بائیں کان پر سے کا ماسک کی ڈوری ہٹائی۔ اب ماسک ایک کان سے لٹک رہا تھا۔ وہ بہت ہی تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ لیکن مسکرا رہا تھا۔ اس مسکراہٹ سے اس کی کامیابی ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے ایک خاندان سے کہا۔ ''آپریشن کامیاب رہا ہے۔'' یہ سن کر اس خاندان کا لوگوں نے جھک کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ جذبات کی شدت سے ان کے آنسو نکل آئے تھے۔ البتہ یہ منظر میں نے دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں میں نہیں دیکھا۔ یہ لوگ اندر جانے والے اور باہر آنے والے مریضوں کو دیکھ رہے تھے۔

دیوار پر لٹکتی ہوئی فہرست میں مریضوں کی صنف اور عمر بھی لکھی ہوئی تھی۔ ماما سب سے بڑی تھیں۔ ان کی عمر اٹھاسی سال تھی۔ ان کے بعد سب سے معمر مریض ستاون سال کا تھا۔ عمر کے اس فرق کو دیکھتے ہوئے ماما کا آپریشن ایک قسم کی مہم جوئی معلوم ہوتی تھی۔ ماما صبح نو بجے آپریشن کے کمرے میں گئی تھیں۔ دیوار پر لٹکنے والی فہرست کے مطابق ایک بجے انہیں ریکوری روم میں لے جایا گیا تھا۔ اس بعد کیا ہوا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں جب بھی دروازہ کھلتا اور مریض کو باہر لایا جاتا تو میں جلدی سے اٹھ کر اس کے پاس جاتی کہ کہیں ماما تو نہیں ہیں۔ میں گھبرائی ہوئی تھی، تھکی ہوئی تھی اور بھوکی تھی۔ میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ پھر بھی میں کمرے کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتی رہی۔

''آنٹی، آپ کے رونے سے دادی کا آپریشن ایک معمولی مرہم پٹی تو نہیں بن جائے گا۔'' میرے بھتیجے نے میرا مذاق اڑایا۔ اس کا مذاق مجھے اچھا نہیں لگا۔ مگر ان کی موجودگی سے مجھے تسلی ہو رہی تھی۔ وہ ایسے ستون تھے جن کا میں سہارا لے سکتی تھی۔

آخر ماما کو اسٹریچر پر باہر لایا گیا۔ ہمیں پہچان کر انہوں نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ کہا۔ دانتوں کے بغیر وہ اور بھی کمزور نظر آ رہی تھیں۔ ہسپتال کی سفید چادر سے ان کا جسم پوری طرح ڈھکا ہوا نہیں تھا۔ میں نے ان کا ننگا کاندھا دیکھا تو مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے فوراً چادر کاندھے تک ٹھیک کر دی۔ لیکن ان کے ہاتھ پر اتنی بہت سی ٹیوب لگی ہوئی تھیں کہ پوری طرح چادر اوڑھانا مشکل تھا۔ چادر کے نیچے ماما ننگی تھیں اور وہ بری طرح کانپ رہی تھیں۔

''آپ کو سردی لگ رہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں نہیں۔ میں تو یونہی کانپ رہی ہوں۔'' انہوں نے کہا خاندان کے دوسرے لوگوں نے انہیں باتیں کرتے سنا تو وہ بھی ان کے پاس آ گئے اور سوال کرنے لگے۔

''آپ مجھے پہچانتی ہیں دادی؟'' میرے بڑے بھتیجے نے کہا۔

''تم سیوک کے باپ ہو میں تمہیں بھی نہیں پہچانوں گی۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''دادی دادی۔ اور میں کون ہوں؟''

''تم سیوک کی ماں۔''

''میں کون ہوں؟'' چھوٹے بھتیجے نے پوچھا۔

''کیونگاہ کا باپ ہے۔''

ماما خاندان کے اس امتحان میں کامیاب ہو گئیں میری طرف دیکھا تو فخر سے مسکرائیں۔ وہ ابھی ابھی آپریشن روم سے باہر آئی تھیں اور ان کی مسکراہٹ مجھے ڈراؤنی سی لگ رہی تھی۔ ہسپتال کے دو لمبے تڑنگے آدمیوں نے ماما کے بستر کو دھکیلنا شروع کیا۔ ہم سب بھی ان کے ساتھ چلنے لگے۔ ہماری باتیں اب بھی جاری تھیں۔ ہم جلد ہی ہال سے باہر آ گئے اور لفٹ کے دروازے کے پاس پہنچ گئے ان کی باتوں سے ہم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آپریشن کامیاب رہا ہے۔ لفٹ میں سوار ہونے کے بعد ہم نے ماما پر زیادہ توجہ نہیں دی۔

''میں تو تھک کر چور ہو گیا ہوں۔ آج میں خوب سوؤں گا۔''

میرے بڑے بھتیجے کے کہا۔

''بھوک سے میرے پیٹ میں مروڑ ہو رہی ہے۔ دوپہر میں نے جو کھانا کھایا تھا وہ کب کا ہضم ہو گیا ہے۔ کیا خیال ہے کیفے ٹیریا میں گائے کے گوشت کا سوپ نہ پیا جائے؟'' میرے

MashalBooks.com

چھوٹے بھتیجے نے اپنے بڑے بھائی سے کہا۔

''آج رات ہسپتال میں رہنے کی کس کی باری ہے؟'' کسی نے کہا۔

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔''انستھیزیا کا اثر ختم ہونے کے بعد تمہاری دادی کو بہت درد ہوگا۔ آج رات میں ان کے ساتھ رہوں گی۔ تم گھر جاؤ اور آرام کرو۔''

''اچھا آنٹی۔ بہت بہت شکریہ آپ کا۔ آج ہم یہ آپ پر چھوڑتے ہیں۔ کل صبح ہی صبح میں اپنی بیوی کو یہاں بھیج دوں گا۔ پھر وہ یہاں رہے گی۔ شکریہ آپ کا۔''

''ہمیں اپنی دادی کی ہمت کی داد دینا چاہیے۔ اتنے بڑے آپریشن کے بعد بھی وہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔''

''تم بہت ہی ناشکرے ہو۔'' میں نے انہیں ڈانٹا۔'' کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ ہوش میں نہ آئیں؟۔ تم نے دیکھا نہیں کتنی دیر انہیں ریکوری روم میں رکھا گیا تھا۔ باقی مریض تو ایک گھنٹے بعد باہر آ گئے تھے۔ تمہاری دادی تین گھنٹے وہاں رہیں جب کہیں جا کر انہیں ہوش آیا۔ اور باہر آئیں''

''نہیں بیٹی'' یہ ماں بول رہی تھی۔'' میں تو فوراً ہی جاگ گئی تھی۔ جاگتے ہی میں نے شور مچایا دیا تھا کہ مجھے میرے بچوں کے پاس لے جاؤ۔ مگر کسی نے سنا ہی نہیں۔ پتہ نہیں کیا ہوا تھا مجھے۔ میں بری طرح کانپ رہی تھی۔ میں نے انہیں متوجہ کرنے کی بہت کوشش کی مگر کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ میں انستھیزیا سے باہر آ گئی تھی مگر ایسا لگا جیسے میرا گلا بند ہو گیا ہے۔ میری آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ یہ آپریشن روم والے بھی بڑے بے درد ہوتے ہیں۔''

ماما ہسپتال کے بستر پر لپٹ گئیں تو ہم لوگ پھر خوشی خوشی باتیں کرنے لگے۔ ہماری باتوں میں ماما بھی شامل ہو جاتی تھیں۔ میں ماما کی خود اعتمادی سے پریشان ہو گئی تھی اور چاہتی تھی کہ انہیں ان کی بیماری کا احساس دلاؤں۔ دانتوں کے بغیر ان کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ وہ ایسے بول رہی تھیں جیسے بیہوشی کی حالت میں بول رہی ہوں۔ مجھے اپنے بھتیجوں اور ان کی بیویوں کے سامنے شرم آ رہی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ اتنے بڑے آپریشن کے بعد ماما کو یہ ظاہر کرنا چاہیے کہ ان کی حالت بہتر، خراب ہے۔ اپنی شرمندگی سے بچنے کے لیے میں نے بھتیجوں اور ان کی بیویوں

کو گھر بھیج دیا۔

''آپ لوگ گھر کیوں نہیں چلے جاتے؟''۔ میں نے کہا۔'' تم تو ماما سے بھی زیادہ تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ جاؤ۔ کچھ کھاؤ اور سو جاؤ۔ میرا خیال ہے، تمہارے جانے کے بعد وہ آرام سے سو جائیں گی وہ اپنے آپ کو ٹھیک سمجھ رہی ہیں بہر حال ہمیں اپنے آپ کو صحت مند رکھنا چاہیے تا کہ ان کی دیکھ بھال کر سکیں۔''

ان کے جانے کے بعد بھی ماما کی بڑبڑاہٹ اسی طرح جاری رہی۔ ایسا لگتا تھا جیسے گائے جگالی کر رہی ہو۔ وہ تھک ہی نہیں رہی تھی۔ ان کی اس حرکت سے مجھے چڑ ہونے لگی تھی۔ وہ مسلسل اپنی طاقت ضائع کر رہی تھیں۔

شام کو ڈاکٹر ہانگ ماما کو دیکھنے آئے۔ ان کے ساتھ طلبہ اور چھوٹے ڈاکٹر بھی تھے۔ یہ ان کے راؤنڈ کا وقت نہیں تھا۔ وہ صرف ان مریضوں کو دیکھنے آئے تھے جن کا اس دن آپریشن ہوا تھا۔ لیکن وہ آندھی طوفان کی طرح آئے اور ویسے ہی چلے گئے۔ وہ ہوا کی طرح ہی تھے ان کے اندر انسانی جذبات کا شائبہ تک نہیں تھا۔

میں ڈاکٹر ہانگ کی تعریف کرنے کے لیے پہلے سے تیار تھی کہ انہوں نے ماما کا کامیاب آپریشن کیا تھا۔ لیکن مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں صرف اتنا کر سکی کہ ان کے پیچھے پیچھے ہال سے باہر تک گئی۔ میں نے صرف ماما کی حالت کے بارے میں پوچھا۔

''آپریشن کامیاب رہا۔ لیکن انہیں بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر ہانگ کے ساتھ یہ میری سب سے طویل بات چیت تھی۔ میں ان سے اتنی مرعوب ہو گئی تھی کہ اس کے بعد کوئی اور بات ہی نہ کر سکی۔ لیکن ان کی بات سے مجھے اطمینا بھی نہیں ہوا تھا۔

نرسیں اور چھوٹے ڈاکٹر برابر آتے جاتے رہے اور ان کے ہاتھ میں ٹیوب لگاتے رہے۔ مجھے یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ ان کی حالت پر مسلسل نظر رکھوں۔ میری یہ بھی ذمہ داری تھی کہ میں ان کے کھانسنے اور بلغم تھوکنے کا بھی خیال رکھوں اور نرس کو بتاؤں کہ ان کے زخم سے جو خون نکل رہا ہے اس سے پلاسٹک بیگ بھر گیا ہے۔ اور یہ بھی کہ انہوں نے پیشاب کتنا کیا۔

میں نے چھوٹے ڈاکٹروں سے وہ ساری باتیں پوچھیں جو میں بڑے ڈاکٹر سے نہیں پوچھ سکی تھی۔ ان کا جواب بھی وہی تھا جو ڈاکٹر ہانگ کا تھا۔ ان سب کا یہ بھی کہنا تھا کہ ماما بہت بوڑھی ہیں

MashalBooks.com

انہیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔اس سے زیادہ کسی نے کچھ نہیں بتایا۔

ماما کو اس بات پر اعتراض تھا کہ انہیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھانس کر بلغم نکالنا چاہیے۔لیکن جب بھی ان کے حلق میں بلغم جمع ہو جاتا تو انہیں اینٹھن سی ہونے لگتی۔اس سے میں گھبرا جاتی۔ میں نے انہیں کئی بار سمجھایا کہ بلغم نگلنے سے نمونیہ ہو سکتا ہے مگر وہ نہیں مانیں۔وہ توقف کے بغیر بولے چلی جاتی تھیں۔اب ان کی آواز انسانوں کی آواز نہیں لگتی تھی۔ایسا لگتا تھا جیسے ہوا میں پیٹر کا پتہ ہل رہا ہے۔

''ماما' سونے کی کوشش کیجیے۔'' میں نے پریشان ہو کر ان سے کہا۔انہوں نے مجھے دیکھا۔ ان کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔مجھے فکر ہو گئی جس طرح وہ دیکھ رہی تھیں اس سے مجھے جھرجھری آ گئی۔

''بتی بجھا دوں؟'' میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''نہیں نہیں۔'' ماما نے ایسے کہا جیسے وہ سر ہلا رہی ہوں۔

''میں آپ کی آنکھیں بند کر دوں۔آپ سونے کی کوشش کیجیے۔آپ کسی بات کی فکر نہ کیجیے۔'' میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے نرمی کے ساتھ ان کی آنکھیں بند کیں۔ماما نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے کھینچ لیا۔وہ ایک منٹ کے لیے بھی چین سے نہیں لیٹ رہی تھیں۔

''ماما درد ہو رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔''آج رات گزار لیجیے کل سب ٹھیک ہو جائے گا۔اگر درد ہو رہا ہو بتا دیجیے میں نرس سے کہتی ہوں وہ ٹیکہ لگا دے گی۔''

''نہیں نہیں میرے درد نہیں ہو رہا ہے۔بس مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔''

''میں آپ کو نیند کی گولی دے دوں؟''

انہوں نے جواب نہیں دیا تو میں نرس کے پاس گئی اور ماما کی کیفیت بیان کی۔ہیڈ نرس میری بات سمجھ گئی اس نے مجھ سے کہا تم ماما کے پاس جاؤ تھوڑی دیر میں ہاؤس جاب کرنے والا نوجوان ڈاکٹر چھوٹی سی گولی لے کر آیا۔اس نے کہا کہ کمرے میں اندھیرا کر دو۔میں نے ماما کو گولی کھلائی اور بتی بجھا دی۔صرف ہلکی سی روشنی رہنے دی۔اب ماما نے کچھ نہیں کہا۔اس تسلی کے بعد کہ ماما پر جلد ہی گولی کا اثر ہو جائے گا میرے اوپر بھی غنودگی طاری ہو گئی۔میں نے ماما کے ہاتھ میں لگے ٹیوب کا جائزہ لیا اور پھر ٹیبل بستر پر گر گئی۔

میں گہری نیند میں تھی کہ اچانک کمرے میں کچھ گڑبڑ سی محسوس ہوئی۔گھبرا کر میں اٹھ بیٹھی۔ میں نے دیکھا ماما ہوا میں ہاتھ گھما رہی ہیں۔ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کا ہاتھ خود بخود ہل رہا ہے۔ مجھے ٹھنڈے پسینے آ گئے۔میں نے بتی جلائی اچانک روشنی ہو جانے سے ماما کی آنکھیں چندھائیں مگر ان کا ہاتھ اسی طرح ہلتا رہا۔

''ماما' یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔'' میں نے بچوں کی طرح پوچھا۔

''تمہیں نہیں معلوم میں کیا کر رہی ہوں؟ کپڑے دھل جائیں تو تم اپنی قمیص وہاں رکھ دینا جیسے تم اپنا انڈرویئر رکھتی ہو۔اور روزی کا کیا ہو گا؟ انہیں ایک ایک کر کے رکھنا ہو گا۔تمام چیزیں ایک ہی جگہ رکھنا ضروری نہیں۔'' ماما کی آواز بہت صاف تھی اور وہ زور زور سے بول رہی تھیں۔

''کپڑوں کی دھلائی؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' میں نے کہا۔''آپ سو جایئے۔''

''میں کیسے سو سکتی ہوں۔میرے سامنے تو یہ انبار ہے۔'' تمہیں تو پروا ہی نہیں ہے۔'' ماما نے کھنک دار آواز میں کہا۔ان کی آنکھوں کی نیلاہٹ اور گہری ہو گئی تھی۔اور وہ عجیب سی نظر آ رہی تھیں۔اچانک میرا جی چاہا کہ بھاگ کر کسی کو بلا لاؤں۔ماما کا ہاتھ اسی طرح چل رہا تھا جیسے وہ کپڑے دھو رہی ہوں۔میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کے اندر اتنی طاقت کہاں سے آ گئی ہے حالانکہ انہوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔وہ نیند کی گولی کے اثر میں تھیں اور پھر ان کا آپریشن بھی ہوا تھا۔میں اتنی گھبرائی کہ میرے پاؤں کانپنے لگے۔مگر اسی وقت نرس آ گئی۔

''میری ماں عجیب حرکتیں کر رہی ہیں۔'' میں نے اسے بتایا۔''وہ خواہ مخواہ اپنے ہاتھ لہرا رہی ہیں شاید انہیں کچھ نظر آ رہا ہے۔''

''انستھیزیا کا اثر کم ہونے لگتا ہے تو کچھ مریض ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔تسلی رکھو' یہ ٹھیک ہیں۔'' نرسوں نے بے نیازی سے جواب دیا۔پھر اس نے ماما کا ٹمپریچر چیک کیا اور ان کی نبض دیکھی اور چلی گئی۔میں اس کے پیچھے پیچھے گئی اور اسے کہا کہ ماما کی نیند کے لیے کوئی اور دوا دیدے۔

''میں نے اس سے پہلے ایک نوجوان ڈاکٹر بھیجا تھا۔اس نے دوا دی تھی نا؟''

''مگر اس کا تو کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔میرا تو خیال ہے اس دوا کے بعد ان کی حالت اور بھی بگڑ

MashalBooks.com

گئی ہے۔اس وقت انہیں نیند تو نہیں آ رہی تھی مگر وہ ایسی حرکتیں بھی نہیں کر رہی تھیں۔اب میں کیا کروں؟''۔

''تسلی رکھو۔اگر دوا کا غلط اثر بھی ہو رہا ہے تو بھی کوئی خطرہ نہیں ہے۔صبر کرو۔انہیں سکون کی دوا دی گئی۔اس دوا کا کوئی خراب اثر نہیں ہوتا۔''

''مجھے تو ان کی حرکتوں سے ڈر لگ رہا ہے۔''میں نے اصرار کیا۔''یہ ہوش میں نہیں ہیں۔''

''یہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔''نرس نے سکون سے کہا۔

''آپ انہیں سکون کی دوا کے بجائے نیند کی دوا دیدیجیے۔یا ٹیکہ لگا دیجیے۔''میں چیخی۔

''معاف کرنا۔میں ایسا نہیں کر سکتی۔''

''کیا مطلب؟ یہ اتنا بڑا ہسپتال ہے یہاں بڑے بڑے آپریشن ہوتے ہیں۔آپ اپنے مریض کو صحیح دوا دینے سے انکار کر رہی ہیں۔ماما بے خوابی کا شکار ہیں۔''

''ہم مریض کے لیے جو مناسب سمجھتے ہیں وہ کرتے ہیں۔مریض کے رشتے داروں کو ہمارے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے۔''نرس نے غصے سے کہا۔مجھے شرمندگی بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔میں کمرے میں واپس آ گئی اور سوچا کہ آئندہ کسی سے مدد کے لیے نہیں کہوں گی۔

ماما ابھی تک کپڑے دھو رہی تھیں۔ان کے ہاتھ اسی طرح ہل رہے تھے۔پھر اچانک انہوں نے میری طرف اپنی ہتھیلیاں ایسے اٹھائیں جیسے اپنے آپ کو بچا رہی ہوں۔ان کی لال لال آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔لگتا تھا جیسے وہ آنکھیں باہر آ جائیں گی۔

''کیا ہوا ماما؟''میں ان کی طرف بھاگی۔مجھے ڈر لگ رہا تھا۔

انہوں نے میرا گلا پکڑ لیا۔میری سانس بند ہونے لگی۔ان کے اندر بلا کی طاقت تھی۔میں اپنے آپ کو ان کے پنجوں سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ڈری ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

''وہ آدمی پھر آ گیا۔وہ پھر آ گیا۔''ماما دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں ان کا ایک ہاتھ اب بھی ایسے اٹھا ہوا تھا جیسے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔میں نے مڑ کر دیکھا کہ کہیں کوئی آدمی اندر تو نہیں آ گیا ہے۔مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔خوف سے میرے بدن پر رواں کھڑا ہو گیا۔

''ماما ....''میں زور سے چیخی۔میں نے اپنے آپ کو ان سے چھڑایا۔ماما کی نظریں دروازے پر گڑی ہوئی تھیں اور وہ کانپ رہی تھیں۔اگرچہ وہاں کوئی نہیں تھا مگر لگتا تھا کہ ماما کسی کے ساتھ لڑ رہی ہیں۔مجھے وہم ہوا کہ دوسری دنیا سے کوئی ماما کو لینے آیا ہے اور دروازے پر ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ماما اسے دیکھ رہی ہیں۔میں ایسی ڈر گئی تھی جیسے میرے خون کا ایک ایک قطرہ جم گیا ہو۔میں کسی کو بلا بھی نہیں سکتی تھی۔چھیاسی سال کی عورت کو دوسری دنیا لے جانا قدرتی سی بات تھی۔اس ہسپتال میں ماما سب سے بوڑھی مریض تھیں۔میں اپنی ماں کو دوسری دنیا سے آنے والے پیامبر کے حوالے کرنے کو تیار تھی۔

کون کہہ سکتا ہے کہ میری چھیاسی سال کی ماں نے خوش گوار زندگی نہیں گذاری۔مجھے صرف یہ فکر تھی کہ دوسری دنیا سے آنے والا میری ماں کو اس صورت میں اوپر لے جائے گا کہ ابھی ان کے آپریشن کا خون بھی بند نہیں ہوا ہے۔

''میں انہیں آپ کے حوالے کرنے کو تیار ہوں مگر مہربانی کر کے ان کے سامنے نہ آیئے۔میں جانتی ہوں انسان کی فطرت یہ ہے کہ چاہے وہ سو سال کا بھی ہو جائے پھر بھی مرنا نہیں چاہے گا۔دوسری دنیا کے پیامبر کی حیثیت سے یہ آپ کا فرض ہے کہ کسی انسان کی آخری سانس تک اس کے سامنے نہ آئیں۔خدا کے لیے آپ یہاں سے چلے جائیں۔''

ماما کی تکلیف مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔تکلیف سے ان کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں مجھے بھی دوسری دنیا کے پیامبر کا چہرہ نظر نہ آ جائے۔وہ پیامبر میری درخواست پر وہاں سے جانے کے بجائے ماما کے اور بھی قریب جا رہا تھا۔اس کا اندازہ مجھے ماما کی پھٹی ہوئی آنکھوں سے ہوتا تھا جو کسی ان دیکھی چیز پر جمی ہوئی تھیں جیسے وہ چیز ان کی طرف بڑھ رہی ہو۔خدا کی پناہ وہ تو میں خود تھی میں ماما کے بستر مرگ کے ساتھ اکیلی کھڑی تھی۔

''وہ پھر آ گیا۔تم کیا کر رہی ہو۔اپنے بھائی کو چھپاؤ جلدی کرو۔''ماما چیخ رہی تھیں۔

''ماما' آپ کیا کہہ رہی ہیں میں بھائی کو کیسے چھپا سکتی ہوں۔وہ تو یہاں ہے ہی نہیں۔''

''تو کیا وہ آدمی تمہارے بھائی کو پکڑ کر لے گیا؟''

''ماما' خدا کے لیے۔۔''

ماما کے ہاتھ ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ان کا ایک ہاتھ پاؤں پر بندھی ہوئی پٹی پر چلا گیا۔''

MashalBooks.com

میرا معصوم بیٹا' تو یہاں چھپا ہوا ہے۔ یہیں چھپا رہنا۔ میں سب سنبھال لوں گی۔''

ماما کے لہراتے ہوئے ہاتھوں نے پٹی بندھا ہوا پاؤں زور سے پکڑ لیا۔ جیسے وہ اپنے بیٹے کو بچا رہی ہوں۔ اب مجھے خیال آیا کہ ان کے سامنے دوسری دنیا سے آنے والی کوئی مخلوق نہیں تھی۔

''جناب والا۔ میرے گھر میں صرف عورتیں ہی رہتی ہیں۔'' ماما نے کہا۔ ان کی نظریں اب دوسری طرف تھیں۔ ان کے ہونٹوں میں مسکراہٹ کی ہلکی سی جھلک تھی۔ میں جانتی تھی کہ انہیں خیالوں ہی خیالوں میں کچھ نظر آ رہا ہے۔ بے چاری ماما۔ اس سے تو اچھا ہے کہ انہیں دوسری دنیا کا پیامبر نظر آتا رہے۔

ماما ایسی حرکتیں کر رہی تھیں جیسے وہ اپنا پاؤں کہیں چھپانا چاہ رہی ہیں اور وہ پاؤں اپنی جگہ سے ہل نہیں رہا ہے۔

''جناب والا۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ہم عورتوں کے سوا اور یہاں کوئی نہیں رہتا۔ آپ اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔''

میں ماما کی اس حالت میں ان کے لیے کیا کر سکتی تھی۔ ماما یہ سمجھ ہی نہیں رہی تھیں کہ موت آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ان کے بگڑے ہوئے چہرے پر خوف اور دہشت کے ساتھ امید کی چمک بھی تھی۔ ان کے ہاتھ جنہوں نے زخمی ٹانگ پکڑی ہوئی تھی اور ان کے کندھے ایسے لرز رہے تھے جیسے تیز ہوا میں پتے۔

بے چاری ماما۔ یا خدا ان پر رحم کر انہیں سکون سے مرنے دے۔ انہیں دوبارہ اس عذاب سے کیوں گذارا جا رہا ہے۔''

''ماما' خدا کے لیے یہ نہ کیجیے۔'' میں گڑگڑائی۔ ''ماما اپنے اوپر قابو رکھنے کی کوشش کیجیے۔'' میں رو رہی تھی اور ان کا کاندھا ہلا رہی تھی۔ خدا جانے ان میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ انہوں نے میرا ہاتھ ایسے جھٹک دیا جیسے تنکا اٹھا کر پھینک رہی ہوں۔

''نہیں نہیں۔ یہ نہ کرو۔ کیا تم انسان ہو حرام زادے۔''

ماما نے مجھے دیوار کی طرف دھکا دیا۔ میں ان کی یہ حرکتیں دیکھ کر بری طرح کانپ رہی تھی۔ ان کی زخمی ٹانگ کے سوا ان کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ اس کی وجہ سے ان کی ٹانگ بہت ہی ڈراؤنی دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ ان کی ٹانگ نہ ہو بلکہ باہر سے لا کر کوئی چیز لگا دی گئی ہو۔ یا پھر جیسے ان

کی ٹانگ اور ان کا بیٹا ایک ہی ہو گئے ہوں۔ مجھے ان کی ٹانگ کا ڈر تھا۔

کبھی وہ کہتیں۔ ''کمینے انسان' تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' اور کبھی نہایت نرمی کے ساتھ کہتیں۔'' جناب والا' محترم۔'' ان کے جسم میں خون پہنچانے کے لیے جو نالی لگائی گئی تھی وہ ٹیڑھی ہو گئی تھی اور خون باہر گر رہا تھا۔ ان کے کپڑے اور بستر کی چادر خون سے بھر گئی تھی۔

ماما نے خون دیکھا تو ان کا غصہ اور بڑھ گیا۔ ''تم ابھی تک کھڑے ہو' نیچ کمینے جانے سے پہلے مجھے مار کیوں نہیں دیتے۔''

ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ دانت پیس رہی تھیں۔ وہ صرف ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ دانت پیس رہی ہیں کیونکہ ان کے منہ میں دانت تو تھے ہی نہیں۔ بہت ہی دلخراش منظر تھا۔ شاید کسی نے بھی ایسا منظر نہیں دیکھا ہوگا۔ کاش یہ خواب ہوتا۔ مگر یہ تو ڈراؤنا خواب تھا۔ ماما نے اپنے بال پکڑے اور زور سے کھینچنے لگیں۔ انہوں نے وہ نالی کھینچ لی جس سے ان کا پیشاب باہر آ رہا تھا۔ بدبو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ ان کی چیخوں کی آواز شاید باہر بھی سنی گئی تھی کیونکہ جیسے ہی میں باہر جانے لگی تو ایک نرس دوڑی دوڑی اندر آ گئی۔ اس کے ساتھ ادھیڑ عمر کی ہیڈ نرس بھی تھی۔

ماما نے جو نالیاں نکال دی تھیں انہیں دوبارہ لگانے کے لیے کئی آدمیوں کی ضرورت تھی۔ میں نے نرسوں کے ساتھ مل کر وہ نالیاں پھر لگائیں۔ ماما اس وقت بھی ہمارا مقابلہ کرتی رہیں۔ اب ہیڈ نرس نے ان کی ٹانگ میں ٹیکہ لگا دیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے گھبرا کر نرس سے پوچھا۔

''پریشان نہ ہو۔ یہ غیر معمول بات تو ہے مگر یہ پہلی مریض نہیں ہیں جو ایسا کر رہی ہیں۔ یہ جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔'' نرس نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی۔ اس کا مطلب ہے کہ ماما کے یہ ڈراؤنے خواب اس بیماری کی وجہ سے ہیں۔ کاش ہم دوسروں کے خوابوں کے اندر جانے کی صلاحیت رکھتے۔ کاش میں ماما کے خواب دیکھ سکتی۔

ماما کی جنگ جاری تھی۔ وہ تھک ہی نہیں رہی تھیں۔ لگتا تھا یہ ان کی آخری جنگ ہے کہ میں تجھے مار دوں یا تو مجھے مار دے۔ ہیڈ نرس نے دوسری نرس کو ہدایت کی کہ ماما کے بستر کے دونوں طرف لگے فولادی جنگلے اوپر اٹھا دے اور ماما کے ہاتھ پاؤں ان کے ساتھ سختی سے باندھ دے۔

MashalBooks.com

''تم بیٹی ہو' یہ تمہیں برا تو لگے گا۔ مگر جو تمہاری ماں پر گذر رہی ہے اس پر زیادہ توجہ نہ دو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا اور یہ ٹھیک ہو جائیں گی۔''

کمرے سے باہر جانے سے پہلے ہیڈ نرس نے ایک بار پھر مجھے تسلی دینے کی کوشش کی۔ مگر میں پریشان تھی۔ اس کے جاتے ہی میں جوتوں سمیت میں پورٹیبل بستر پر گر گئی۔ میرے لیٹتے ہی ماما نے اتنی زور سے طاقت لگائی کہ ان کے ہاتھ پاؤں پر بندھی ہوئی ڈور ٹوٹ گئی۔ وہ پہلے ہی زخمی جانور کی طرح دہاڑ رہی تھیں۔

اب پھر ماما نے ہاتھ پیر مارنا شروع کیے۔ وہ ہر ایک کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ مجھے اپنے اندر ایک عجیب سا درد محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی میرے جگر پر چھریاں چلا رہا ہو۔ پھر پتہ نہیں میرے اندر کہاں سے طاقت آ گئی۔ اور میں اٹھ کر ماما کے پاس پہنچ گئی۔ اب میں نے سوچا کہ ان کے ساتھ میں اکیلی ہی نپٹوں' کسی اور سے مدد نہیں مانگوں گی۔ یہ معاملہ ماں اور بیٹی کے درمیان ہی طے ہونا چاہیے۔

میں نے پوری طاقت سے ماما کو نیچے دبایا۔ میں تقریباً ان کے اوپر چڑھ گئی تھی۔ میرے روئیں روئیں میں اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ہر حالت میں مجھے ماما پر قابو پانا ہے ورنہ وہ مجھے اپنے نیچے دبا ئیں گی۔ لیکن اپنی پوری طاقت لگانے کے باوجود میں ان کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ جب میں کمزور پڑنے لگتی تو آہستہ سے ان کے گال پر تھپڑ مار دیتی۔

''ماما خدا کے لیے سنبھل جایئے''۔ میں ان کی خوشامد کر رہی تھی۔

اب مجھے اپنے اوپر پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایک بار تو میں نے ان کے گال پر زور سے تھپڑ مار دیا۔ پھر ان کے گال پر اپنی انگلیوں کے نشان دیکھے تو مجھے جہنم کی آگ یاد آ گئی۔ اس کے باوجود میں ان کے ساتھ بداخلاقی کرتی رہی۔ مجھے ان کی طاقت پر حیرت تھی۔ ان کے چہرے کے جو تاثرات تھے وہ میری ماں کے نہیں تھے۔ مجھے ان کی طاقت سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ ان بگڑے ہوئے چہرے سے مجھے خوف آ رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ دراصل میں اپنی ماما سے نہیں بلکہ اس خوف سے لڑ رہی ہوں۔ جو خود میں نے اپنے اوپر طاری کر رکھا ہے۔

میں ماما سے بہت پیار کرتی تھی۔ اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ مجھے جن چیزوں سے پیار تھا ان میں ان کا چہرہ بھی تھا۔ ماما نہایت خوبصورتی کے ساتھ آہستہ آہستہ بوڑھی ہوئی تھیں۔

اس کی وجہ بدھ مت پر ان کا ایمان تھا۔ آخری عمر میں وہ بہت ہی مذہبی ہو گئی تھیں بدھ مت پر ایمان کی وجہ سے وہ موت سے بھی نہیں ڈرتی تھیں۔ بڑھاپے میں وہ مہاتما بدھ کی طرح بہت ہی رحم دل' بہت ہی فیاض اور بہت ہی پاکباز بن گئی تھیں۔ ان کا بیٹا تو ان سے چھن گیا تھا لیکن وہ اس بیٹے کے بچوں' اس کی بیوی اور اپنی بیٹی اور اس کے بچوں سے بہت پیار کرتی تھیں۔ البتہ اپنے اور ان سب کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھتی تھیں۔ ماما واقعی خوش خوش اور نہایت وقار کے ساتھ بوڑھی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں اس طرح بوڑھا ہوتے دیکھا تھا تو میں ان سے مرعوب ہو گئی تھی وہ تو سچ مچ بودھ بھکشنی معلوم ہوتی تھیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ انسان کی زندگی کی اندرونی پیمائش کی کوئی حد یا کوئی خاتمہ نہیں ہے۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں یہ کیسے کہہ سکتی ہوں کہ ماما کے قلبی سکون کے پیچھے کون سے عوامل تھے۔ کیونکہ اب جو ماما کے اندر سے نکل رہا تھا وہ نہ تو نیکی اور امن وسکون تھا اور نہ پیار بلکہ وہ بدکلامی اور غصہ تھا۔ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اگرچہ یہ بات سچ ہے کہ ہم انسان گناہ گار ہی ہوتے ہیں لیکن ماما کی اصل شخصیت میری سمجھ سے بالا تھی۔

جس طرح شیطان کا مقابلہ شیطان سے ہوا اسی طرح ماما کی کشمکش اس وقت تک جاری رہی جب تک انہوں نے خود ہی شکست تسلیم نہ کر لی۔ اس کے بعد ہی میں نے اپنا گال ان کے سوجے ہوئے گال سے لگایا۔ ان کے گال پر ابھی تک میری انگلیوں کے نشان تھے۔ میں زور زور سے رونے لگی۔

میرے لیے یہ معمہ ہی رہا کہ کوریا کی جنگ کے زمانے میں جب ہم غربت کی گرفت سے باہر نکلنے کے قابل ہو گئے تھے تب بھی ماما ہیون جو دونگ میں اپنے گھر کو پناہ گاہ کیوں کہتی تھیں۔ ہم کچھ عرصے سے دوسرے خوش حال لوگوں کی طرح آرام دہ زندگی گذار رہے تھے۔ ہم نے جو تکلیفیں اٹھائی تھیں وہ غیر منصفانہ اور ظالمانہ تھیں۔ ان حالات میں ہم نہ زندہ رہ سکتے تھے اور نہ مر سکتے تھے۔ اس وقت ماما اپنے گھر کے بعد اسی آبادی پر بھروسہ کر سکتی تھیں جہاں وہ سیول آنے کے بعد رہ رہی تھیں۔ ہیون جو ڈونگ کے ساتھ ان کی وابستگی اس لیے تھی کہ ہم نے وہاں اپنے مشکل دن گذارے تھے۔

کوریا کی جنگ جاری تھی۔ پورا ملک ہی جنگ کی تباہ کاریوں کا شکار تھا اس صورت میں

MashalBooks.com

ہماری اپنی مصیبتیں ایک ذرے کے برابر بھی نہیں تھیں۔ وہ ایک متوسط طبقے کا محلّہ تھا جہاں ہمیں انسانوں کے اصل چہرے نظر آئے۔ انسان دوست دوغلے چہرے۔ میرا بھائی رضا کارانہ طور پر فوج میں شامل ہوگیا تھا۔ جاپان سے کوریا کی آزادی کے بعد میرا بھائی بائیں بازو کی تحریک میں شامل ہوگیا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ جنوبی کوریا سے بھاگ نہیں سکا۔ اسے زبردستی سیول میں روک لیا گیا تھا۔ اسے اپنی جان کا خطرہ رہتا تھا۔ میرا بھائی وہ جاننا چاہتا تھا جو ان حالات میں بائیں بازو کے دوسرے نوجوان جانتے تھے۔ اس نے جو تھوڑی بہت معلومات حاصل کی تھیں ان کی وجہ سے کوئی بھی نوجوان بددل ہوسکتا تھا چاہے وہ سیول سے بھاگے نہ بھاگے۔ میرا بھائی' اب کمیونسٹ نہیں تھا وہ خوف زدہ ہوگیا تھا۔

اس نے حکومت کے اس وعدے پر بھروسہ کیا کہ سیول کی ہر حالت میں حفاظت کی جائے گی سیول سے بھاگنے کا موقع ضائع کر دیا تھا۔ شمالی کوریا سے توپوں کی گھن گرج کے باوجود میرا بھائی سیول میں ہی رہا۔ وہ اپنی ایمانداری اور سرکاری افسروں کو برا بھلا کہتا تھا۔ جنہوں نے اپنی جان بچانے کے لیے لوگوں کو دھوکہ دیا۔ ہمارے افسر پسپا ہونے والی فوج کے ساتھ شمالی کوریا سے بھاگ آئے تھے۔ وہ خود اتنا گھٹیا انسان نہیں تھا کہ دوبارہ بائیں بازو کے ساتھ چلا جاتا ہماری حکومت اور فوج کے بھاگنے کے بعد سیاسی طور پر سب ہی مصلحت کا شکار ہوگئے تھے۔

اگرچہ میرا بھائی اب دائیں بازو کے ساتھ ہوگیا تھا لیکن اسے یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ کوئی اسے یہ کہے کہ اس نے بائیں بازو کی سیاست چھوڑ دی ہے۔ وہ یہ کہتا کہ اب وہ اپنے اصل نظریے کی طرف آ گیا ہے۔

میرا بھائی اپنے اصولوں پر چلنا چاہتا تھا۔ وہ صحیح معنی میں اسکالر تھا۔ اور اس حیثیت میں وہ بائیں بازو والوں کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا جو اپنی منزل پانے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ وہ شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوگیا تھا۔

کوریا کی جنگ شروع ہونے سے پہلے بائیں بازو کے لیڈروں نے نوجوانوں کو اپنی طرف راغب کر لیا تھا۔ میں اس سے اس لیے بچی رہی تھی کہ میرے سامنے میرے بھائی کی مثال تھی جو پہلے بائیں بازو کے ساتھ گیا تھا بعد میں وہ اس سے بیزار ہوگیا تھا۔ صرف جان بچانے کے لیے کوئی نظریہ اختیار کر لینا مجھے پسند نہیں تھا۔ حکومت کو عوام کی حفاظت کرنا چاہیے تھی مگر اس کے افسر

اور عہدیدار اپنی جان بچانے کے لیے عوام کو دشمنوں کے قبضے میں دے کر خود بھاگ آئے تھے ان حالات میں میرے بھائی کی ذہنی کشمکش اور بھی بڑھ گئی تھی۔

اصل میں ساری زندگی قسمت ہمارے ساتھ کھیل کھیلتی رہی ہے۔ ہمارے جس پڑوسی نے میرے بھائی کے سیاسی نظریات سے حکام کو آگاہ کیا تھا وہ اس کی ذہنی اذیت سے واقف نہیں تھا۔ وہ خود دشمنوں کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ بہرحال' اچانک ہمارے حالات بدل گئے۔ ایکدم ہم اپنے پڑوسی کی سرپرستی میں آ گئے تھے۔ میرا بھائی رضا کار فوج میں شامل ہوا تو شروع میں یہ عجیب سا لگا۔ لیکن جب جنگ بڑھتی گئی تو ہر گھر سے نوجوانوں کو زبردستی فوج میں شامل کر لیا گیا۔

میں جانتی تھی کہ اس وقت جب ہماری قسمت کمیونسٹوں کے ہاتھ میں ہے میرے بھائی کے فوج میں شامل ہونے پر خوشی نہیں منائی جا سکتی تھی۔ پھر بھی حکام کی طرف سے ہمارے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا تھا حتی کہ راشن بھی ہمیں بہت ملتا تھا۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ اس کی وجہ ہمارا بااثر پڑوسی تھا جس کی پہنچ مقامی عوامی کمیٹی تک تھی۔ ہمارے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سرپرستی کو قبول کرتے یا اس سے انکار کر دیتے۔ ہم انکار کرنے کی عیاشی بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ زندہ رہنے کے لیے ہمیں خوراک کی ضرورت تھی۔ ہم طوفان میں زندہ تھے۔

ہم جو کھا رہے تھے اور بہت سے لوگوں کو چاول کا ایک پیالہ بھی نصیب نہیں تھا۔ یکلخت ہمارے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ ہم نے خوراک کے لیے خاندان کے ایک فرد کو فروخت کر دیا ہے۔ ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ ہم جو کھا رہے ہیں وہ غیر اخلاقی طریقے سے حاصل کیا گیا ہے۔

لوگ کہتے ہیں بھوک شریف سے شریف انسان کو بھی مجرم بنا دیتی ہے۔ خدا مجھے معاف کرے۔ میں کتنی آسانی سے وہ کھانا کھا لیتی ہوں جس کے لیے میں نے اپنے بیٹے کی زندگی داؤ پر لگا دی ہے۔ ایسا بیٹا تو لاکھوں میں بھی نہیں ملتا۔'' ماما کھانا کھاتے ہوئے اچانک چمچ میز پر رکھ کر کہنا شروع کر دیتیں لیکن انہیں اس کی فکر نہیں تھی کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

پورے تین مہینے بعد ہوا کا رخ پھر بدل گیا۔ ہمیں پھر اپنے ہمسایوں کا ظلم سہنا پڑا۔ حکام کی طرف سے ہمیں نوٹس دیا گیا کہ تم ''سرخے'' ہو۔ نوجوانوں کے ایک گروہ نے ڈنڈوں اور بندوقوں کے ساتھ ہمارے گھر پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے ایک ایک کمرے کی تلاشی لی اور سارا سامان اور برتن توڑ پھوڑ دیے۔ ایک نوجوان نے ڈنڈے کا سرا میری بھابی کے پیٹ میں چبھویا۔

MashalBooks.com

چند دن کے اندر ہی اس کے بچہ ہونے والا تھا۔ ہمارے تمام پڑوسی تماشہ دیکھنے باہر نکل آئے۔ وہ خوش ہو رہے تھے۔ ہمارے پڑوسیوں نے ہمارے خلاف شکایت کی تھی کیونکہ ہم تو تین مہینے سے خوب کھانے کھا رہے تھے مگر وہ بھوکے مر رہے تھے۔ اب ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

''مجھے بتاؤ۔ لوگوں کو جہنم میں چھوڑ کر کون بھاگا تھا؟'' ماما نے رو رو کر کہا۔ اگر مجھے سزا کے طور پر مار بھی دیا گیا تب بھی مجھے اس کا افسوس نہیں ہوگا۔ لیکن مجھے سرکاری افسروں کی شکل بھی دکھاؤ جو ہمیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔''

ان کا رونا پیٹنا کسی نے نہیں سنا۔ ہمارے پڑوسی ہمارا مذاق اڑا رہے تھے۔ وہ ہمیں سرخے کہہ رہے تھے۔

یہ طعنے اور الزام اتنے خطرناک نہیں تھے جتنا یہ الزام کہ ہم نے اس کمیونسٹ رہنما کو چھپایا ہوا ہے جس نے ہماری حفاظت کی تھی۔ مجھے، ماما کو اور میری بھابی کو تھانے بلایا گیا اور کئی دن ہمیں حراست میں رکھا گیا۔ میرے بھتیجے کے ساتھ برا سلوک کیا گیا۔ ہم جب تھانے میں تھے تو اسے ایک رشتے دار کے گھر بھیج دیا گیا تھا۔ اس سے ہمارے دل پر اتنا گہرا زخم لگا جو آج تک نہیں بھرا ہے۔ ایک دودھ پیتے بچے کو بھی کمیونسٹ کہہ کر اس کو سزا دی گئی۔

اس عرصے میں جنوبی کوریا کو شکست ہوئی اور اس کی فوجیں پسپا ہوئیں۔ ماما نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ بھابی اور بچے کو اس کے خاندان کے پاس بھیج دیا۔ ماما اس لیے وہیں رہیں کہ انہیں اپنے بیٹے کے واپس آنے کی امید تھی۔ انہیں اپنے بیٹے کی واپسی کی اس لیے امید تھی کہ پڑوس کے جولڑکے رضا کار فوج میں گئے تھے وہ واپس آ گئے تھے۔ ماما کو امید تھی کہ ان کا بیٹا عوامی فوج کے سپاہی کی حیثیت سے واپس آئے گا۔ انہیں اس کی پرواہ نہیں تھی کہ ان کا بیٹا کس کے ساتھ ہے، وہ کمیونسٹ ہے یا کمیونسٹوں کا دشمن، وہ تو اپنے بیٹے کو زندہ دیکھنا چاہتی تھیں۔

ایک دن معجزے کے بجائے ڈراؤنے خواب کی طرح میرا بھائی گھر آ گیا۔ بھوک اور سردی کے علاوہ بے خوابی نے اس کی شکل بدل دی تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو گیا تھا۔ وہ ذرا ذرا سی آواز سے بھی ڈرنے لگا تھا۔ وہ ہر قسم کے جذبات سے بھی عاری ہو گیا تھا۔ اسے اپنے بچے کی بھی پرواہ نہیں تھی میری اور ماما کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس میں یہ تبدیلی کیوں آئی ہے۔ وہ ڈرے ہوئے بچے کی طرح ہر وقت کمرے میں بند رہتا تھا، وہ کسی سے بھی نہیں ملتا تھا۔

اس سے بھی بڑی پریشانی کی بات یہ تھی کہ جنگ میں جنوبی کوریا کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ لوگ سیول چھوڑ کر اور بھی جنوب کی طرف بھاگ رہے تھے۔ حکومت بھی اس فرار میں لوگوں کی مدد کر رہی تھی۔ شدید سردی اور برف باری میں لوگ اپنی جان خطرے میں ڈال کر بھاگ رہے تھے وہ فوجی کنٹرول میں نہیں رہنا چاہتے تھے۔

ان حالات میں میرا بھائی بھی جنوب کی طرف بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ ہر حالت میں سرخوں یا کمیونسٹوں سے دور بھاگنا چاہتا تھا۔ مگر افسوس، اس کے پاس شناختی کارڈ نہیں تھا اس کارڈ کے بغیر کوئی گھر سے باہر بھی نہیں جا سکتا تھا، شہر کے باہر جانا تو دور کی بات ہے۔ شناختی کارڈ بنوانے کے لیے دو ہمسایوں کی گواہی ضروری تھی۔ اور کوئی ہمسایہ بھی اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ ماں کی خوشامدوں کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انہوں نے کہا کہ میرے بھائی کو تھانے جا کر اپنی شناخت کروانا چاہیے پھر شناختی کارڈ بن جائے گا۔ اگر وہ سرخ نہیں ہے تو اسے اس طریقہ کار سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ میرے اور ماما کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ بھائی کے گھر آنے سے پہلے ہم دونوں بھائی تھانے گئے تھے اس کے بعد ہمارے شناختی کارڈ بنے تھے۔ کوئی بھی ہمسایہ ہمارے لیے گواہی دینے کو تیار نہیں ہوا تھا۔

میرے بھائی کا معاملہ یہ تھا کہ وہ تھانے نہیں جا سکتا تھا۔ وہ پولیس کا نام سنتے ہی گھبرا جاتا اور کانپنے لگتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ تھانے جانے کے بجائے وہ گھر کے اندر ہی بند رہنا پسند کرتا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ماما کو تنگ کرتا رہتا تھا کہ اسے جنوب کی طرف لے جائیں۔ وہ اور تکلیفیں برداشت نہیں کرنا چاہتا۔ وہ یہ بات بار بار ایسے دہراتا رہتا تھا جیسے خواب میں بول رہا ہو۔ اور جب ماما کہتی تھیں کہ وہ اسے دوسرے لوگوں کے ساتھ جنوب کی طرف لے جائیں گی تو وہ چیختا تھا کہ اسے جاسوس کہہ کر گولی ماردی جائے گی۔ اس نے ہمیں پاگل کر دیا تھا۔ وہ کہتا رہتا تھا کہ کسی طرح شناختی کارڈ بنوا کر دو۔

''ماما، جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے سب بیچ ڈالو۔'' وہ شور مچاتا۔ گھر بیچ دو، فرنیچر بیچ دو، ہر چیز بیچ دو اور مجھے کارڈ بنوا دو۔ آپ ان چیزوں کے ساتھ کیوں چمٹی ہوئی ہیں۔''

وہ چیختا اور ماما رونے لگتیں۔

پھر وہ مجھے برا بھلا کہنے لگتا۔ ''تم کسی بڑے آدمی کو کیوں نہیں پھنساتیں اور اس کے ذریعہ

MashalBooks.com

میرا شناختی کارڈ بنوا دیتیں۔ ایسی بہن کا کیا فائدہ جو اپنے بھائی کے کام بھی نہ آ سکے۔''

اس کے اس رویے سے اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ ایک دن حکومت نے آخری بار سیول خالی کرنے کا اعلان کیا اور لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ نظم وضبط کے ساتھ اپنے گھروں سے نکل جائیں۔ ہم یعنی میں' ماما اور بھائی یہ سوچے بغیر روانہ ہو گئے کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ ہمارے پڑوسی بھی وہاں سے چل پڑے۔ سب نے اپنے سر پر یا پیٹھ پر سامان اٹھا رکھا تھا۔ ہم اس لیے ان کے ساتھ تھے کہ اگر انہوں نے ہمیں اپنے ساتھ نہ دیکھا تو ایک بار پھر ہمارے اوپر کمیونسٹ ہونے کا الزام لگا دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ہم دوبارہ کمیونسٹوں کے ماتحت رہنے کو تیار نہیں تھے۔ رضا کار فوج سے فرار پر موت کی سزا دی جاتی تھی۔ اس پر کمیونسٹ ہونے کا الزام لگا دیا جاتا تھا۔ ہمارے خاندان کے لیے یہ بہت بڑا خطرہ تھا۔

ہم جنوب کی طرف جانے والے لوگوں کے ہجوم میں شامل تو ہو گئے تھے لیکن ہمیں چیکنگ سے بچنے کے لیے کئی بار شہر کی حدود کا چکر لگانا پڑا۔ اس معاملے میں نہایت حساس کیڑے مکوڑوں کی طرح میرے بھائی کی حس بھی بہت تیز تھی۔ اسے اندازہ ہو جاتا تھا کہ چیک پوسٹ کہاں ہیں بس یہی اس کی ایک خوبی تھی' باقی معاملات میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ میرے لیے وہ ایک بوجھ تھا۔ میں نے سوچا کہ میں ان سے علیحدہ ہو جاؤں۔ لیکن اسی وقت ماما نے ایک تجویز پیش کر دی۔

''بچو' چلو ہم ہیونجوڈونگ چلتے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔ اس مقام کا نام سنتے ہی میں اس بچے کی طرح فرماں بردار بن گئی جو کافی عرصے غائب رہنے کے بعد گھر آ گیا ہو۔ بھائی کی آنکھیں بھی' جو ہر وقت خالی خالی رہتی تھیں' چمک اٹھیں۔

''وہ الٹی سیدھی آبادی جو شہر کی آفتوں کی طرح ہے' ہمارے چھپنے کے لیے سب سے اچھی جگہ ہے۔'' ماما نے پرسکون آواز میں کہا۔ پہلے وہ اسی آبادی کو بہت برا بھلا کہتی تھیں لیکن اب انہیں وہی یاد آ گئی تھی۔

''میرا خیال ہے دوسرے محلوں کی طرح وہ محلہ بھی خالی ہو گیا ہو گا۔ فوج کے واپس آنے تک ہم وہاں کسی گھر میں بھی پناہ لے سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اپنے گھر چلے جائیں گے۔ آج تک مجھے لوگوں سے اتنا ڈر نہیں لگا جتنا اب لگ رہا ہے۔ ہمیں کیا معلوم کون ہمارا دشمن ہے اور کون دوست ہے۔ وہاں اب بھی ایک دو آدمی تو ہوں گے۔ وہاں رحم دل لوگ بھی ہیں۔'' ماما نے اپنے

پرانے محلے کے بارے میں اپنی رائے دے دی۔

پچھلے دنوں ہمارے نئے محلے کے لوگوں نے ہمیں بہت تنگ کیا تھا۔ وہ ہمیں اپنے آپ سے کمتر سمجھتے تھے۔ ہمیں یاد تھا کہ ہم نے گاؤں سے آنے کے بعد سیول کے ایک غریب علاقے میں اپنی مفلسی کے دن گذار رہے تھے۔ میں چھوٹی سی تھی تو گاؤں میں میرے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس علاقے کے لوگوں نے اپنی مفلسی کے باوجود ہمارا خیر مقدم کیا تھا۔ وہ بہت فراخ دل لوگ تھے۔ وہاں جانے کا سن کر میرا دل خوش ہو گیا۔ مجھے یہ بھی امید ہوئی کہ وہاں جا کر میرے بھائی کی جذباتی کشمکش بھی ختم ہو جائے گی۔

یہ سوچ کر کہ جیسے ہم اپنے گھر واپس جا رہے ہیں میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ماما بھی مسکرا رہی تھیں' ہمیں ہیونجوڈونگ کی پہاڑی پر چڑھنا بھی اب مشکل نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ ہمارے دلوں میں امید کی کرن جگمگا رہی تھی۔ وہاں کی ہر گلی ہمارا استقبال کرتی نظر آ رہی تھی۔ چونکہ وہ نوجوان کی پسپائی کی آخری رات تھی اس لیے سارا علاقہ خالی تھا۔ ہم نے پہاڑی پر سے سیول شہر کو دیکھا جہاں گرد وغبار چھایا ہوا تھا ماما نے اطمینان کی سانس لی۔

''یہ سرخے میری سمجھ میں نہیں آتے۔ وہ ایسے لوگوں پر کیسے حکومت کر سکتے ہیں جو انہیں پسند نہیں کرتے۔ یہاں کے تو غریب بھی ان کے خلاف ہیں۔'' ماما نے سرگوشی کی۔

ہم نے ان گھروں کی طرف چل دیئے جن کے رہنے والوں کو ماما جانتی تھیں وہ سب خالی تھے۔ ان میں سے ایک گھر کو ہم نے اپنی پناہ گاہ بنا لیا۔ ہم نے دروازہ کھولا اور اندر چلے گئے ہم کسی اور گھر میں بھی جا سکتے تھے۔ مگر ماما نے وہ گھر پسند کیا جس کے مالک کو وہ خوب جانتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ بعد میں وہ اس کے مالک سے معافی مانگ لیں گی۔ انہوں نے ہمیں یہ بھی یقین دلایا کہ اگر اس گھر کی کوئی چیز خراب ہوئی تو وہ اس کا معاوضہ ادا کریں گی۔

اپنے پرانے محلے کے گھر میں جانے کے بعد کئی دن تک ہمیں وہاں کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ اس لیے ہمیں معلوم ہی نہیں ہوا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے پاس ایک مہینے کا راشن تھا۔ ہمارے پاس اناج' ایندھن اور سوکھی ہوئی گوبھی اتنی تھی کہ جاڑوں کے مہینے ہم کاٹ سکتے تھے۔ کنویں سے پانی مل سکتا تھا۔ میرا بھائی جب رضا کار فوج سے بھاگنے کی سوچ رہا تھا تو کیا اس کے دماغ میں اسی قسم کی زندگی گذارنے کی خواہش تھی؟ میں نے سوچا۔ چلو اس طرح اس کا جذباتی علاج بھی

MashalBooks.com

ہو جائے گا۔ اب اسے اپنی اصل چھپانے کے لیے اپنے انداز اور اپنا لہجہ بھی نہیں بدلنا پڑے گا۔ مجھے امید تھی کہ اب وہ نفسیاتی طور پر ٹھیک ہو جائے گا۔

اب میرے بھائی کو اپنی بیوی اور بچے بھی یاد آنے لگے تھے۔ اس کے ایک اور بچہ پیدا ہوا تھا۔ بیوی جنوب میں اپنے ماں باپ کے پاس تھی۔ رضا کار فوج سے فرار ہونے کے بعد اس نے اس طرح بیوی بچوں کو یاد نہیں کیا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ اس کے دل میں اپنوں کی محبت پیدا ہوئی ہے۔

ادھر ہم خوش تھے کہ قسمت نے ہمیں چھپنے کو اتنی اچھی جگہ دے دی ہے۔ ایک دن عوامی فوج کے چند سپاہی ہمارے پاس آئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ قید خانے کے مغربی دروازے پر تعینات ہیں۔ وہاں سے ہر صبح اور ہر شام انہیں چند گھروں سے دھواں اٹھتا نظر آتا ہے۔ انہوں نے ان گھروں میں جا کر دیکھا کہ وہاں بوڑھے لوگ ہیں یا پھر قریب المرگ مریض ہیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو انہیں یقین نہیں آیا۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں شہوت جاگ اٹھی۔

''جی' یہاں ہم عورتیں ہی رہتی ہیں۔ آپ کو تلاشی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ماما نے کہا۔ انہوں نے ماما کو ایک طرف دھکا دیا اور اندر آ گئے۔

''کامریڈ' تم بھی عورت ہو'' ایک سپاہی نے میرے بھائی کو دیکھ کر کہا۔ وہ استہزایہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ میرا بھائی جیسے بولنا ہی بھول گیا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔

''یہ عورت نہیں ہے مگر عورت سے بھی بدتر ہے۔ یہ معذور ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ معذور بچہ ہمیشہ بوجھ ہوتا ہے۔'' دہشت سے ماما کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ ماما کے کہے بغیر ہی میرا بھائی ہوش مند انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور ان ہٹے کٹے سپاہیوں کے مقابلے میں تو وہ واقعی انسان معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ بہت ہی لاغر اور کمزور تھا۔ اس کے منہ سے جو الفاظ نکل رہے تھے وہ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ سکتے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ ماما کو اپنے ''معذور بیٹے'' کے بارے میں زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔

اس کے بعد ان سپاہیوں نے بار بار ہمارے گھر آنا شروع کر دیا۔ اس سے ہماری پریشانی اور بڑھ گئی۔ فوج کا ایک بڑا افسر بھی ہمارے گھر آیا۔ اس افسر کو میرے بھائی کے بارے میں کچھ سن گن ملی ہو گی۔

پہلے تو وہ اپنے گاؤں اور اپنے گھر والوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا پھر اچانک اس نے میرے بھائی کو گھورا اور بولا۔'' کامریڈ آپ عوامی فوج سے بھاگے ہوئے تو نہیں ہیں؟۔ کیا یہ صحیح ہے کامریڈ۔'' آپ فوج سے فرار ہوئے ہیں؟'' اس کی یہ بات سن کر ہم سب ڈر گئے۔

جب بھی فوجی آتے میرا بھائی ایکدم پیلا پڑ جاتا اور کانپنے لگتا۔ افسر کی بات سن کر اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ وہ عوامی فوج کی وردی دیکھ کر ہی گونگا ہو گیا تھا۔ اس کے گونگا ہونے سے ماما کی اس بات کی تصدیق ہو جاتی تھی کہ وہ واقعی معذور ہے۔

فوجی افسر اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔ اس نے اصل بات اگلوانے کے لیے ہر طریقہ اختیار کیا۔ کبھی وہ دھمکیاں دیتا تو کبھی لالچ دینے کی کوشش کرتا۔

''اماں جان' آپ کی تکلیف دیکھ کر میرا دل دکھتا ہے۔ آپ کے اکلوتے بیٹے کو یہ کیا ہوا ہے۔ یہ پیدائشی طور پر تو ایسا نہیں تھا نا؟ اگر یہ پیدائشی بیماری نہیں ہے تو مجھے یقین ہے یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ دنیا بھر میں سب سے بہتر طبی سہولتیں شمالی کوریا میں ہیں۔ اور پھر ہم غریبوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر آپ مجھے صحیح بات بتا دیں تو ہم سب سے اچھا ڈاکٹر آپ کے گھر بھیج دیں گے۔ خیر' اس کی یہ حالت کب سے ہے؟۔''

مجھے یاد نہیں اس افسر نے مذاق کے انداز میں میری ماں کو اماں جان کہنا شروع کیا۔ اس کے اماں جان کہنے سے ماما اور بھی پریشان ہو جاتی تھیں۔ ان کی پریشانی سے میں بھی ڈر جاتی تھی۔ جب وہ افسر چلا گیا تو ماما نے مجھے بتایا کہ افسر کے سامنے وہ جان بوجھ کر اپنی شکل ایسی بنا لیتی ہیں۔ ماما کی یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔

اس عرصے میں میں نے یہ سیکھا کہ زندہ رہنے کا فن سیکھنا پڑتا ہے۔ اور اس فن پر مہارت حاصل کرنا پڑتی ہے۔ خیر' ہمارا ہر دن ہی تکلیف دہ تھا اور ہر روز ہمیں ایک قسم کا نٹ کا تماشہ کرنا پڑتا تھا۔ ایسا لگتا جیسے ہم زہریلے سانپوں کے ساتھ ناچ رہے ہیں۔

ایک بار پھر سیول کے قریب توپ کا گولہ پھٹا شمالی کوریا کی فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ ماما دعائیں مانگتی رہتی تھیں کہ وہ ہمیں سکون سے رہنے دیں۔ میرے بچوں کو کچھ نہ ہو جائے۔؟

آخر وہ افسر پھر آیا۔ بظاہر تو وہ ہمیں الوداع کہنے آیا تھا لیکن جس انداز میں اس نے بات کی وہ عجیب سی تھی۔

MashalBooks.com

''کامریڈ۔کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ جیسے لوگ مجھے دھوکہ دے سکتے ہیں۔'' وہ زور سے دہاڑا۔''سچ سچ بتادو۔اب بھی سچ سچ بتادو۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے پستول نکالا اور میرے بھائی نے کی طرف نشانہ بنایا۔

''کیا کررہے ہو؟'' میری ماں چیخیں۔''تم انسان ہو یا کیا ہو؟'' انہوں نے اس افسر کا بازو پکڑلیا۔

میرے بھائی نے زخمی جانور کی طرح آواز نکالی وہ بار بار اواو کررہا تھا۔

''اب بھی تم سچ نہیں بتاؤ گے؟'' افسر پھر دہاڑا۔اور گولی چلا دی۔گولی میرے بھائی کی ٹانگ میں لگی۔اس پر بھی میرے بھائی کے منہ سے جانور کی آواز ہی نکلی۔

''ٹھیک ہے تم سچی بات ہی بتاؤ گے۔'' اس نے تین گولیاں اور چلائیں اور میرے بھائی سے کہا سچ بتاؤ اس نے پھر گولی چلائی۔وہ میرے بھائی کی ٹانگوں پر گولیاں مار رہا تھا تا کہ وہ جلدی نہ مرجائے۔یہ انتہائی وحشیانہ کام تھا۔میرا بھائی بیہوش ہوگیا وہ خون میں لت پت پڑا تھا ماما نے بھی چیخ ماری اور غش کھا کر گر گئیں۔

''جب تک تم سچ نہیں بتاؤ گے میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گا۔'' اس افسر نے کہا او رچلا گیا۔

اس دن کے بعد وہ افسر پھر نہیں آیا۔لیکن اس عرصے میں نقشہ ہی بدل گیا تھا۔اب شمالی کوریا کی حکمرانی نہیں تھی۔

میرے بھائی کے جو گولیاں لگی تھیں وہ ان سے نہیں مرا تھا۔بلکہ خون بہہ جانے کے وجہ سے دو تین دن بعد وہ مرا۔اس کے علاوہ اسے کسی قسم کی طبی امداد بھی نہیں ملی تھی۔اس کی بولنے کی طاقت ایسی ختم ہوئی تھی کہ آخری دم تک وہ بول نہیں سکا۔میرے اوپر جو گزری وہ میں ہی جان سکتی ہوں۔لیکن میں بہرحال زندہ رہی۔میں اپنی زندگی کا دروازہ بند نہیں کرنا چاہتی تھی۔انہی دنوں ایک شخص سے میری ملاقات ہوئی اور مجھے اس سے محبت ہوگئی۔پھر ہمارے بچے ہوئے اور ہم نے ان کی پرورش کی۔ماما بھی اپنے پوتوں اور پوتیوں کے ساتھ خوش رہیں۔اورانہوں نے اپنے آپ کو بدھ مت کے لیے وقف کردیا۔

ماما نے آپریشن کے بعد جو ہنگامہ کیا اس سے ان پر اتنی تھکن سوار ہوئی کہ وہ کئی دن غشی کی حالت میں پڑی رہیں۔بستر پر پڑی ہوئی وہ ایسی لگتی تھیں جیسے ہلکا پھلکا کاغذ جو پھونک مارنے

سے اڑ جائے گا۔کبھی کبھی کچھ رشتے دار انہیں دیکھنے آجاتے تھے۔وہ ایسے سر ہلاتے جیسے انہیں ماما کے صحت یاب ہونے کی ذرا سی بھی امید نہیں ہے۔بعض تو کفن دفن کی تیاریوں کی باتیں بھی کرتے۔وہ ہمیں تسلی دلاتے کہ ماما نے ایک طویل اور کامیاب زندگی گذاری ہے۔وہ ایسے بات کرتے جیسے تعزیت کررہے ہوں۔ہم ان کی سنتے رہتے۔ماما صرف چمچے سے کچھ سیال غذا کو لیتی تھیں یا ان کے انجیکشن لگتے رہتے تھے ورنہ ان کی کسی حرکت سے یہی ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہوش میں ہیں۔

ایک دن میری ایک دوست ماما کو دیکھنے آئی۔

''تم نے ان کا کفن تیار کرلیا ہے؟'' اس نے ماما کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں تو۔ابھی اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''ان کی حالت تو دیکھو۔قبر کا انتظام تو کرلیا ہوتا۔''

''پہلے سے قبر کا انتظام؟''

''اچھا ...؟۔تو تم نے کوئی انتظام بھی نہیں کیا ہے۔یہ تم کیا کررہی ہو۔''

وہ چیخی۔

''کیسی باتیں کررہی ہو تم؟۔''

''تم تو بالکل ہی غیر ذمہ دار معلوم ہوتی ہو۔''

''غیر ذمہ دار بیٹی۔''

''یہ تم نے صحیح کہا۔ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے تو یہ کام تمہارا ہے۔''

اس کی بات پر مجھے شرمندگی ہوئی۔میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا۔

''ہمارے شہر میں قبر کی جگہ ہے۔'' میں نے شرمندگی سے کہا۔

''وہ کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ گائیونگ میں ہے گائیونگ کے پاس۔''

''اس کا کیا فائدہ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے تم وہ گھر گروی رکھ کر قرض مانگو جو تم شمالی کوریا میں چھوڑ آئی ہو۔'' میری دوست بولتی چلی گئی۔

''وہ ہمارا خاندانی قبرستان ہے۔مجھے یقین ہے ماما وہیں دفن ہونا پسند کریں گی۔میں انہیں

MashalBooks.com

کسی اور جگہ کیسے دفن کر سکتی ہوں۔ ان کی خواہش بھی یہی ہوگی۔ قبر بھی تو مردوں کا گھر ہی ہوتا ہے۔''

ابھی میں نے بات ختم ہی کی تھی کہ میں نے دیکھا ماما کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ ان کا چہرہ جو کاغذ کی طرح سفید تھا ان کی آنکھوں سے اچانک چمک اٹھا۔ میری دوست نے ہلکی سی چیخ ماری اور میرا بازو پکڑ لیا۔

''ادھر آؤ۔ میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے جاندار آواز میں مجھے اپنے پاس بلایا۔

''جی ماما ...'' میں احتیاط سے ان کے بستر کے پاس گئی۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ان کا ہاتھ گرم اور سخت تھا۔ ان کے لمس سے مجھے حیرت ہوئی لیکن میں افسردہ بھی ہوگئی۔ میں نہیں جانتی ایسا کیوں ہوا۔

''میرے لیے قبر کی جگہ نہ خریدنا۔'' ماما نے کہا۔ ان کی آواز میں وہی حکم کا انداز تھا جو میرے بچپن میں ہوتا تھا۔

''آپ نے ہماری باتیں سن لیں؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''ہاں میں نے سن لی ہیں۔ اور اچھا ہوا سن لی ہیں میں پہلے ہی تمہیں بتانا چاہتی تھی۔ اب جو میں تمہیں بتا رہی ہوں یہ میری آخری وصیت ہے۔ میری آخری وصیت غور سے سنو اور اسی پر عمل کرو۔ میرے مرنے کے بعد وہی کرنا جو میں نے تمہارے بھائی کے ساتھ کیا تھا چاہے کوئی اس کی کتنی ہی مخالفت کرے۔ کسی اور کی بات پر بالکل توجہ نہ دینا۔ یہ کام تمہیں کرنا ہے۔ اب تم ہی تو رہ گئی ہو۔''

''جیسے آپ نے بھائی کے ساتھ کیا تھا؟''

''بالکل ویسے ہی۔ تمہیں یاد تو ہوگا۔ بھولی تو نہیں ہوگی؟''۔

''میں کیسے بھول سکتی ہوں۔''

ماما کے ہاتھ کا دباؤ ویسا ہی تھا جیسے ان کی صحت مندی کے وقت ہوتا تھا۔ اس میں ان کے ارادے کی بھی وہی پختگی تھی جو انہوں نے اس وقت دکھائی تھی جب وہ مجھے زبردستی پہاڑی درے پر لے گئی تھیں۔

میرے بھائی کی لاش آگ جے پہاڑی کے ساتھ میدان میں دفن کی گئی تھی جہاں ترکاریوں

کے کھیت تھے۔ وہ ایک عارضی قبر تھی جو کسی رسم کے بغیر بنائی گئی تھی۔ یہ ایسے آدمی کی قبر لگتی تھی جو سفر کرتے ہوئے راستے میں بیمار پڑا ہو اور وہیں مر گیا ہو۔ ان دنوں سارے ملک میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی اور وہ علاقہ سنسان پڑا ہوا تھا۔ اس وقت ہم بھائی کی لاش کے ساتھ یہی کر سکتے تھے۔ اس وقت وہی جگہ ہمیں ملی تھی جہاں وہ لاش دبا دی گئی تھی۔

سیول کو دوبارہ دارالحکومت کی حیثیت مل گئی۔ اب حکومت کی طرف سے پابندی لگ گئی کہ لاشیں دفن نہیں کی جائیں گی بلکہ جلائی جائیں گی۔ اس پابندی کے بعد ماما نے ہم سے مشورہ کیا کہ بھائی کی لاش بھی جلائی جائے۔ میرے بھابی نے' جو اس وقت واپس آ گئی تھی اصرار کیا کہ اسے عام قبرستان میں دفن کیا جائے۔ وہ باقاعدہ قبر بنانا چاہتی تھی تاکہ اس کے یتیم بچے اپنے باپ کو یاد رکھ سکیں۔

بھائی کی موت کے بعد ماما بالکل گم سم ہوگئی تھیں جیسے اس کی موت کی ذمہ دار وہ خود ہوں۔ ویسے تو وہ اپنی بیوہ بہو کو ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کرتی تھیں۔ مگر اس بارے میں انہوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ میری بھابی اپنے شوہر کی موت کے وقت اس کے پاس نہیں تھی اور اب اسے اپنی ساس کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جو بھائی کی لاش جلانے کی ضد کر رہی تھیں۔ میری بھابی کو ماما کی اس ضد پر بہت صدمہ پہنچا تھا مگر وہ اپنی ساس کے سامنے کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔

میرے بھائی کا گوشت پوست کوئلہ بن چکا تھا اور اس کی ہڈیاں سرمہ بن گئی تھیں۔ وہ راکھ ماما نے مٹھی میں بھر لی۔ ہم ماما کے پیچھے پیچھے بس اسٹینڈ تک گئے جہاں ہمیں کانگھوا جزیرے کے لیے کوئی سواری مل سکتی تھی۔ میں اور بھابی خاموشی سے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ ہم جزیرے کے بس اسٹاپ پر اتر گئے۔ ماما ہر ایک سے راستہ پوچھتی رہیں حتیٰ کہ سمندر کے ساحل پر ہمیں ایسی جگہ مل گئی جہاں سے وہ زمین نظر آ رہی تھی جہاں ہمارے خاندانی قبرستان کی طرف راستہ جاتا تھا۔ ماما نے شہر کی طرف منہ کیا اور مٹھی بھر راکھ ہوا میں اڑا دی۔ یہاں سے شہر نظر تو آتا تھا مگر وہاں سے ادھر جایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس وقت ماما کمزور اور بے بس عورت کے بجائے ایک بہادر سپاہی نظر آ رہی تھیں جو میدان جنگ میں دشمن کا مقابلہ کر رہا ہو۔

ماما مٹھی بھر راکھ کے ساتھ ایک ایسی جنگ لڑ رہی تھیں جس کے خطرناک نتائج نکل سکتے تھے۔ ان کے نزدیک مٹھی بھر راکھ کی بھی بہت اہمیت تھی۔ ان کے لیے وہ ہتھیار تھے جس سے وہ اس

MashalBooks.com

بھیانک عفریت کا مقابلہ کرسکتی تھیں جو کوریا کے دو حصے کرنے کے بعد ان کے دل و دماغ پر بھی سوار ہو گیا تھا شمالی اور جنوبی کوریا الگ الگ دو حصے بن گئے تھے۔ اس حقیقت کو قبول کرنا تو دور کی بات تھی وہ تو ہزاروں سال بھی اس کا تصور نہیں کرسکتی تھیں۔

ماما چاہتی تھیں کہ ان کی میت کے ساتھ بھی میں وہی کروں جو بھائی کی میت کے ساتھ کیا گیا تھا۔ وہی عمل اور اسی جگہ وہ ایسا ہی چاہتی تھیں تاکہ وہ بھی راکھ اور ہوا بن جائیں۔

اب تیس سال سے زیادہ ہو چکے ہیں لیکن یہ سوال اب بھی مجھے تنگ کرتا ہے کہ اس عفریت کو مارنے کے لیے کیا یہی ایک طریقہ تھا۔

''یہ میری آخری خواہش ہے اسے ہر حالت میں پوری کرنا۔'' ماما نے کہا ان کے چہرے پر شدید صدمے کے آثار تھے۔ انہیں صدمہ تھا کہ ان کی یہ آخری خواہش ہے۔ ان کا وہ ترکہ ہے جو میرے سپرد کرسکتی ہیں۔

افسوس ان کی خواہش پوری کرنے کے سوا میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

ماما ابھی تک بیمار ہیں۔

ماما کی بازی

تیسرا حصہ

اس حادثے کے بعد ماما سات سال اور زندہ رہیں۔ وہ بہت ہی منحوس سات سال تھے۔ اس بڑھاپے میں جب وہ اسّی کے پیٹے میں تھیں ہڈی کا ٹوٹنا خطرناک ہوسکتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ ان کے پیٹرو کی ہڈی ٹوٹی تھی۔ ان کے پیٹرو کو کولہے کی ہڈی سے جوڑنے کے لیے لوہے کی سلاخ ڈال دی گئی تھی۔ اس سلاخ کی وجہ سے وہ چل پھر سکتی تھیں۔ لیکن ان کی ایک ٹانگ آدھا انچ چھوٹی ہو گئی تھی۔ آپریشن کے بعد وہ لنگڑانے لگی تھیں اور سلاخ کی وجہ سے وہ فرش پر بھی نہیں بیٹھ سکتی تھیں اور کوریا میں فرش پر بیٹھنے کا قاعدہ ہے۔ وہ کرسی پر ہی بیٹھی تھیں اور چونکہ فرش پر نہیں سو سکتی تھیں اس لیے وہ پلنگ پر سوتیں۔ پلنگ پر چڑھنا بھی ان کے لیے مشکل ہوتا تھا۔ پہلے وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھتیں پھر اپنا دھڑ ایک طرف کر کے اوپر کی طرف سرک جاتیں اور ہاتھوں سے ٹانگ اوپر رکھ لیتیں۔ ہماری خوش قسمتی یہ تھی کہ اس وقت تک تمام گھروں میں فلش ٹوائلیٹ بن چکے تھے۔ اگر اس سے پہلے ان کا حادثہ ہوا ہوتا تو انہیں ڈائپر باندھنے کی بے عزتی برداشت کرنا پڑتی۔ اور سارے گھر میں بدبو پھیلتی۔ ہوش و حواس ان کے بالکل ٹھیک ٹھاک تھے اس لیے انہیں اس سے بے عزتی محسوس ہوتی۔

''اگر یہ نہ ہوتا تو بہت ہی برا ہوتا۔'' ہسپتال میں کافی دن گذارنے کے بعد ماما اپنے پوتے کے گھر واپس آئیں تو انہوں نے پہلی بات یہ کی۔ ہم نے سوچا کہ انہوں نے یہ بات اس لیے نہیں کہی ہے کہ وہ صحت یاب ہونے پر خوش ہیں بلکہ وہ اس پر خوش ہیں کہ ہمیں ان کے گندے

MashalBooks.com

کپڑے نہیں دھونا پڑیں گے۔ ہم نے تو انہیں کاغذ کی طرح سفید اور اتنا ہلکا پھلکا دیکھا تھا کہ پھونک مارو تو اڑ جائیں۔ اب ان کا جوش وخروش دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی۔ خدا جانے ان کے اندر اتنا گرم خون کیسے بچا رہ گیا تھا۔

آپریشن کے بعد ان کی جو حالت ہوگئی تھی ان کا پوتا اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ طاقت کی دواؤں اور اچھی غذا سے ان کی صحت دوبارہ بحال ہو جائے گی۔

میرا کچھ اور خیال تھا۔ میں نے ماما کی پاگلوں والی حالت دیکھی تھی۔ اور اس حالت میں ان کے اندر جو طاقت آجاتی تھی وہ بھی دیکھی تھی۔ اس وقت وہ انستھیزیا کے اثر میں تھیں۔ ان کی جو حرکتیں تھیں وہ ان کے اندرونی جذبات کا ہی تو اظہار تھیں بے چاری ماما نے اس وقت اپنی پوری طاقت ضائع کر دی تھی' اب وہ ایک کھوکھلا خول تھیں' جس میں مجھے وہ ماما نظر نہیں آتی تھیں جنہیں میں جانتی تھی۔

اپنے بھتیجوں کے ساتھ مل کر میں نے طے کیا کہ ہم باری باری ان کا خیال رکھیں گے۔ میرے بھتیجے بھی شاید یہی چاہتے تھے۔ ماما تو چاہتی تھیں کہ وہ ہلکے پھلکے کاغذ کی برابر بھی خاندان پر بوجھ نہ بنیں لیکن ان کی موجودگی خود ہی بوجھ بن گئی تھی۔ جب وہ میرے بھتیجے کے گھر ہوتیں تو میں ان کے لیے اچھے اچھے کھانے اور طاقت کی دوائیں لے جاتی تھی تاکہ ان کی صحت بحال ہو جائے۔ اگرچہ میرے بھتیجے ماما کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن مجھے شبہ ہی رہتا تھا کہ وہ اور ان کی بیویاں ماما کو وقت پر کھانا اور دوائیں دیتے ہیں۔

جب ماما میرے گھر تھیں تو سب سے بڑا بھتیجا ان کے لیے چینی دوا لے کر آیا۔ اس نے بتایا کہ چینی دوائیں بنانیوالی ایک فارمیسی کو اس نے زیادہ رقم دے کر یہ دوا بنوائی ہے اس نے مجھے بار بار یاد دلایا کہ یہ دوا ہر روز دن میں دو بار کھلانا ہے اس میں بالکل ناغہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں اس کی پریشانی سمجھ گئی تھی۔ میری طرح اسے بھی شک تھا کہ میں ماما کی صحیح دیکھ بھال نہیں کر رہی ہوں۔ وہ ماما کا دوسرا قریبی رشتے والے تھا۔ میں پہلی تھی مجھے اس پر غصہ آ گیا آخر اس نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ میں ماما کی دیکھ بھال نہیں کر رہی ہوں۔ مگر مجھے خوشی بھی ہوئی کہ اسے ماما کی فکر ہے۔ البتہ میں ہدایت کے مطابق دوا نہیں کھلا سکی۔ ماما نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ دوا کھانے سے انکار کر دیا۔ ان کی اس مسکراہٹ سے مجھے پھر سفید کاغذ یاد آ گیا تھا۔ انہوں نے

کہا کہ ہاضمے کے لیے دوا تو وہ کھالیں گی اور نزلہ کی دوا بھی کھالیں گی لیکن ایسی کوئی دوا نہیں کھائیں گی جو ان کے جسم کے لیے فائدہ مند ہو۔ میں نے بھی ان سے بحث نہیں کی اور ان کی بات مان لی۔ میں نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ ان کے پوتے نے جو طاقت کی دوائیں دی ہیں ان کا کیا کریں۔ مجھے معلوم ہوا کہ کسی بوڑھے آدمی کو ان دواؤں کی ضرورت ہے تو وہ دوائیں میں نے اسے دے دیں۔ اور بھتیجے سے جھوٹ بول دیا کہ ماما نے وہ دوائیں کھالی ہیں۔

ماما بہت ہی کم کھانا کھاتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ یہ کم غذا ان کے غسل خانے جانے کے لیے کافی ہے۔ انہوں نے اپنی جو خوراک خود ہی مقرر کر رکھی تھی میں اس میں اضافہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ البتہ ماما کو جو ہلکی پھلکی ورزش بتائی گئی تھی وہ صبح شام بلاناغہ کرتی رہتی تھیں۔ وہ ٹہلا کرتی تھیں دن میں دو مرتبہ وہ برآمدے میں آہستہ آہستہ دس چکر لگاتی تھیں۔ وہ تھوڑا سا لنگڑاتی تو تھیں لیکن چھڑی کے بغیر ہی خاصہ تیز چلتی تھیں۔ جس طرح ان کا گھمنڈ برقرار تھا اسی طرح ان کی کمر بھی سیدی تھی اور وہ اب بھی خوب اکڑ کر چلتی تھیں۔

اپنے برآمدے سے ہمیں بوڑھے لوگوں کا ادارہ نظر آتا تھا۔ صبح کو ماما برآمدے میں ٹہلتیں تو وہ بوڑھے سامنے اکٹھے نظر آتے اور جب ماما شام کی چہل قدمی کرتیں تو وہ اندر جانے کی تیاری کر رہے ہوتے۔ ان بزرگوں میں ایسے بھی تھے جو ماما سے بھی زیادہ تکلیف کے ساتھ چلتے تھے۔ ان کی کمر جھکی ہوئی تھی اور ان کے پاؤں اتنے موٹے تھے جیسے کسی صحت مند انسان کی کمر۔ کبھی کبھی ماما بے خیالی میں انہیں دیکھتیں اور ٹہلتے ٹہلتے ٹھہر جاتیں۔ کیا ان بوڑھوں کو دیکھ کر ماما کو تسلی ہوتی تھی یا ان پر رحم آتا تھا؟۔ میں سوچتی تھی کہ وہاں کی بوڑھی عورتیں' جن کی حالت ماما سے بھی بدتر تھی ماما کو ترغیب دیں کہ وہ گھر سے باہر نکلیں۔

ایک دن جب موسم اچھا تھا' میں نے ماما کی ہمت بندھائی کہ وہ بوڑھوں کے ادارے تک چلی جائیں۔

''پاگل ہوگئی ہو۔ میں وہاں جاؤں اور ان بوڑھی عورتوں کے ساتھ'' ہوا تو ''کھیلوں؟۔''

وہ غصے میں کاغذ کی طرح لرز رہی تھی۔ انہوں نے پاگل ہوگئی ہو'' اس طرح کہا تھا کہ میں دہل کر رہ گئی۔ ان سے تو میں نے کچھ نہیں کہا لیکن میرے اندر اتنا غصہ بھر گیا تھا کہ جی چاہا ان سے کہوں۔ ''جاؤ۔ اپنے پوتوں کے پاس چلی جاؤ۔ ہمیں کیوں تنگ کرتی ہو۔'' انہوں نے صبح شام کا

MashalBooks.com

ٹہلنا اور کم سے کم غذا کھانا اپنی عادت بنالی تھی۔

''صبح شام کی چہل قدمی کبھی نہ چھوڑنا۔ اگر ایک دن بھی چھوڑی تو آپ کے پاؤں چلنا چھوڑ دیں گے اور آپ غسل خانے بھی نہیں جاسکیں گی۔'' ہسپتال سے ڈسچارج کرتے وقت ڈاکٹر نے ماما سے کہا تھا۔

ماما ڈاکٹر کی اس ہدایت پر پابندی سے عمل کرتی تھیں۔ اس سے زیادہ وہ اور کوئی کام کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ اس وجہ سے میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جارہا تھا۔ بھلا ایسے انسان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے جس کی زندگی کا مقصد صرف یہ ہو کہ کم سے کم غذا کھائی جائے تاکہ غسل خانے جایا جاسکے۔ اور پھر وہ ہیں بھی تو پتنگ کے کاغذ کی طرح ہلکی پھلکی۔

سات سال تک ماما نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا۔ ان کا سفر میرے گھر سے اپنے پوتوں کے گھر تک اور پوتوں کے گھر سے میرے گھر تک ہی ہوتا تھا۔ اور وہ بھی مہینے میں ایک مرتبہ۔ ماما ایک خاص زاویے تک ہی اپنا کولہا گھما سکتی تھیں۔ کیونکہ ان کے کولہے میں جو سلاخ رکھی ہوئی تھی اس سے ان کی حرکت محدود ہوگئی تھی۔ خوش قسمتی سے ان کے دو پوتوں کے پاس اور میرے پاس کار تھی جس کی وجہ سے ان کا لانا لے جانا آسان ہوجاتا تھا۔ یہ کوئی تفریح نہیں تھی بلکہ مجبوری تھی۔ اپنے پوتوں کے گھروں پر' جو سنگل گھروں میں رہتے تھے' ماما نے دروازے سے باہر کہیں قدم نہیں نکالا۔'' ہمیں دادی کی عزت نفس کا خیال رکھنا چاہیے۔ دادی اپنے پاؤں کا لنگڑاپن کسی کو دکھانا نہیں چاہتی تھیں۔ یہ ان کا خیال تھا۔ میرا خیال کچھ اور ہی تھا۔ میرے خیال میں ماما کو باہر کی دنیا کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ یہ صرف ان کی ضد تھی۔ اگر میں ایسا خیال کرتی تھی تو کیا میں سنگدل بیٹی تھی؟۔''

ماما اچھی طرح جانتی تھی کہ ان کے پیڑو کو کولہے کی ہڈی سے ملانے کے لیے جو سلاخ ڈالی گئی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ واکر کے بغیر آسانی سے چل پھر سکیں۔ ڈاکٹر نے مجھ سے اور میرے بھتیجوں سے کہا تھا کہ اب ماما کو زندگی بھر اسی طرح چلنا پڑے گا۔ اگرچہ آپریشن کامیاب ہوگیا ہے لیکن انہیں تھوڑی بہت تکلیف برداشت کرنا پڑے گی۔ ہسپتال میں ان کے گندے کپڑے دھو دھو کر ہم تنگ آچکے تھے اس لیے ڈاکٹر کی یہ بات ہمیں معجزہ معلوم ہوئی تھی۔

اب یہ بات کہ وہ فرش پر اکڑوں نہیں بیٹھ سکتیں ہمارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ ان

کے دونوں پوتے اور بیٹی مغربی طرز کے فلیٹوں میں رہتے تھے۔ باورچی خانے میں کھانے کی میز تھی' ڈرائنگ روم میں صوفے تھے اور ہر غسل خانے میں کموڈ تھے۔ اور پھر آخر وہ کتنے اور زندہ رہ لیں گی۔ اس خیال نے ہمیں اور بھی فراخ دل بنادیا تھا۔ آج کی بدلتی ہوئی دنیا میں اولاد اپنے ماں باپ کی دیکھ بھال بادل ناخواستہ ہی کرتی ہے۔ ہم بھی اس اثر سے بچ کر تو نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ ماما کو ایک تو یہ احساس تھا کہ ان کے جسم میں ایک فالتو چیز پڑی ہوئی ہے دوسرے ہمارے جذبات کا بھی انہیں خیال تھا اس لیے وہ بہت گم سُم ہوگئی تھیں۔

''افوہ۔ کانگھوا میں مسزای کے پاس جانا چاہتی تھی۔ میرا سارا پروگرام خراب کردیا۔'' ماما احتجاج کررہی تھیں حالانکہ ان کی حالت ایسی ہوگئی تھی جیسے بھیگا ہوا کاغذ پھر بھی اپنے جاننے والوں سے ملنے کا سوچتی رہتی تھیں۔ ان کے پوتوں نے ان کی شکایت سنی تو وہ اپنی ہنسی نہ دبا سکے۔ کیا ان کی یہی ایک پریشانی ہے؟۔ کیا ان کی یہی فکر ہے کہ وہ سزالی کے گھر نہیں جاسکتیں؟ مسزای ان کے چچازاد بھائی کی بیٹی تھی۔ اور اسی گاؤں کی رہنے والی تھی جہاں ماما رہتی تھیں۔ انہوں نے اس خاندان میں شادی کرلی تھی اور اب وہ کانگھو جزیرے پر رہتی تھیں۔

4 جنوری کو شمالی کوریا کے حملے سے جو فوجوں کی پسپائی ہوئی تھی اس کے بعد گائنڈنگ اور گائیونگ سے بہت سے لوگ بھاگ کر کانگھوا آگئے تھے اور اب وہیں رہتے تھے۔ جو لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے انہوں نے مل کر پورا ایک گاؤں بسا لیا تھا۔ خوشی اور غمی کے موقعوں پر وہ سب اکٹھے ہوجاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اپنے رشتے داروں کو ایک ایک خبر سے آگاہ رکھنا چاہیے۔ لیکن یہ تعلق صرف قریبی رشتے داروں میں ہی تھا۔ سیول کے رہنے والے اتنا زیادہ میل ملاپ نہیں رکھتے تھے۔ ایک تو ان کی زندگی بہت تیز رفتار تھی دوسرے وہ مصروف بھی بہت رہتے تھے۔ ان کے لیے رشتے داروں سے ملنے ملانے کے مقابلے میں ان کے اپنے کام زیادہ ضروری تھے۔ شہر کے لوگوں کا یہ رویہ تھا۔ ماما ان کے بیچ بیچ تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ رشتے داروں کے درمیان رابطہ رہنا چاہیے۔ بہرحال وہ ہمارے عزیز ہیں۔

اگر وہ کسی شادی یا موت پر خود نہیں جاسکتی تھیں تو اپنے کسی پوتے کو نقد رقم دے کر وہاں بھیج دیتی تھیں۔ اس قسم کے تحفوں پر اگر ہم احتجاج کرتے تو وہ کہتی۔'' جب تک میں زندہ ہوں اسے برداشت کرلو۔ اس کے بعد تم جو چاہو وہ کرنا۔'' مسزلی کا خاندان ایسا تھا جس سے ملنے کے لیے

MashalBooks.com

ماما کسی وقت بھی جاسکتی تھیں چاہے وہاں کوئی شادی یا موت ہو نہو۔ وہ میرے گھر' یعنی اپنی بیٹی کے گھر تو بن بلائے کبھی نہیں آتی تھیں۔ مگر وہاں جانے کو ہر وقت تیار رہتی تھیں۔

یہ تھیں میری ماں۔ وہ اپنے اور شادی شدہ بیٹی کے یعنی میرے درمیان فاصلہ رکھتی تھیں۔ وہ شادی شدہ بیٹی کو غیر سے زیادہ نہیں سمجھتی تھیں۔ وہ جس چچازاد کی بیٹی مسزای کے پاس جاتی تھیں وہ بہت ہی غریب تھی۔ اس کے بچے بہت تھے اور اس کا مشکل سے ہی گذارا ہوتا تھا۔ تھوڑی سی زمین تھی اور باقی تنکوں کی ٹوکریاں اور چٹائیاں بنا کر فروخت کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ مسزای کا خاندان اخلاق کا بہت اچھا تھا۔ وہ بہت ہی ملنسار لوگ تھے۔ ماما وہاں بہت خوش رہتی تھی۔ جب بھی وہ وہاں سے واپس آتیں ان کی بہت تعریف کرتیں۔ لیکن وہ ان کی احسان مند نہیں رہنا چاہتی تھیں اس لیے انہیں تحفے بھیجتی رہتی تھیں۔ اور یہ تحفے بہت مہنگے ہوتے تھے۔

وہ خاندان کانگھوا جزیرے کے انتہائی شمال میں واقع یانگساں میوگاؤں میں رہتا تھا۔ یہ گاؤں میدان جنگ کے قریب تھا۔ اس لیے اس کے راستے میں کئی فوجی چوکیاں تھیں۔ اور جو بھی ادھر جاتا اسے بتانا پڑتا کہ وہ کہاں جارہا ہے اور اسے وہاں کیا کام ہے۔ اپنا شناختی کارڈ فوجی چوکی پر ہی چھوڑنا پڑتا تھا۔ گھر کے پیچھے ایک نیچی سی پہاڑی تھی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ان خاندان کی ہے۔ اس پہاڑی کی چوٹی سے سمندر کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ دور افق پر شمالی کوریا کا علاقہ دکھائی دیتا تھا۔

چونکہ اصل سرزمین اور جزیرے کے درمیان کا فاصلہ بہت ہی کم تھا اس لیے ایسا لگتا تھا جیسے بیچ میں صرف ہان دریا ہی ہے۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ ہمارے اور اس علاقے کے درمیان جہاں ہم قدم نہیں رکھ سکتے اتنا کم فاصلہ ہے اور وہیں پر گائیونگ کون میرا گاؤں بھی ہے' تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ بلکہ یہ سوچ کر مجھے یہ فاصلہ بھی زیادہ لگا کہ دوسری طرف ہی میرے بھائی کی قبر اور میری ماں کے صدمے موجود ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ ماما کے وہاں جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں کی پہاڑی سے وہ علاقہ نظر آتا ہے۔

میری ماں اکثر بڑبڑاتی رہتی تھیں۔ تم بہت کٹھور ہو۔ تم بہت سنگدل ہو۔'' اب یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسے کہہ رہی ہیں۔ ان کے نزدیک تو ہم میں سے ہر ایک ہی دل کا سخت تھا۔ جب وہ اس طرح بڑبڑاتیں تو ان کے پوتے بھی حیرت سے انہیں دیکھتے۔

تیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا تھا جب میرے بھائی کی راکھ سمندر پر بکھیری گئی تھی پھر بھی ماما اپنے بیٹے کی قبر دیکھنے جزیرے پر جاتی تھیں۔ انہوں نے یہ ایک رسم بنالی تھی۔ جب ان کا حادثہ ہوا تو یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ اب وہ اپنی یہ رسم پوری کرنے جزیرے پر نہیں جاسکیں گی۔ وہ خاندان خالص دیہاتی گھر میں رہتا تھا اور وہاں غسل خانے میں کموڈ نہیں تھا۔

اچانک ماما نے غسل خانے جانا بند کردیا۔ اور اس کے ایک مہینے کے اندر مرگئیں۔ اس وقت وہ اپنے بڑے پوتے کے گھر پر تھیں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ عجیب حرکتیں کررہی ہیں۔

''آنٹی۔ دادی عجیب حرکتیں کررہی ہیں۔ وہ غسل خانے بالکل نہیں جاتیں۔''

یہ واقعی خطرناک بات تھی۔ ماما تو پاگل پن کی حد تک صفائی کا خیال رکھتی تھیں۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ایسا لگتا تھا۔ جیسے صاف ستھرا رہنا ہی ان کی زندگی کا مقصد ہے۔ میں بھاگی بھاگی وہاں پہنچی۔ احتیاطاً بچوں کے ڈائپر خرید کر ساتھ لے گئی۔ خوش قسمتی سے بڑے ڈائپر کام آگئے۔ میں نے دیکھا کہ ان کا جسم کس وقار کے ساتھ دبلا پتلا ہورہا ہے۔ ان کی جلد ہلکے رنگ کی ہوگئی تھی اور جسم کا کوئی وزن ہی نہیں تھا۔ اب ہڈیوں پر صرف کھال رہ گئی تھی۔ ماما اپنی موت جیسی نیند سے جاگیں اور مجھے دیکھ کر کمزوری سے مسکرائیں۔

''بیٹی' میں زندہ ہوں یا مرگئی؟'' انہوں نے پوچھا ان کے اس سوال پر میں نے ان کے ہاتھ پر چٹکی لی اور کہا ماما آپ زندہ ہیں۔

''اچھا؟ ...'' یہ کہہ کر ماما نے پھر آنکھیں بند کرلیں اور ہلکے سے ایسی آواز نکالی جو خوشی کی بھی نہیں تھی اور مایوسی کی بھی نہیں۔ لیکن وہ سو نہیں رہی تھیں۔ ماما نے اسٹرا سے تھوڑا جوس اور پورج پیا۔ میں نے انہیں ہلایا تو انہوں نے پھر آنکھیں کھولیں۔ میں نے پوچھا میں کون ہوں؟ وہ مسکرائیں اور میرا نام لیا۔ ان کے پوتے اور ان کی بیویاں ماما کی یہ حالت کئی دن سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ابھی یہ جلدی نہیں مریں گی۔ وہ باری باری ماما کے بستر کے پاس بیٹھے تھے اور ان کی دیکھ بھال کرتے رہتے تھے۔ میں چونکہ وہاں نہیں رہتی تھی اس لیے میری یہ ڈیوٹی نہیں لگائی گئی تھی۔ پھر ان کا یہ بھی خیال ہوگا کہ میں تو عمر بھر ان کی دیکھ بھال کرتی رہی ہوں۔

اب ماما آدھے سوتے اور آدھے جاگتے گذار رہی تھیں۔ اب یہی کام رہ گیا تھا کہ جب بھی وہ جاگتیں انہیں اسٹرا سے جوس اور پورج پلا دیا جائے۔ یا پھر بروقت ان کا ڈائپر بدل دیا

MashalBooks.com

جائے۔لیکن کبھی کبھی اچانک جاگنے کے بعد ان کی آنکھیں ایسے چمکنے لگتی تھیں جیسے بادلوں میں سے سورج کی کرن جھانکنے لگے۔ اس وقت وہ صرف ان لوگوں کو نہیں پہچانتی تھیں جو وہاں موجود ہوتے تھے بلکہ جو وہاں نہ ہوتے ان کے بارے میں بھی پوچھتی تھیں۔مگر کبھی کبھی ایسا لگتا جیسے انہیں کچھ اور ہی نظر آ رہا ہے۔اس وقت ہم سب پریشان ہو جاتے۔اس حالت میں وہ اپنے پیروں کی طرف دیکھتی اور کہتیں۔ ہو بانگ۔ بہت زمانے بعد ملے ہو۔'' یا کہتیں۔'' اچھا؟ تم بھی آ گئے؟ یہ تمہاری پیٹھ پر کون ہے؟ اس بچے کو نیچے لٹا دو اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔'' کبھی کبھی وہ خفا ہونے کا منہ بناتیں اور شکایت کرتیں کہ یہ بچے میرے آگے پیچھے کیوں بھاگے پھر رہے ہیں۔ میرے بھتیجے اور ان کے خاندان والے ڈر جاتے کہ ماما ہوا سے باتیں کر رہی ہیں اور ان کی باتیں سمجھ میں بھی نہیں آ رہی ہیں۔

اس حالت میں ماما نے جو نام لیے ان میں سے صرف چند ہی ایسے تھے جنہیں میں جانتی تھی۔ ماما ایک نام لیتی تھیں ہو بانگ۔ وہ میرے بچپن میں ایک آوارہ گرد تھا جو کوئی کام نہیں کرتا تھا اور ایک جگہ سے دوسرے جگہ بھاگا پھرتا تھا۔ وہ مجھے اس لیے یاد تھا کہ وہ جب بھی آتا تو ہم بچے اسے چھیڑتے تھے۔ہم اس سے کہتے کہ تمہارے کپڑوں میں جوئیں ہیں اور تمہاری پتلون میں گندگی لگی ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے مجھے وہ یاد تھا۔ میرے خاندان کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔اس کا سوچ کر مجھے خیال آتا کہ ماما کو جو لوگ یاد آتے ہیں وہ ایسے ہی ہیں جن کا ان کی زندگی سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا ہے۔لیکن اگر ایسا تھا تو پھر یہ لوگ اس وقت انہیں کیوں یاد آ رہے تھے۔

ان کے شعور میں یہ غیر اہم لوگ کیوں موجود ہیں؟ یہ سوال مجھے پریشان کرتا تھا۔اور پھر اس وقت وہ کیوں یاد آ رہے ہیں جب ان کی زندگی کا پردہ گرنے ہی والا ہے۔اور ان کا ایک ایک لمحہ نہایت قیمتی ہے۔ پھر یہ سوچ کر مجھے شرمندگی ہوئی کہ میں خواہ مخواہ ان کے شعور کی باتوں کو من گھڑت سمجھ رہی ہوں۔ ماما اپنی زندگی کا آخری اور نہایت اہم کھیل کھیل رہی ہیں۔وہ یہ کھیل کھیل کر اپنے لاشعور میں موجود کسی چیز کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہیں۔

ہاں، میں خود جس تجربے سے گذر رہی تھی اس کا تعلق بھی میرے اپنے اڑیل شعور سے تھا جس نے اپنے اندر میرے وجود کے کسی حصے کو چھپا رکھا تھا۔''میرے مرنے کے بعد وہی کرنا جو میں

نے تمہارے بھائی کے ساتھ کیا تھا۔تم ہی ایسی ہو جو میری خواہش پوری کر سکتی ہو۔'' میں ماما کی خواہش کیسے بھول سکتی ہوں۔ یہ ان کی آخری وصیت ہی نہیں تھی بلکہ میرے اوپر ان کا اعتماد بھی تھا۔اس وصیت کے بعد وہ کئی سال زندہ رہیں مگر انہوں نے یہ یہ بات پھر کبھی نہ کہی۔

میرا دل چاہتا تھا کہ ماما ایسی الٹی سیدھی باتیں کرنے کے بجائے کوئی سمجھ داری کی بات بھی کریں قبل اس کے کہ اس کا وقت ہی نہ رہے۔سات سال پہلے جب میں نے اپنے بھتیجوں کو ماما کی خواہش کا بتایا تھا تو انہوں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔اور اب تو شاید انہیں وہ یاد ہی نہیں رہی ہوگی۔ میرے بھتیجے نئے زمانے کے تھے ان کا شوق یہی تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کاموں میں مصروف رہیں۔ان کی یادداشت بھی اچھی نہیں تھی۔

ماما کی حالت اور بھی خراب ہوتی جا رہی تھی۔سب سے زیادہ تکلیف کی بات یہ تھی کہ ماما جو بھی بات کرتیں وہ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی کیونکہ ایک تو ان کی زبان اکڑ گئی تھی دوسرے ان کے دانت بھی نہیں تھے۔ زیادہ سے زیادہ میں جو سمجھ پائی تھی وہ یہ تھا۔'' میں زندہ ہوں یا مر گئی؟'' اس سے میرے دل میں جذبات کی ایسی لہریں پیدا ہوتیں جیسے کھڑے پانی میں پتھر پھینکنے سے پیدا ہوتی ہیں۔لیکن مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ موت کی اس قربت میں وہ جذباتی لہر میں خوش گواری محسوس ہوتی تھیں۔ ماما کی ان بے معنی باتوں پر سارے گھر والے بھی ہنستے تھے۔

''آنٹی۔ یہ ہو بانگ کون ہے؟''۔ میرے بڑے بھتیجے نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے پوچھا۔ حالانکہ ماما نے کئی دن سے یہ نام نہیں لیا تھا لیکن اسے اچانک یاد آ گیا تھا۔

''وہ ایک آوارہ سا آدمی تھا اور ہمارے گاؤں میں رہتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت انہیں وہ کیوں یاد آ رہا ہے۔''

''اس وقت دادی جوان ہوں گی؟''اس نے پوچھا۔

''ہاں بالکل۔ یہ پچاس سال سے بھی پہلے کی بات ہے۔''

''ہو بانگ خوبصورت تھا؟''اس نے پھر پوچھا۔

''خوبصورت؟''

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ میرا بھتیجا مجھ سے کیا کہلوانا چاہتا ہے کہ میری ہنسی نکل گئی۔ہم

MashalBooks.com

سب بچے ہو ہا نگ کا مذاق اڑاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اس کا چہرہ بھکاریوں جیسا تھا۔ اور وہ دماغی طور پر بھی کمزور تھا۔ لیکن وہ شریف آدمی تھا۔ وہ محنت مزدوری کرتا تھا بھیک نہیں مانگتا تھا۔

''ہوسکتا ہے اس زمانے میں ہماری دادی کا اس سے کوئی تعلق ہو؟'' میرا بھتیجا چالاک بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہنسی سے اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس کی یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی۔ اور میں نے سوچا کہ میں اسے جھاڑ پلا دوں۔ مگر میرا بھتیجا اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

''میں غلط بات نہیں کر رہا ہوں آنٹی۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے؟ دیکھیے' دادی سے پہلے ہمارے خاندان کے کتنے لوگ فوت ہو چکے ہیں۔ صرف خاندان ہی نہیں۔ دور کے رشتے دار بھی بہت سے مر چکے ہوں گے۔''

''تو پھر کیا ہوا؟ اگر ماما زندہ ہیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟۔

''یہ کون کہہ رہا ہے کہ اس میں ان کا قصور ہے؟۔ آپ ناراض کیوں ہو رہی ہیں؟۔''

''تمہیں کیا بات عجیب سی لگ رہی ہے؟''

''آپ کو عجیب نہیں لگ رہی ہے؟۔ آخر دادی کا استقبال کرنے دوسری دنیا سے ہو ہا نگ ہی کیوں آ رہا ہے؟ اور کوئی قریبی رشتے دار کیوں نہیں آتا؟''

اس کی اس بات پر میں ششدر رہ گئی اور میرے منہ سے قہقہہ نکل گیا۔ تو کیا میرا بھتیجا یہ سمجھ رہا ہے کہ ہو ہا نگ دوسری دنیا سے میری ماما کا استقبال کرنے کے لیے آ رہا ہے؟ میں نے اسے سمجھایا کہ ماما کی بے تکی باتیں صرف ان کی بڑبڑ ہے اور کچھ نہیں ہے۔

انسان جو خواب دیکھتا ہے ان میں سے اتفاق سے ہی کوئی ایسا خواب ہوتا ہے جو پورا ہو جاتا ہے۔ اور جسے ہم سچا خواب کہتے ہیں وہ بھی سچا نہیں ہوتا۔ ہم اپنے خوابوں میں کسی جاننے والے کو دیکھتے ہیں یا کسی اجنبی کو' لیکن اپنا کوئی عزیز یا ایسا شخص مشکل سے ہی نظر آتا ہے جسے ہم بہت یاد کرتے ہیں اس لیے خواب بے معنی ہوتے ہیں۔ ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اسی لیے اناپ شاپ باتیں بھی بے معنی خوابوں کی طرح ہی ہوتی ہیں۔ یہ میں نے اپنے بھتیجوں کو سمجھایا۔

''آنٹی' مجھے خوشی ہوئی کہ آپ دادی کی باتوں کو اناپ شاپ ہی سمجھتی ہیں۔'' میرے بھتیجے نے کہا اور پھر کہنے لگا کہ سات سال پہلے دادی نے جس خواہش کا اظہار کیا تھا وہ اسے بھی ان کی بڑبڑاہٹ ہی سمجھتا ہے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میرے بھتیجے نے مجھے اپنی دلیلوں میں پھنسا لیا

ہے۔ لیکن وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

''نہیں وہ ان کی بڑبڑاہٹ نہیں تھی۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''اگر ان کی یہ خواہش بھی تھی تب بھی میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں یہ خواہش پوری نہیں کروں گا۔ اور یہ میری مرضی ہے۔''

''تم نے سوچا بھی ہے تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے۔''

''میں نے یہ نہیں کہا کہ یہ مشکل ہے۔ میں نے تو یہ کہا ہے کہ میں یہ نہیں کرنا چاہتا۔'' میرے بھتیجے نے جواب دیا۔ آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ میں دادی کو جلاؤں اور ان کی راکھ سمندر پر بکھیر دوں جیسا میرے باپ کے ساتھ کیا گیا تھا؟ آنٹی ایسی حرکت کے بارے میں اب تو سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ میرے باپ کے دنوں میں تو ایسا ہو سکتا تھا۔ مگر آج ہم یہ کام کریں گے تو تماشہ بن جائے گا۔ میں تو ان کی تجہیز و تکفین ایسی ہی کرنا چاہتا ہوں۔ جیسے دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ اس سوسائٹی میں میرا ایک مقام ہے' میری عزت ہے۔ اور یہ بھی دیکھیے کہ یہ میری ذمہ داری ہے۔''

''تمہارا خیال ہے میں اس خاندان کا حصہ نہیں ہوں کیونکہ میں نے کہیں اور شادی کر لی ہے؟ میں ہی تو ان کی واحد اولاد رہ گئی ہوں۔ کیا تم مجھے نظر انداز کر دو گے؟۔ یہی کہہ رہے ہو نا تم؟۔

بظاہر تو میں غم زدہ تھی اور میرا ایک آدھ آنسو بھی نکل پڑا تھا مگر میں دل ہی دل میں سکون محسوس کر رہی تھی جیسے تکلیف دینے والا دانت آخر کار نکل گیا ہو میرے اندر یہ سنسنی غیر متوقع طور پر ہی شروع ہو گئی تھی۔ میں بھی وہ رسم دوبارہ ادا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''آنٹی' آپ ناراض ہو گئیں؟ کون ناراض کر رہا ہے آپ کو؟۔''

''کیا قبر کی جگہ تلاش کرنا اتنا ہی آسان ہے جیسے سوئیٹر خریدنا؟۔'' میں چیخی' مگر مجھے بھتیجے کی تجویز سے اختلاف نہیں تھا۔ قبر کی جگہ قریب قریب طے ہو چکی تھی۔ میرے بھتیجے نے بتایا کہ اس نے گھر کے نواح میں ایسے قبرستانوں کا جائزہ لیا ہے جہاں مردے کو لے جانا آسان ہوگا۔ اس نے بتایا کہ تمام قبرستان بھر چکے ہیں اور وہاں قبر کی جگہ ملنا اتنا آسان نہیں ہے۔

''میرا خیال ہے ہمیں ایسی جگہ تلاش کرنا چاہیے جہاں کوئی ہمارا رشتے دار بھی دفن ہو۔''

''تمہارا مطلب ہے وہ قبرستان جس کا نام ''نئی دنیا'' ہے اور جہاں تمہاری ماں دفن ہیں؟''

MashalBooks.com

نئی دنیا قبرستان ایک یادگار پارک ہے۔ ماما کی بہو جو ہماری طویل عمر ماما سے پہلے مر گئی تھی وہ وہی دفن تھی۔ وہ بہت خوبصورت جگہ تھی۔ وہاں کے لیے سواری بھی آسانی سے مل جاتی تھی۔ لیکن جس کمپنی نے وہ قبرستان بنایا تھا اس کا مالک دیوالیہ ہو گیا تھا اور وہ کہیں غائب ہو گیا تھا۔ اس اسکنڈل کے بعد اس کمپنی کے کئی صدر آئے اور گئے جس کی وجہ سے اس پارک کی حالت خراب ہو گئی۔ وہاں جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔

''مجھے وہ جگہ بہت اچھی تو نہیں لگتی مگر اور کوئی جگہ بھی نہیں ہے۔'' میرے بھتیجے نے کہا۔ ''زندہ لوگوں کے لیے وہ جگہ اچھی ہے۔ البتہ چھٹیوں میں قبروں کی دیکھ بھال کرنا مشکل ہے اگر میری ماں اور دادی کی قبریں الگ الگ قبرستانوں میں ہوئیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ دونوں میں سے ایک قبر نظر انداز ہو جائے گی''۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ چونکہ تم سب سے بڑے ہو اس لیے تمہاری ذمہ داری سب سے زیادہ ہے۔ اور اب تم ایسی باتیں کر رہے ہو۔'' میں نے اسے گھورا۔ مگر میں نے سوچا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا ہے۔ اب میرے لیے یہی رہ گیا تھا کہ یہ بات چیت ختم کر دوں۔

ہم یہ بات چیت ماما کے بستر کے پاس بیٹھے کر رہے تھے۔ مگر ایسا کوئی معجزہ رونما نہیں ہوا کہ ماما آنکھیں کھولتیں اور اپنی خواہش پھر دہراتیں۔

میرے بھتیجے نے نئی دنیا قبرستان کے نگران کو پہلے ہی ٹیلی فون کر دیا تھا اور اس سے اسی جگہ ملنے کا وقت لے لیا تھا۔ وہ قبرستان نواحی ریلوے اسٹیشن کے قریب تھا۔ اس کے دفتر میں کوئلے کی انگیٹھی تھی جس سے کمرہ ٹھنڈا اور اجاڑ اجاڑ سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ جو کیفے ٹیریا تھا وہ اس سے بھی زیادہ اجاڑ نظر آتا تھا۔ دیوار کے ساتھ میزیں لگی ہوئی تھیں جن گرد جمی ہوئی تھی اور سیمنٹ کے اونچے نیچے فرش پر کرسیاں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ میں نے اور میرے بھتیجے نے یہ سوچ کر اسٹوو کا دروازہ کھولا کہ شاید کچھ گرمی مل جائے تو ہمارے سامنے ایک کھڑکی نظر آئی جہاں سے پہاڑی پر بکھری ہوئی قبریں دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ قبریں نہیں بلکہ سمندر کی لہریں ہوں۔

''اس کیفے ٹیریا کی حالت دیکھ کر تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فروخت کرنے کو کوئی بھی قبر نہیں

رہ گئی ہے۔'' میرے بھتیجے نے لوہے کی سلاخ سے انگیٹھی کا ڈھکن اٹھاتے ہوئے کہا۔ ادھیڑ عمر کا چھوٹے سے قد کا آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی برفیلی ہوا کا جھونکا بھی اندر آ گیا۔ اس نے گرے کوٹ پہنا ہوا تھا۔ میرے بھتیجے نے اپنا وزٹنگ کارڈ اسے دیا اور میرا تعارف کرایا۔ اس شخص نے اپنا نام سونگ بتایا وہ منیجر تھا۔ اس نے اپنا کوئی وزٹنگ کارڈ نہیں دیا۔ اس نے کہا کہ یہاں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جو باقاعدہ طور پر فروخت کی جا سکے البتہ چونکہ وہاں میرے بھتیجے کی ماں دفن ہیں اس لیے وہ کہیں نہ کہیں سے کوئی انتظام کر دے گا۔

''معلوم نہیں آپ دوسرے قبرستانوں میں گئے ہیں یا نہیں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہاں قریب میں ایسا قبرستان آپ کو اور کوئی نہیں ملے گا۔ پبلک پارک والے قبرستان بنانے کے اعلان کے بعد ہی ہم نے یہ قبرستان بنا لیا تھا۔ یہاں کھاتے پیتے لوگ بڑے بڑے پلاٹ خرید لیتے ہیں اور وہاں پھولوں کے پودے لگاتے ہیں اور یادگاریں بناتے ہیں۔ ٹرانسپورٹ کے لحاظ سے بھی یہ بہترین جگہ ہے اور پھر دریا کے سامنے ہے۔ اس لیے اس کا مقابلہ انتہائی مہنگے رہائشی علاقے ایکو جنگ ڈونگ سے کیا جا سکتا ہے۔'' منیجر نے وضاحت کی۔

افوہ! یہ جگہ ایکو جنگ ڈونگ کا مقابلہ کرتی ہے؟ مگر میں نے سوچا منیجر سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے وہ تو یہی کہے گا۔ مجھے غصہ آیا کہ ہمیں اس جیسے آدمی سے قبر خریدنا پڑ رہی ہے۔ میں نے سوچا کہ اس سے تو ماما کی خواہش ہی ٹھیک ہے۔

میں ماما کی خواہش پوری کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن میرے دماغ کے کسی گوشے میں اس کا خیال پھنسا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ ہم اس خواہش سے جان تو چھڑا لیں گے مگر مجھے ہمیشہ جرم کا احساس ستاتا رہے گا۔

اگرچہ میں ماما کی خواہش پوری نہیں کرنا چاہتی تھی مگر وہ خواہش پوری کرنے میں ایک المناک احساس ضرور تھا۔ اس کا خیال آتے ہی میں شرمندہ سی ہو گئی۔ میرا بھتیجا نہایت حقیقت پسندی کے ساتھ سارے کام کر رہا تھا اور بروقت کر رہا تھا۔

اب انگیٹھی اس وقت سے زیادہ گرم ہو چکی تھی جب ہم وہاں پہنچے تھے۔ لیکن میرے بھتیجے نے منیجر سونگ کو اتنا وقت نہیں دیا کہ وہ اپنے ہاتھ ہی سینک لیتا۔ اس نے فوراً ہی اسے کام پر لگا دیا۔

MashalBooks.com

''اچھا چلئے ادھر چلتے ہیں۔'' میرے بھتیجے نے کہا۔'' ہمیں فوراً فیصلہ کرنا چاہیے۔''

''آپ اپنی کار تو لائے ہیں نا؟'' اور اس سوال کا جواب سنے بغیر ہی منیجر سونگ میرے بھتیجے کی کار کی طرف چل پڑے۔ جس پہاڑی راستے پر وہ ہمیں لیے جا رہا تھا وہ بہت ہی ڈھلوان تھی۔

''کیا وہ جگہ اس سے بھی نیچی ہے؟'' میرے بھتیجے نے پوچھا۔

''ضرورت مند کوئی چیز خود پسند نہیں کرتے۔ ہمیں تو وہاں جانے کی تکلیف ہی نہیں کرنا چاہیے۔ آپ کے لیے مجھے ان کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑنا پڑتے ہیں''۔ منیجر سونگ اپنی ہی کہے جا رہا تھا۔ میرا بھتیجا خاموشی سے کار چلا رہا تھا۔ ہم ایک موڑ مڑے تو سامنے کار پارک کرنے کا کھلا میدان نظر آیا۔

''ایک اور کار پارک؟'' میرے بھتیجے نے کہا اب اس کے چہرے کی پریشانی کچھ کم ہوگئی تھی۔ وہ وہاں کار پارک کرنے کی ایک اور جگہ دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔ ہم کار سے اترے تو منیجر سونگ نے کہا کہ قبر کی جگہ ذرا آگے ہے۔

''تو یہاں سے تابوت قبر تک لے جانا پڑتا ہے۔'' میرے بھتیجے نے آہستہ سے کہا تھوڑی دور جا کر وہ جگہ نظر آئی جسے منیجر سونگ قبر کی جگہ کہہ رہا تھا۔ لیکن وہ جگہ سیدھی کھڑی چٹان کے ساتھ تھی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہاں قبر کیسے بن سکتی ہے۔

''اوہو ... یہ ہے جگہ؟'' میرا بھتیجا چیخا' اس کی یہ حیرت دیکھ کر منیجر سونگ چھلانگ لگا کر اونچی زمین سے نیچے اتر گیا۔ جس جگہ پر اس نے چھلانگ لگائی تھی وہ کسی کی قبر تھی۔ اس نے جیب سے لکڑی کا پیمانہ نکالا اور ہوا میں لہرایا۔ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر دوسری طرف ایک پشتہ بنایا جائے اور اس طرف بھی راستے کا کچھ حصہ لے لیا جائے تو کافی جگہ نکل آئے گی۔'' یہاں ہزاروں قبریں ایسی ہیں جو چٹان کی ڈھلان کاٹ کر اور پھر پشتہ بنا کر تیار کی گئی ہیں۔ آپ نے وہ پہاڑی نہیں دیکھی جسے قبرستان بنا لیا گیا؟''، منیجر سونگ کی دلیل ایسی ہی تھی کہ میرے بھتیجے کے لہجے میں بھی نرمی آ گئی۔

''چلو یہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا یہ مناسب ہے کہ راستے کا کچھ حصہ کاٹ لیا جائے؟۔''

میرا بھتیجا ضابطے اور اخلاق کی بات کر رہا تھا۔ لیکن منیجر سونگ کے سامنے اخلاق کی بات کرنا ہی بے معنی تھی۔

''اوہو۔ یہ ہمارا مسئلہ ہے آپ کا نہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ جو راستہ ہے نا' اس کے دن بھی گنے جا چکے ہیں۔ آپ دیکھتے جایئے۔ ہم اس کا ایک ایک ٹکڑا فروخت کر دیں گے۔''

''راستہ ختم کر دیں گے؟۔''

''راستہ؟ یہ بھی صدر کی ملکیت ہے۔ دو دو راستوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیا ایک راستہ کافی نہیں ہے۔ اور پھر اگر قبروں کے اوپر سے لوگ گذرتے رہے تو کون شکایت کرے گا۔ شکایت تو زندہ لوگ کرتے ہیں۔ مردے نہیں کرتے۔''

منیجر سونگ جوش و خروش کے ساتھ بول رہا تھا۔ میرے بھتیجے نے بھی آخر فیصلہ کر لیا۔ اس نے پوچھا آٹھ ''سیونگ'' سائز کی قبر کتنے عرصے میں تیار ہو جائے گی؟۔ منیجر سونگ نے کہا اس میں پندرہ دن لگیں گے۔ اس نے کہا کہ مزدور ملنا دشوار ہیں اس لیے دیر ہو جائے گی۔ میرے بھتیجے نے سختی سے کہا کہ اگر قبر پانچ دن میں تیار نہ ہوئی تو وہ پھر یہاں نہیں آئے گا۔

''آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جسے آپ دفن کرنا چاہتے ہیں وہ آخری دموں پر ہے؟ چلو' اگر آپ کو اتنی ہی جلدی ہے تو سب سے پہلے آپ کا کام ہی کر دیا جائے گا۔''

اب منیجر سونگ نے سوچا کہ ہم اپنا ارادہ ہی نہ بدل لیں اس لیے جلدی سے نوچوک پہاڑی کا ذکر پھر شروع کر دیا۔ اس نے انگلی سے چوٹی کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ وہ نوچوک پہاڑی ہے۔ اس نے بڑے اعتماد سے کہا کہ وہ قبر کی وہی جگہ ایسی ہے جہاں سے چوٹی دکھائی دیتی ہے۔ ہم نے بھی جلدی سے وہ جگہ خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہم کار کی طرف جا رہے تھے تو میرے بھتیجے نے بتایا کہ اس نے آٹو ''پیونگ'' ایک لاکھ وان فی پیونگ کے حساب سے خریدے ہیں۔ وہ تو اس سے بھی بڑی جگہ خریدنا چاہتا تھا مگر انہوں نے بتایا کہ ایک آدمی کے لیے آٹھ پیونگ سے زیادہ زمین فروخت کرنے پر پابندی ہے۔ میں نے اس سے بحث نہیں کی مگر اندازہ لگایا کہ اس نے یہ بات بلند آواز میں اس لیے کہی ہے کہ منیجر سونگ بھی سن لے۔ مگر مجھے تو یہ بھی شک تھا کہ جہاں وہ قبر بنانے کا کہہ رہے ہیں وہاں اتنی جگہ نکل بھی آئے گی۔ اور پھر مجھے یہ خیال بھی ستا رہا تھا کہ کیا ماما کے لیے قبر کی جگہ خریدنا ضروری بھی ہے؟ کانگھوا جزیرے اور گائیونگ گن کے درمیان سمندر کی چوڑائی ہان دریا سے بھی کم تھی۔ ماما کا درد مجھے اپنے اندر بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرے بھتیجے نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے بھی اس کے سامنے ہار مان لی تھی کیا اس کی بات ماننا صحیح تھا؟۔

ہم دفتر پہنچے تو ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ منیجر سونگ بار بار کہہ رہا تھا کہ آٹھ لاکھ وان تو صرف

MashalBooks.com

قبر کی زمین کے ہوں گے۔ قبر کے پتھر کی قیمت اور قبر بنانے کی فیس وغیرہ الگ ہوگی۔ میرے بھتیجے نے اسے رقم دی تو اس نے صرف پانچ لاکھ وان کی رسید دی۔ ہم حیران ہوگئے تھے مگر مینجر سونگ اڑا ہوا تھا۔ اس نے پلک تک نہ جھپکی۔ اس نے آرام کے ساتھ سمجھایا کہ ایک لاکھ وان فی پونگ قیمت بازار کے موجودہ نرخ کے مطابق ہے۔ اس نے کہا کہ جہاں پہلے سے قبر کے قطعے فروخت ہوگئے ہوں وہاں قیمت مختلف ہوتی ہے۔ خیر' موجودہ حالات میں جب اس علاقے کے انچارج اور اس خاندان کے درمیان معاہدہ ہوگیا ہو جس خاندان کا کوئی فرد یہاں دفن کیا جارہا ہو' اور انچارج نے خوش قسمتی سے قبر کے لیے اچھی جگہ بھی تلاش کرلی ہو تو منافع دونوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ وہ ایسی باتیں کررہا تھا کہ ہم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس لیے ہم کھڑے ہوگئے۔

''آپ سمجھ گے نا؟۔'' مینجر نے جلدی سے کہا۔

گھر واپس جاتے ہوئے لگ رہا تھا کہ میرا بھتیجا جیسے بہت بیزار ہو چکا ہو۔

''شکر ہے تم نے اس سے بحث نہیں کی۔ ہمارے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔ مگر تمہیں کچھ قیمت پر مول تول کرنا چاہیے تھا۔'' میں نے بڑے احتیاط سے کہا۔

''آنٹی آپ نے بہت پہلے کہا تھا کہ قبر اور کفن کے بارے میں قیمت پر نہیں جھگڑنا چاہیے۔'' میرے بھتیجے کا لہجہ خاصہ سخت تھا۔

''ہاں ... لوگ اپنی غلطیوں کا ذمہ دار اپنے بزرگوں کو قرار دیتے ہیں۔ تم مجھے ذمہ دار کہہ رہے ہو۔ تم نے اپنی آنٹی کی بات کبھی مانی بھی ہے؟۔''

''میں معافی چاہتا ہوں آنٹی۔'' وہ کار چلاتے ہوئے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس کا سخت چہرہ اب نرم پڑ گیا تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اگر اس نے معافی نہ مانگی تو میں اسے اور بھی ڈانٹوں گی۔ اس لیے میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

میرا بھتیجا ہر روز مینجر سونگ کو فون کرتا اور کہتا کہ جلدی قبر تیار کرو۔ اس سے مجھے ایسے لگتا جیسے وہ چاہتا ہے کہ ماما جلدی مرجائیں۔ اس پر مجھے غصہ آتا۔ مگر میں صبر کرلیتی کہ کہیں وہ مجھے کسی اور چیز کا ذمہ دار قرار نہ دیدے۔

مینجر سونگ کو دس دن لگے اپنا کام پورا کرنے میں اس نے فون کیا کہ آکر قبر کی تیار جگہ دیکھ جاؤ اور اسے شراب کا ایک گلاس بھی پلاؤ۔ ایسا لگتا تھا کہ ماما اسی دن کا انتظار کررہی تھیں کہ اسی دن

وہ فوت ہوگئیں حیرت کی بات ہے کہ میں نے آنسو نہیں بہائے۔ کہا جاتا ہے کہ بیٹی کے آنسو دوسری دنیا تک جاتے ہیں۔ اس لیے مجھے رونا چاہیے تھا۔ چونکہ میں نہیں روئی اس لیے اور بھی کوئی نہیں رویا۔ جو بھی افسوس کرنے آیا اس نے یہی کہا کہ آج کا دن بہت متبرک ہے۔ اس طرح سارا خاندان رونے دھونے سے بچ گیا۔

اس کے برعکس ماما کے جورشتے دار کانگھوا جزیرے سے آئے وہ خوب روئے۔ خاص طور سے مسزای بہت ہی روئی۔ ان کے بین کرنے پر سارا خاندان انہیں حیرت سے دیکھنے لگا میں نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی لیکن آخر میں خود میں بھی ان کے ساتھ رونے لگی۔ ماما کی موت کے بعد اس وقت میں پہلی بار روئی تھی۔ ہم دونوں گلے لگ کر سسکیاں لیتے رہے۔

کانگھوا جزیرے سے ایک اسی سال کا آدمی بھی تعزیت کے لیے آیا تھا۔ کوریا کی رسم کے مطابق اس کا چالیس سالہ پوتا جو اس کے ساتھ آیا تھا۔ میرے پڑپوتے کی طرح تھا۔ جب میں نے سوچا کہ کوریا کی رسم کے مطابق یہ ادھیڑ عمر کا آدمی میرا پڑپوتا ہے تو مجھے ہنسی آگئی۔ مجھے پرانی کہاوت یاد آگئی کہ کوئی ناپسندیدہ رشتہ دار ہمیشہ قبیلے کی اعلیٰ نسل سے تعلق رکھتا ہے۔

بوڑھے آدمی نے رسم کے مطابق زور سے بین کیا اور پھر اس میز پر آگیا جہاں شراب رکھی تھی اس نے اس جگہ کا پوچھا جہاں میت دفن کی جائے گی۔ میرے بھتیجے نے بتایا کہ ماما کو نئی دنیا قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ اس پر اس آدمی نے بڑے جوش میں میرے بھتیجے کا بازو پکڑ لیا۔ ''شکریہ' شکریہ تم ہمارے خاندان کو جانتے ہو کتنا معزز خاندان ہے۔ پونگ دوک میں ہماری ہزاروں پونگ زمین تھی۔ جس پر دھان اور سبزیاں اگائی جاتی تھیں۔ جب موسم کے لحاظ سے بزرگوں کی یاد بتائی جاتی تھی تو سارے علاقے میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ ہاں' ہمارا خاندان بہت ہی خوش حال خاندان تھا۔ جنگ کے زمانے میں ہمارا خاندان جنوب کی طرف بھاگ گیا۔ اور ہمیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا' کچھ لوگوں نے اس کا بہانہ بنالیا اور مردوں کو جلانا شروع کردیا۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ مجھے اس پر بہت غصہ آتا ہے۔ اب تم بتارہے ہو کہ اس بیہودہ رسم پر تم عمل نہیں کروگے۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔

وہ بوڑھا سیریل کے ان لوگوں کو برا بھلا کہتا رہا جنہوں نے مرنے والوں کو جلایا۔ بوڑھے کے منہ میں ایک دو دانت ہی رہ گئے تھے۔ اس نے جب ''وھا جانگ'' (مردے جلانا) کہا تو اس

MashalBooks.com

نے خاصہ زور لگانا پڑا۔ ایسا لگا جیسے وہ ''دھان جانگ'' (پاگل) کہہ رہا ہو۔

''ہم دیہاتی لوگ چاہے کتنے ہی غریب ہوں مگر'' دھان جانگ'' نہیں ہیں۔ بوڑھے کے پوتے نے دادا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے کہا کہ دادا سٹھیا گئے ہیں۔ پوتا خوب جانتا تھا کہ ہمارا خاندان اتنا امیر بھی نہیں تھا۔ ہمارے خاندان میں پڑھے لکھے لوگ بہت تھے۔ ان میں سے اکثر اوسط درجہ کی زندگی گذارتے تھے۔ بلکہ بعض خاندان تو غریب تھے۔ مسزای نے بعد میں بتایا کہ وہ بوڑھا آدمی واقعی سٹھیا سا گیا ہے۔ وہ گھر کے پیچھے پہاڑی پر چڑھ جاتا ہے اور سمندر کی طرف دیکھ کر لوگوں سے کہتا ہے کہ یہ سب زمین ہماری تھی۔

وہ گاؤں جہاں میرا خاندان رہتا تھا اصل سرزمین پر تھا لیکن بوڑھے آدمی کا گاؤں پھرن ورک پانگھوا جزیرے سے نظر آتا تھا۔ وہ بوڑھا رشتے سے میرا بھانجا بھتیجا لگتا تھا۔ بوڑھے کا پوتا جونو جوانوں میں گھوم پھر رہا تھا اس نے بہت ہی خطرناک بات کی۔ کہنے لگا اگر دونوں کوریا اکٹھے ہو جائیں تو میرے دادا جیسے بوڑھے لوگوں کی تو جان ہی نکل جائے گی۔ میرے بوڑھے کزن نے اس سے کھل کر اتفاق تو نہیں کیا لیکن اس کی باچھیں کھل گئیں اور وہ معنی خیز نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں نے اس بوڑھے کے تاثرات سے یہ نتیجہ نکالا جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ ''تم سچ کہتے ہو۔ ہمارے کچھ حاصل کرنے سے پہلے ہی ہم بوڑھے لوگ ایک ایک کر کے چل بسیں گے۔ تم اپنا کام کرتے رہو۔'' لیکن میں نے یہ باتیں زور سے نہیں کہیں۔

ماما کے جنازے کے دن موسم گرم تھا۔ لیکن مجھے ٹریفک کا ڈر تھا کیونکہ ایک رات پہلے بہت برف باری ہوئی تھی۔ دھوپ نکلنے کے بعد بڑی سڑکوں پر کار چلانا تو مشکل نہیں ہوگا لیکن ڈھلان پر چلنا بہت مشکل ہوگا۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ماما کو برف سے چڑ تھی۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ ایک رات پہلے جو بہت زیادہ برف باری ہوگئی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ ماما برف سے ڈھکی ہوئی زمین میں دفن ہونا نہیں چاہتی تھیں۔ اس خیال سے میں اور پریشان ہوگئی۔

اس موقع پر میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہر کام پروگرام کے مطابق ہو رہا تھا۔ میری پریشانی کا کسی کو بھی احساس نہیں تھا اور وہ پریشانی کسی کو بھی نہیں تھی جو اس وقت مجھے تھی۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ برف نے ماحول کو خوش گوار بنا دیا ہے حالانکہ ایسے موقع پر فضا ہمیشہ سوگوار ہوتی ہے۔ ''تم کچھ نہیں جانتے۔ کچھ نہیں ہوگا۔'' میں خاموشی سے اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ میں نہیں بتا سکتی

کہ میں یہ سوچ رہی تھی کہ کوئی خطرناک چیز ہو جائے گی یا یہ صرف میری اپنی پریشانی تھی۔ میں انہی الٹے سیدھے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

خوش قسمتی سے وہ چھٹی کا دن تھا اس لیے جنازہ لے جانے والی گاڑی تیزی کے ساتھ جا رہی تھی۔ ہم شہر سے باہر آئے تو ایک دم منظر بدل گیا۔ یہاں کھیتوں میں اور پہاڑیوں پر جو برف پڑی ہوئی تھی وہ شہر کی سڑکوں کے مقابلے میں زیادہ صاف شفاف تھی۔ وہاں دوسری دنیا نظر آتی تھی۔ مجھے فکر یہ تھی کہ جنازے والی گاڑی اور اس کے پیچھے چلنے والی کاریں بہت تیز چل رہی ہیں کہیں کچھ ہو نہ جائے۔

ہمارا خاندان دفتر کے سامنے ٹھہر گیا۔ عورتیں گھر سے کھانا پکا کر لائی تھیں۔ انہوں نے وہ کھانا ڈائننگ روم میں رکھ دیا۔ انہوں نے دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ ہدایات بھی دیں۔ اور تین لڑکیوں کو وہیں چھوڑ دیا۔ ماتم کرنے والوں کا سربراہ دفتر میں گیا اور یہ دیکھا کہ دفن کرنے کے تمام انتظام پورے ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد ہم پھر چل پڑے۔

جنازے والی گاڑی سیدھی ڈھلان پر مشکل سے چڑھ رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے ایک جگہ ٹھہر گئی اور خود بخود ہی پیچھے کی طرف سرکنے لگی۔ اچانک مجھے اخبار میں چھپنے والی ایک خبر یاد آ گئی۔ خبر یہ تھی کہ قبرستان کی طرف جاتے ہوئے جنازے والی گاڑی کا حادثہ ہو گیا۔ جس میں کئی آدمی ہلاک ہو گئے۔

خوش قسمتی سے وہاں جنازے والی گاڑی چیونٹی کی رفتار سے چل رہی تھی اور پیچھے آنے والی گاڑیوں سے اس کا فاصلہ زیادہ تھا اس لیے اس کے اچانک پیچھے مڑنے سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ البتہ ڈرائیور گاڑی سے اتر آیا اور اس نے ہم سے کہا کہ اوپر گاڑی لے جانا خطرناک ہوگا۔ چند نوجوان گاڑیوں سے باہر آئے اور انہوں نے بیلچے سے راستے کی برف ہٹانے کی کوشش کی۔ مگر ڈرائیور پھر بھی مطمئن نہیں ہوا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ اچھا شگون نہیں ہے۔ ابھی ابھی کوئی خطرناک حادثہ ہو سکتا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں' دونوں ہاتھ جوڑے اور ماما کو تسلی دینے لگی۔ ماما اپنا غصہ اور تلخی ختم کر دیجیے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ کا گوشت پوست کہاں دفن ہوتا ہے۔ آپ جانتی ہیں میں آپ کی خواہش پوری کرنا چاہتی تھی مگر یہ نوجوان ایسا نہیں چاہیے۔ میرے اندر یہ طاقت نہیں ہے کہ میں انہیں روکوں۔ اور

MashalBooks.com

یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ ٹھیک ہی کر رہے ہوں۔'' میں ایسے رو رہی تھی جیسے بچپن میں ماما کے اسکرٹ کے دامن کے ساتھ لپٹ کر رویا کرتی تھی۔

جنازے والی گاڑی پھر چل دی کار میں بیٹھے لوگوں کی باتیں سن کر میں نے اندازہ لگایا کہ جنازے والی گاڑی میری دعاؤں کی وجہ سے نہیں چلی ہے بلکہ رشوت دینے کی وجہ سے چلی ہے۔ پہلے تو میرے بھتیجے ڈرائیور کی بات نہیں سمجھے۔ انہوں نے نوجوانوں سے سڑک پر پڑی ہوئی برف صاف کرائی۔ پھر ایک تجربہ کار دوست نے سمجھایا کہ جنازے والی گاڑی میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ وہ رشوت چاہتا ہے۔ چنانچہ ڈرائیور کو پیسے دیدیے گئے۔ اس کے بعد وہ اور بھی پیسے مانگتا رہا۔ آخر بہت سی رشوت کے بعد ماما کو حفاظت کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ میرے بھتیجے اور ان کے دوست اس قسم کے لین دین میں بہت ماہر ہیں۔

میں تین دن بعد ماما کی قبر پر گئی تو دیکھا کہ قبر کے سرہانے لکڑی کا ایک ٹکڑا کھڑا ہے جس پر ان کا نام لکھا ہے۔ معلوم ہوا کہ مستقل پتھر ایک مہینے کے اندر تیار ہو جائے گا۔ کسی مقناطیس کی طرح لکڑی کے اس ٹکڑے نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا جس پر ماما کا نام چینی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ میں نے پہلی بار ان کا نام غور سے پڑھا اور اس کا مطلب بھی سمجھا۔ ایک پراسرار سی کیفیت میرے دل میں پیدا ہوئی جیسے وہ مجھے معاف کر رہی ہوں۔ ''ٹھیک ہے بیٹی' بالکل ٹھیک ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرا خاکی جسم کہاں دفن کیا جائے۔ تم نے دیکھا نہیں؟ تم نے اور میرے پوتوں نے میرے لیے جو جگہ بھی منتخب کی ہے وہی میری آخری آرام گاہ ہے۔''

اپنی زندگی میں ماما الگ تھلگ سی رہتی تھیں۔ وہ صفائی ستھرائی کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ وہ کسی کے ساتھ زیادہ گرم جوشی سے نہیں ملتی تھیں لیکن برسوں پہلے ان کا جو نام رکھا گیا تھا وہ میرے لیے سکھ چین بن گیا تھا۔

چینی حروف میں ماما کا نام اس طرح تھا۔ ''کی'' یعنی ''جسم'' نام کا درمیانی حصہ تھا ''سوک'' یعنی ''نیند'' یا سو جانا۔

میں بچپن سے یہ سمجھتی آ رہی تھی کہ چینی حروف میں ان کے نام کا مطلب ہے۔ ''صاف ستھری۔''

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com